اسلامی تصوف اور مستشرقین کے افکار

(نکلسن، گولڈزیہر اور اے جے آربری کا خصوصی مطالعہ)

مقالہ نگار

محمد ذاکر

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

رجسٹریشن نمبر: 741-PhD/IS/S2018

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون، 2023ء

اسلامی تصوف اور مستشرقین کے افکار

(نکلسن، گولڈزیہر اور اے جے آربری کا خصوصی مطالعہ)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی علومِ اسلامیہ

مقالہ نگار

محمد ذاکر

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

رجسٹریشن نمبر: 741-PhD/IS/S2018

نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر ریاض احمد سعید

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

نمل، اسلام آباد

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سیشن (2023ء –2018ء)

© محمد ذاکر، 2023ء

بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval Form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل شائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **اسلامی تصوف اور مستشرقین کے افکار** (نکلسن، گولڈزیہر اور اے جے آربری کا خصوصی مطالعہ)

Orientalist Thoughts on Islamic Mysticism (A Focused study on Nicholson, Goldziher and A.J. Arberry)

Islāmī Taṣūwuff aur Mustashrqīn kāy afkār (Nicholson, Goldziher aur A.J Arberry kā khūṣuṣī Muṭāli'ah)

نام ڈگری:	ڈاکٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ
نام مقالہ نگار:	محمد ذاکر (پی ایچ۔ڈی)
رجسٹریشن نمبر:	PhD/IS/S2018-741
ڈاکٹر ریاض احمد سعید	
(نگرانِ مقالہ)	دستخط نگرانِ مقالہ
پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی	
(صدر شعبہ اسلامی فکر و ثقافت)	دستخط صدر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت
پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان	
(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز)	دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز
میجر جنرل (ر) محمد جعفر (ہلال امتیاز ملٹری)	
(ریکٹر نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد)	دستخط ریکٹر نمل

تاریخ: _____

حلف نامہ فارم

(Candidate Declaration Form)

میں **محمد ذاکر** ولد **حسن**،

رول نمبر: **113-PD-SP-21** رجسٹریشن نمبر: **PhD/IS/S2018 - 741**

طالب علم، پی ایچ۔ڈی، شعبہ اسلامک تھاٹ اینڈ کلچر ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ

مقالہ بعنوان: **اسلامی تصوف اور مستشرقین کے افکار** (نکلسن، گولڈ زیہر اور اے جے آربری کا خصوصی مطالعہ)

Orientalist Thoughts on Islamic Mysticism (A Focused study on Nicholson, Goldziher and A.J. Arberry)
Islāmī Taṣūwuff aur Mustashrqīn kāy afkār (Nicholson, Goldziher aur A.J Arberry kā khūṣuṣī Muṭāli'ah)

پی ایچ۔ڈی اسلامک فکر اور ثقافت کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے اور **ڈاکٹر ریاض احمد سعید** کی زیرِ نگرانی تحریر کیا گیا ہے، یہ راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور مزید یہ کہ مذکورہ کام کہیں اور جمع کرایا گیا ہے نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لیے دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: محمد ذاکر

دستخط مقالہ نگار: _____

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز ، اسلام آباد

Orientalist Thoughts on Islamic Mysticism

(A Focused study on Nicholson, Goldziher and A.J Arberry)

Abstract:

Taṣūwuff, or Mysticism, is an essential field of the Islamic civilization. Islamic Taṣūwuff is to purify one's self from the vices and vices of morality and adorn oneself with morality's virtues. In other words, Islamic mysticism has effectively solved human psychological and moral problems with the cooperation of religion and spirituality. However, over time, when different civilizations came together after the spread of Islam, the real Islamic Taṣūwuff began to transform. The traditions of other faiths and their thoughts also influenced the Islamic Taṣūwuff. The different religious traditions caused non-Islamic elements to be included in Islamic Sufism. Therefore, orientalists have objections that Islamic Sufism is not based on purely Islamic teachings rather, it is based on religious traditions of Judaism, Christianity, Hinduism, and Buddhism. In this research, the various thoughts and objections of orientalists have been analysed on Islamic Sufism. This thesis attempted to answer some questions about how various non-Islamic influences have affected Islamic Sufism.

This study is divided into four chapters, Chapter 1 is about Sufism's reality, status, and evolutionary period. Chapter 2, discuss Islamic mysticism, connection of orientalists with Sufism and reasons for their objections. Chapter 3 discusses Nicholson, Ignaz Goldziher, and A. J. Arberry's accounts, relics, and orientalist thoughts, and the last chapter discuss an analysis of orientalist studies on Islamic Taṣūwuff. This study adopts a qualitative research paradigm with analytical research methodology to reach conclusion. The original text of oriental studies has been accessed and analyzed in the Islamic Context. This study assumes that a good number of studies of the orientalists focus on Sufism in general and especially on Islamic Mysticism. One more thing highlighted in the study that mostly orientalist studies observe Islamic Mysticism from sources or apologetic literature. Therefore, there is a need to understand the orientalists' voices carefully and make a comprehensive strategy to encounter them on the bases of Islamic Fundamental sources.

Keywords: Islamic Taṣūwuff, Orientalist Thoughts, non-Islamic Features, Other Religions Impact, Nicholson, Goldzeher, A. J. Arberry, Response to Western Contribution.

فہرستِ عنوانات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ	III
2	حلف نامہ	IV
3	ملخص (Abstract	V
4	فہرستِ عنوانات	VI
5	اظہارِ تشکر	IX
6	انتساب	X
6	**مقدمہ: تعارفِ مطالعہ**	1
7	**باب اوّل: تصوف کی حقیقت، حیثیت اور ارتقائی ادوار**	15
8	فصل اوّل: تصوف کا آغاز وارتقاء	17
9	فصل دوم: تصوف مختلف مذاہب کی نظر میں	40
10	فصل سوم: تصوف میں غیر اسلامی افکار کی آمیزش	85
11	**باب دوم: اسلامی تصوف اور مستشرقین**	95
12	فصل اوّل: تحریک استشراق اور اس کے اغراض و مقاصد	97
13	فصل دوم: مستشرقین کا صوفی ازم سے تعلق	107

14	فصل سوم: اسلامی تصوف پر مستشرقین کے اعتراضات کے اسباب	117
15	**باب سوم: نکلسن ، گولڈ زیہر اور اے جے آربری کے احوال و آثار اور ان کی استشراقی فکر**	126
16	فصل اول: نکلسن اور اس کا مستشرقانہ رجحان	128
17	فصل دوم: گولڈ زیہر اور اس کا مستشرقانہ رجحان	139
18	فصل سوم: اے جے آربری اور اس کا مستشرقانہ رجحان	160
19	**باب چہارم: اسلامی تصوف سے متعلق مستشرقین کے مطالعات کا تجزیہ**	170
20	فصل اول: اسلامی تصوف کی مصدریت	172
21	فصل دوم: اسلامی تصوف کی تشکیل وارتقاء	191
22	فصل سوم: اسلامی تصوف کی تاریخ	208
23	**خاتمہ**	220
24	خلاصہ بحث	221
25	نتائج بحث	224
26	سفارشات	226
27	فہارس	227
28	فہرستِ مصادر و مراجع	236

اظہارِ تشکر

اللہ رب العالمین کا شکر واحسان ہے کہ جس نے ہمیں اپنی سب سے افضل واشرف مخلوق میں پیدا کیا۔ ہم اپنے رب کریم کے فضل و کرم کا شکر اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احسان کا حق ہر گز ادا نہیں کر سکتے البتہ ان کے فضل و فیض کے تذکرے اور احساس ہمارے لیے باعث افتخار ہیں۔

میں شکر گزار ہوں اپنے نہایت ہی شفیق اور محسن اُستاد ڈاکٹر ریاض احمد سعید (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامی فکر و ثقافت) کا کہ ان کی بے پناہ شفقت اور نگرانی کی بدولت یہ مقالہ بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچا۔ آپ نے اپنی بے پناہ تدریسی، تحقیقی وادارہ جاتی مصروفیات میں اپنے کام اور وقت کو اس انداز میں منظم رکھا ہوا تھا کہ جہاں مجھے ان کی رہنمائی کی ضرورت ہوئی آپ نے فی الفور اور بہترین انداز سے میری رہنمائی فرمائی۔ یہاں تک کہ جہاں مجھے یاد نہیں رہتا تھا وہ خود رابطہ کر کے یاد دلاتے اور مجھے قائل کرتے کہ میں اپنے کام کو مکمل کرنے کے لیے اسلام آباد آؤں ، جس کا مجھے بھرپور فائدہ ہوا اس دوران وقت کو منظم کرنا، لگن وجذبے سے کام کرنا اور تحقیق کے جدید طریقوں کے ساتھ بہت سے علمی آداب واصول مجھے سیکھنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور ان کی زندگی اور توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے۔

میں ممنون ہوں پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان (ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز)، پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی (ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ شعبہ اسلامی فکر و ثقافت)، ڈاکٹر نورحیات خان(سابق صدرِ شعبہ)، ڈاکٹر سید عبدالغفار بخاری(سابق صدرِ شعبہ)اور شعبہ اسلامی فکر و ثقافت کے تمام اساتذہ جنہوں نے علمی امور اور تحقیق و تدریس کے ان کٹھن مراحل میں میری ہر لحاظ سے حوصلہ افزائی، مدد اور رہنمائی فرمائی۔

میرے گھر کے افراد والدین، بھائی، بہن اور اہلیہ میرے شکریہ کے مستحق ہیں جن کے مالی تعاون، دعاؤں کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داریوں کو اپنے کندھوں پر لے کر مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا۔

آخر میں ان تمام لائبریریوں کا متعلقہ عملہ جنہوں نے کتب تک رسائی میں میری معاونت کی اور وہ تمام احباب جنہوں نے دورانِ تحقیق میرے ساتھ تعاون کیا میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین!

محمد ذاکر

پی ایچ ڈی سکالر، نمل۔اسلام آباد

تاریخ:June 19, 2023

انتساب

میں اپنی اس کاوش کا انتساب

میری والدہ محترمہ کے نام کرتا ہوں جن کی دعا نے میری زندگی بدل دی اور

میرے ان اساتذہ کرام کے نام کرتا ہوں جنہوں نے میری فکر کو مضبوط کیا۔

مقدمہ

1۔ موضوعِ تحقیق کا تعارف :

دینِ اسلام کی آمد سے پہلے اس دنیا میں اختلاف اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ یہاں تک کہ اسلام کا نور آیا اور رحمتِ خداوندی بن کر ابھرا۔ داعی اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی پیغام لے کر جہاں جہاں پہنچے، جن راہوں سے گزرے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم مبارک کی بدولت سے وہاں الفت و محبت اور شفقت و کرم کا ماحول پیدا ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار اسی امن کے پیغام کو لیے صوفیائے کرام کی شکل میں برصغیر میں وارد ہوئے تو یہاں کے رہنے والوں کو اسلام کی بابرکت تعلیمات سے آراستہ فرمایا۔

تعلیماتِ اسلام کی نشر و اشاعت میں صوفیاء اور اولیاء اللہ کی خدمات اسلامی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہیں اور ان کی یہ خدمات تاریخ اسلام کے اوراق میں ناقابل فراموش ہے۔ صوفیاء نے احیاء و فروغِ شریعت کے لیے زمانے کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے مخصوص طریقہ اپنایا۔ بنیادی طور پر صوفیاء کے نظریات اسلامی فکر سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے مسلمانوں نے ان کے افکار کے لیے کسی خارجی اثر کو اپنانے کے بجائے اندرونی عوامل سے ہی استفادہ کیا ہے۔ اسلامی شریعت کے مختلف مصادر سے ہی اسلامی تصوف کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف مستشرقین کی اکثریت کا دعویٰ ہے کہ اسلامی تصوف کی تعلیمات غیر اسلامی افکار سے اخذ شدہ ہیں۔ یعنی مستشرقین اسلامی تصوف کو غیر اسلامی افکار کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات، اس کے بنیادی عقائد، قرآن، حدیث اور تصوف کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں مختلف شکوک و شبہات پیدا کرنا مستشرقین کا اولین مقصد ہے۔ اسی وجہ سے آج تصوف کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ایسے ایسے سوالات اٹھتے ہیں جو اس دور کے وہ لوگ جو تصوف اور اس کی تعلیمات میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے ذہنوں کو پراگندہ کر دیتے ہیں۔ اس مقالے میں تحقیقی و تنقیدی طور پر ایسے ہی اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ اسلامی تصوف کے متعلق جو شبہات ہیں وہ علمی سطح پر دور کیے جائیں۔ اور اس کے نتیجے میں آج کی نوجوان نسل کو مستشرقین کی تحقیقات کے اہداف و مقاصد سے آشنا کرایا جاسکے۔

تاریخِ تصوف پر تحقیق کرنے والے مستشرقین نے تصوف کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بہت سے اعتراضات اور سوالات اٹھائے ہیں جو آج کے دور میں تصوف کو پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لیے ان سے آگاہی بہت ضروری ہے کیونکہ سطحی علم رکھنے والے ان اعتراضات اور سوالات سے تصوف کی تشکیل کے بارے میں تردد کا شکار ہو جاتے ہیں کہ تصوف اسلامی تعلیمات ہی کا حصہ ہے یا غیر اسلامی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ مستشرقین نے تصوف کی اساس، اس کی تشکیل اور تاریخِ تصوف کی حقیقی تشریح و تعبیر قرآن مجید، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور سنتِ مبارکہ، صحابہ کرام، اصحابِ صفہ وغیرہ کی تعلیمات سے اخذ کرنے کی بجائے اس کو ہند، یونان اور مسیحی اطوار اور فلسفے کی پیداوار قرار دے دیا۔انھوں نے اس بات پر یقین کر لیا کہ تصوف کی فکر نے کلی طور پر ان تہذیبوں کی ماحولیات، معاشرت اور نظریات سے پرورش پائی ہے۔اس نقطہ نظر کا مبداء و مصدر مستشرقین کی وہ تحقیق تھی جو آج سے تقریباً چار سو سال قبل، سولہویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔

تصوف کے موضوع پر تحقیق اور شبہات کا اظہار کرنے والے مستشرقین کی تعداد کچھ کم نہیں۔ان میں چند اہم نام نکلسن، گولڈ زیہر اور اے جے آربری ہیں۔یہ تصوف کے حوالے سے مختلف نظریات کے حامل ہیں جیسا کہ نکلسن کا یہ دعویٰ ہے:

> "Let us first consider the most important external, non-Islamic, influences Chiristainity, Neoplatonism Jesus said, "You fear a thing created, and it behoves God that He should save those who fear."[1]
>
> ترجمہ: آیئے سب سے پہلے سب سے اہم خارجی، غیر اسلامی اثر عیسائیت اور نو پلاٹونزم جو اثر انداز ہوئے اس پر غور کریں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا، 'تم پیدا ہونے والی چیز سے ڈرتے ہو، اور یہ خدا کے لیے ضروری ہے کہ وہ ڈرنے والوں کو بچائے۔

یہاں اس کے مطابق تصوف میں، خوف و رجاء اور زُہد کا تصور ہے یہ رہبانیت اور عیسائیت سے ماخوذ ہے۔ تصوف کے حوالے سے گولڈ زیہر کہتا ہے:

> "There is a lot of humility in Sufism and Sufis, while it is part of the teachings of Christianity. Must be these words are similar to St. Paul, so the Sufis took it from St. Paul".[2]

---

[1]Nicholson, Reynold, Alleyne, *The Mystic of Islam* (London: Routledge & Kegan Paul,1975), 10.

[2]Arthur John , Arberry, *An introduction to the History of Sufism*,(London: Longmans Green and Co,1996), 55.

کہ تصوف اور صوفیاء کے ہاں بہت زیادہ تواضع پائی جاتی ہے جبکہ یہ عیسائیت کی تعلیمات کا حصہ ہے صوفیاء نے یہ نظریہ عیسائیت سے اخذ کیا ہے۔ الفاظ سینٹ پال سے ملتے جلتے ہیں لہٰذا صوفیاء نے یہ سینٹ پال سے لیا ہے۔

اے جے آربری تصوف کے مآخذ و مصادر اور تاریخِ تصوف کے تعین کے بارے میں کہتا ہے کہ

"About the sources of Sufism and the history of Sufism, he says that what will happen on the history of Sufism is not reliable because its primary and secondary sources are still unpublished."[1]

تاریخِ تصوف پر جو کچھ کہوں گا وہ قابلِ بھروسہ نہیں ہوگا کیونکہ اس کے بنیادی اور ثانوی مصادر ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

یوں ان مستشرقین نے اسلامی تصوف کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں مختلف انداز میں شبہات پیدا کیے اور اسلامی تصوف کی تشکیل سے ارتقائی ادوار تک کو مشکوک بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں اسلامی تصوف کے حوالے سے تین مستشرقین ؛نکلسن، گولڈ زیہر اور اے جے آربری کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

2۔ موضوعِ تحقیق کی اہمیت:

دینِ اسلام کا ہمہ پہلو فہم اسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جب دین کو اس کی حقیقی روح کے تناظر میں پڑھا اور سمجھا جائے اور دین کی روح یہ ہے کہ بندہ دین کے ظاہری اور باطنی مظاہر کا پابند ہو کر اس کے تمام تقاضوں کو پورے کرتے ہوئے اپنی شخصیت کو ہر جہت سے اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ دے، اس سے کامل محبت کرے اور اس کی مکمل اطاعت کرے جس کی رہنمائی ہمیں قرآن مجید عطا کرتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ﴾[2]۔

کہو: "اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔

[1] Ibid, 4

[2] البقرہ :138/2

تصوف کی اہمیت کے حوالے سے شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اسلام کے نظام کو ان اہم شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عقائد، احکام، معاملات اور اخلاص۔ ان شعبوں کا باہمی ربط و تعلق اتنا مضبوط اور مربوط ہے کہ اس میں رخنہ ڈالنے سے دین کا تصور ناقص ہو جاتا ہے۔ ''[1]

چنانچہ دین کی صحیح تفہیم کے لیے ان شعبوں کو مربوط انداز میں سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین رکھتے ہوئے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شعبہ ایمانیات کے دفاع اور اس کی ترویج و اشاعت کا کام علماء کرتے ہیں، شعبہ احکام کی خدمت فقہاء و محدثین کے ذمہ ہوتی ہے اور شعبہ اخلاص و تزکیہ کا کام صوفیہ و اولیاء اللہ کا فریضہ ہے۔ تصوف کو تزکیہ نفس، طریقت اور اخلاص بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ تصوف کی اہمیت و ضرورت یہ ہے کہ مسلمان کو رذائل اخلاق سے پاک کر کے اس کے دل میں صرف اور صرف اللہ عزوجل کی معرفت پیدا کی جائے۔

انسان کی عقل اور روحانی زندگی میں تصوف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عصر حاضر کا مشہور فلسفی رسل Russell جسکے بارے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تصوف کا حامی ہے، کہتا ہے کہ دنیا میں جس قدر عظیم ترین فلسفی گزرے ہیں ان سب نے تصوف کا بھی اعتراف کیا ہے۔ رسل نے ثبوت میں حسب ذیل فلسفیوں کے نام بطور مثال پیش کیے ہیں:۔ ہرقلیطوس، پارمینائڈیز، افلاطون اور اسپنوزا وغیرہ۔ [2]

اسلامی تعلیمات کی تعبیر و تشریح میں صوفیاء کرامؒ کی علمی و عملی خدمات تاریخ اسلام کا ایک شاندار باب ہے، صوفیائے کرام نے شریعت اسلامی کے احیاء و فروغ کے لیے حالات و زمانہ کے تقاضوں کے مطابق مخصوص طریقت کو اپنایا شریعت اسلامی کے مختلف مآخذوں نے ہی اسلامی تصوف کی تعمیر و تشکیل کی ہے۔

مسلمانوں کے ہاں تصوف کی جتنی اہمیت ہے مستشرقین کے ہاں بھی اس کی اتنی ہی اہمیت ہے۔ مستشرقین نے اسلام کے ہر پہلو کا بہت باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ کہیں مثبت اور غیر جانبدارانہ طور پر لکھ دیا ہے تو کہیں منفی اور جانبدار انداز میں اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ ان کے بنیادی مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ اسلام کے رخ روشن کو کیسے داغدار کیا جائے اس کے لیے انھوں نے مضبوط منصوبہ بندی کی اور ہر محاذ پر اپنے نوک خامہ کو اسلام کے خلاف حرکت دیتے رہے۔ انہی مقاصد و اہمیت کے پیش نظر انھوں نے بہت سے اسلامی موضوعات پر قلمی کاوشیں کر کے اسلامی تاریخ کو آلودہ کرنے کی ناکام کوشش کیا۔ [3]

---

[1] نعمانی، شبلی، **الغزالی**، (دہلی: انجمن ترقی اردو، 1902) ص: 176۔

[2] رضا، احمد، **اسلامی اخلاق اور تصوف**، (اسلام آباد: شعبہ فکر اسلامی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، 2019ء) ص: 215

[3] ندوی، محمد ثناء اللہ، **علوم اسلامیہ اور مستشرقین**، (لاہور: میٹرو پرنٹرز، 2009ء)، ص: 262۔

صوفیائے کرام کی تعلیمات،ان کا وجود،ان کے افکار و اعمال ایک طرف اور دوسری طرف ان کے بارے میں مختلف خیالات کی موجودگی اس بات کی اہمیت کو دو چند کر دیتی ہے کہ اصل صورت حال تک رسائی حاصل کی جائے اور مستشرقین کے اعتراضات کی حقیقت واضح کی جائے۔

3۔ جوازِ تحقیق:

تصوف اور استشراق آج کی دنیا کا ایک اہم موضوع ہے۔ مستشرقین کی سوچ کے مطابق تصوف کی روایت مسلمانوں نے دیگر مذاہب سے مستعار لی ہیں۔ مستشرقین کے ایسے افکار پر مسلم دانشوروں کو کافی تحفظات ہیں۔ یہ تحفظات اس بات کے محرک بنے کہ ان افکار کا تحقیقی بنیادوں پر جائزہ لیا جائے تاکہ اس حوالے سے حقائق واضح ہو سکیں۔

نیز استشراق پر نکلسن، گولڈ زیہر کے کام زیادہ ہونے اور آر بری کے تصوف پر غیر جانبدار افکار کی بناء پر ان تینوں مستشرقین کو مقالہ ہذا میں شامل کیا گیا ہے اور ان کے افکار کو ایک مربوط علمی انداز میں اہل علم کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

4۔ سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ:

میری کاوش سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس موضوع پر اس اسلوب سے کوئی علمی کام نہیں ہوا جس میں اسلامی تصوف؛ نکلسن، گولڈ زیہر اور اے جے آر بری کے افکار و نظریات کا جائزہ لیا گیا ہو، مگر اس موضوع سے متعلق کچھ تحقیقی کام ہو چکا ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

مقالہ جات

1. صابرہ شبنم، **تصوف اور اقبال کا نظامِ فکر** (مقالہ پی ایچ ڈی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی انڈیا، 2009ء)

اس مقالہ میں تصوف کے حوالے سے مختلف ابواب بندی کی ہوئی ہے۔ اس میں تصوف کا تعارف بیان کرتے ہوئے تصوف پر کی ہوئی اہم تحقیقات کو بیان کیا ہے اور تصوف کے حوالے سے اقبال کا نظام فکر کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے کیونکہ علامہ اقبالؒ کا تصوف کے حوالے سے بہت کام ملتا ہے، اس طرح ان کے افکار کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس مقالے میں مقالہ نگار نے صرف تصوف کے ساتھ ساتھ تصوف کے حوالے سے استشراقی فکر کا بھی جائزہ لیا ہے۔

2. مہوش عروج، **تصوف میں شامل غیر اسلامی تصورات**، (ایم فل، نمل یونورسٹی اسلام آباد، 2011ء)

اس مقالے میں تصوف کا مفہوم، اقسام، اصول اور تصوف کے منازل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تصوف میں شامل غیر اسلامی تصورات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہ مقالہ کسی حد تک ہمارے موضوع بحث کے قریب ہے۔ یہ

مقالہ زیر نظر مقالے سے اس بناء پر مختلف ہے کہ اس میں غیر اسلامی نظریات کو بر صغیر کے تناظر میں دیکھا گیا ہے اور اسلام کے علاوہ دیگر تمام مذاہب کے نظریات شامل ہیں۔اور ہمارا عنوان صرف اور صرف اسلامی تصوف اور مستشرقین کے افکار کے گرد گھومتا ہے اس اعتبار سے مختلف ہے۔

3. کنیز فاطمہ، **برصغیر میں صوفیاء کی تعلیمات کا تنقیدی جائزہ**،(ایم فل، نمل اسلام آباد، 2013ء)

مقالہ نگار نے اس مقالے میں بر صغیر میں صوفیاء اور تصوف کے ارتقائی مرحلے کا ذکر کرتے ہوئے مخصوص معاشرتی مسائل کو زیر بحث لایا ہے جیسے صوفیاء کی ازدواجی زندگی کیونکہ بعض صوفیاء نے عائلی زندگی کو اختیار نہیں کیا، معاشی مسائل کے حوالے سے کہ ان کا گزر بسر کیسے ہوتا تھا، معاشرے میں بہتری کے لیے عملی اخلاقی پہلو سے تعلیمات وغیرہ اور موجودہ دور کے اعتبار سے درپیش مسائل کو بیان کر کے ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

4. صدف انصار، **نکلسن کی کتاب The Idea of Personality in Sufism کا تجزیاتی مطالعہ**،(ایم فل مقالہ، گجرات یونیورسٹی، 2017ء)

اس مقالے میں نکلسن کی کتاب کا مختلف جہات سے تجزیہ کیا گیا ہے۔اس میں قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ اس میں حسین ابن منصور حلاج کی پابندی شریعت کو بیان کرتے ہوئے تصوف کے حوالے سے کچھ تذکرہ کیا گیا۔اس طرح مقالہ ہذا میں جس انداز سے تصوف پر تحقیقی کام کرنے کی کوشش ہو رہی ہے وہ منفرد ہے۔

5. محمد فاروق حیدر، **فقہ اسلامی کی تاریخ کے حوالے سے گولڈ زیہر کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ** (ایم فل مقالہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، 2017ء)

اس مقالے میں فقہ اسلامی کے تعارف کو بیان کرتے ہوئے فقہ اسلامی کے آغاز وارتقاء کو واضح کیا ہے۔ایک باب فقہ اسلامی کی تاریخ پر ہے جس میں فقہ اسلامی کے تاریخی ادوار بیان کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ گولڈ زیہر کا تعارف اور اس کے پس منظر اور فقہ اسلامی کے حوالے سے اس کے افکار پر بحث کی گئی ہے۔

6. حافظہ رابعہ اظہر، **اے جے آربیری کی کتاب** " An Introduction to the History of Sufism" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ(ایم فل، منہاج یونیورسٹی لاہور، 2018ء)

یہ مقالہ نہایت اچھی تحقیق پر مشتمل ہے۔اس میں مقالہ نگار نے آربری کی اس کتاب کے اندر موجود ابواب بندی کو نہایت اچھے انداز میں مختصرا بیان کی ہے اور اس میں موجود افکار کا اپنے الفاظ میں تجزیہ کرنے کے ساتھ اس کتاب کے ابحاث کو تنقیدی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔لیکن اس میں نہ تو استشراقی نظریات کو الگ منظم طور پر لکھ کے تجزیہ کیا ہے اور

نہ ہی اس پر تنقید کی ہے۔ جبکہ میرے مقالے میں آر بری اور دوسرے مستشرقین کے نظریات کو بیان کر کے اس پر تجزیاتی انداز میں ان کا جواب بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

7. ڈاکٹر محمد اکرام وِرک، **صحاح ستہ کی احادیث پر منکرینِ حدیث اور مستشرقین کے اعتراضات**، (پی ایچ ڈی مقالہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2007ء)

اس مقالے میں مستشرقین کے احادیث کے بارے میں جو نظریات ہیں ان کو بہت اچھے اور مفصل انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ میرے اس مقالے کی تیاری میں مستشرقین کے حوالے سے اس سے کافی معلومات ملی، چونکہ میرے مقالہ کا اصل محور تصوف ہے اس اعتبار سے اس میں تصوف کے حوالے سے مستشرقین کے افکار پر کوئی باب یا فصل نہیں بنائی گئی۔

8. حفیظ الرحمن، **برصغیر پاک و ہند میں اسلامی تصوف پر ہندومت کے اثرات کا جائزہ** (ایم فل، نمل اسلام آباد، 2017ء

اس مقالے میں تصوف کے مفاہیم و تاریخ اور ہندو معاشرے پر اس کے اثرات کو تفصیل سے تحریر کیا گیا ہے اور ہندومت کے اثرات پر بہت اچھا اور جامع مقالہ ہے۔ لیکن مقالہ ہذا، اس مقالے سے منفرد ہے کہ اس میں تمام تر توجہ اسلامی تصوف اور مستشرقین کے افکار پر ہے۔

9. ضمیر الدین، **گولڈ زیہر کے تصوف پر اعتراضات کا تحقیقی جائزہ**، (ایم فل، جامعہ سرگودھا، گوجرانوالا کیمپس، 2016)

ایم فل سطح کا یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے، اس میں تصوف کے ارتقاء، تصوف پر لکھی گئی کتب، تحریک استشراق اور آخری باب میں گولڈ زیہر کے اسلامی تصوف پر اعتراضات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے حتی الامکان اس پر سیر حاصل بحث کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں صرف گولڈ زیہر کے کچھ اعتراضات کا تذکرہ کیا ہے۔ جبکہ میرے مقالے میں گولڈ زیہر کے علاوہ دوسرے مستشرقین کے اعتراضات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اس حوالے سے یہ ایک منفرد مقالہ ہے۔

تحقیقی مقالات

1. **اسلامی تصوف کے مصادر اور مستشرقین کی آراء** (ریسرچ آرٹیکل): (الایضاح، ج:28، شمارہ:1، 2014ء)

عبد الوہاب الازہری صاحب کا یہ تحقیقی مقالہ جو الایضاح میں شائع ہوا ہے؛ بہت ہی عمدہ اور مفید مقالہ ہے۔ اس میں تصوف کے مصادر پر کیے جانے والے اعتراضات کو اچھے اور منظم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کسی خاص

مستشرق کی آراء پر بات نہیں کی گئی بلکہ جن جن مستشرقین نے تصوف کے مصادر پر بات کی ہے صرف ان پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ جبکہ میرے مقالہ میں صرف مصادر تصوف پر بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ مستشرقین کے خاص گروہ کی تصوف کے بارے میں آراء پر مشتمل ہے۔اس لحاظ سے میرا مقالہ ایک منفرد ہوگا۔

2. ڈاکٹر محمد ریاض محمود، **قرآن، حدیث اور تصوف سے متعلق مستشرق نکلسن کے افکار کا تنقیدی مطالعہ**،،رسالہ: القلم، دسمبر2014ء

اس مقالے میں مقالہ نگار نے مستشرقین کی طرف سے قرآن وحدیث پر اعتراضات کو کافی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تصوف کے موضوع کو زیرِ بحث لا کر صرف مستشرقین کی طرف سے جو اعتراضات ہیں ان میں سے صرف ایک اعتراض کہ ' اسلامی تصوف غیر اسلامی افکار سے ماخوذ ہے' کو بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جبکہ مقالہ ہذا میں منتخب مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

3. معاشرتی اصلاح میں خانقاہی نظام (تصوف) کا کردار اور اثرات ،عاصم اقبال ،IRJIS، جولائی،(2020) ،جلد 2، شمارہ 1،ص: 40-57

اس ریسرچ پیپر میں خانقاہی نظام کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ معاشرتی اصلاح میں خانقاہی نظام کا کافی عمل دخل ہے۔ خانقاہی نظام سے اس پیپر میں آج کی تصوف مراد ہے کہ تصوف کی اصل تعلیمات ہی سے معاشرتی برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ تصوف اور خانقاہی نظام کے ذریعے معاشرتی اصلاح کیسے ممکن ہے اس کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ۔جبکہ مقالہ ہذا میں تصوف کے حوالے سے مستشرقین کے افکار کیا ہیں اس کو بیان کیا گیا ہے۔

4. Algis Uždavinys, *Sufism in the Light of Orientalism*, Acta Orientalia,Vilnensia vol 6 , no.2 (2005):115-125.

یہ ریسرچ پیپر مشتمل ہے ان نظریات پر کہ مشرقی لوگ تصوف کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔اس حوالے سے مختلف مشرقی سکالر کے افکار کو مختلف حوالوں سے ذکر کیا گیا ہے۔

5. Marcia Hermansen, *The Academic Study of Sufism at American Universities*, American Journal of Islam and Society, 24(3),(2007) 24–45.

مارسیا ہرمنسن ایک امریکی اسلامی سکالر کے طور پر مشہور ہے اصل میں وہ کینیڈا سے ہے۔یہ Loyola University Chicago میں اسلامک ورلڈ اسٹڈیز کے پروفیسر اور ڈائریکٹر رہے ہیں۔ تصوف کے حوالے سے

اس کا یہ مقالہ بہت مشہور ہے ''امریکی یونیورسٹیوں میں تصوف کا علمی مطالعہ'' اس میں انہوں نے اصل تصوف اور اس کی تعلیمات کے حوالے سے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

کتب

1. شیخ ابو نصر سراج الطوسی ، **اللمع فی علم التصوف**(مصر، دار الکتب حدیثه ، 1960ء)

یہ کتاب، تصوف کی قدیم ترین جامع کتب میں سے ایک ہے جو السراج طوسیؒ نے چوتھی صدی ہجری کے وسط میں لکھی تھی۔ تصوف کی حقیقت ،مقام عرفا و صوفیا عارفوں اور صوفیوں کی اہمیت ،سالک طریقت کے مقامات، عرفاء کے اقوال، مقالات صوفیائے کرام کا اثبات، قرآن و حدیث سے مشائخ کے مناقب اور احوال صوفیہ کی تشریح ، کرامات و خوارق عادات، صوفی کا ثبوت، مصطلحات صوفی کی تشریح اور ان کی توجیہ و تصریح پر مقالات مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً دو سو صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے جو قرون اولیٰ سے تعلق رکھتے ہیں، ضمناً بہت سے تاریخی واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ توحید الٰہی، اتباع سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی پر خاص زور دیا ہے۔ یہ گراں مایہ ناز کتاب انیسویں صدی عیسوی تک نایاب تھی ، متقدمین حضرات صوفیہ کے یہاں اس کے حوالے سے ضرور ملتے تھے بیسویں صدی عیسوی کے عظیم مستشرق پروفیسر نکلسن کی تلاش اور کاوش سے یہ کتاب ان کے بیش قیمت مقدمہ کے ساتھ 1914ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں تصوف پر جو نئے اعتراضات ہیں اس حوالے سے اس میں کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

2. سید علی بن عثمان هجویری ، **کشف المحجوب**، (لاهور ضیاء القرآن پبلیکشنز،2010ء)

حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ کی بہت سی تصانیف ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف کتاب 'کشف المحجوب' ہے۔ علم تصوف میں یہ پہلی تصنیف ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اور یہ کتاب فن تصوف کی معتبر اور مشہور کتب میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب تقریباً انتالیس ابواب پر مشتمل ہیں جن میں سے اکثر ابوب تعلیماتِ تصوف کے حوالے سے ہیں۔ لیکن مستشرقین کے حوالے سے اور ان کے افکار پر کوئی بحث نہیں ملتی۔

3. الامام عبد الکریم القشیری ،**الرسالة القشیریة**، (القاهره :مطبوعات مکتبه محمد علی صبیح، س-ن)

امام قشیری کی یہ کتاب ہے تو رسالہ مگر تصوف پر ایک جامع کتاب ہے، اس کتاب کے ابتدا میں صوفیاء کے عقائد پھر اکابر صوفیاء کا تعارف اس کے بعد اصطلاحات صوفیاء کا ذکر، اس کے بعد احوال و اقوال اور تعلیمات کو خوبصورت انداز میں ذکر کیا ہے جبکہ آخر میں کرامات اولیاء اور مرشد و مرید کا تعلق ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں تصوف کے حوالے سے بہت اہم اور فکر انگیز تعلیمات موجود ہیں۔ اس مقالے میں تصوف کے حوالے سے اس کتاب سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

4. **Annemarie Shimmel, *Mystical Dimensions of Islam* (The University of North Carolina Press, 1975)**

یہ کتاب مشہور مستشرق این میری شِمل کی کتاب ہے اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور اس کتاب کو تصوف کے عنوان پر ایک شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔اس میں ان ابواب پر بحث کی گئی ہے : تصوف کیا ہے؟ کلاسیکی تصوف کا تاریخی خاکہ ،انسان اور اس کا کمال، صوفی حکم اور بھائی چارے، تصوف ہندوستان اور پاکستان میں۔

5. **Annemarie Shimmel, *Islam: An Introduction*, (USA: State University of New York, 1992).**

یہ کتاب بھی این میری شِمل کی ہے اس کتاب میں اسلام کا تعارف، اسلام سے پہلے عرب کی حالات، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دینِ اسلام کی ترویج و توسیع، قرآن اور اس کی تعلیمات اور اسلام اور صوفی ازم؛ ان موضوعات پر اس نے سیر حاصل بحث کی ہے میرے اس مقالے میں یہ کتاب کافی مددگار ثابت ہوئی۔ لیکن اس کتاب میں بہت ساری باتیں بغیر کسی حوالے کے ہیں جس میں اس نے اپنے سفر کے قصے کا بھی ذکر کیا ہوا ہے اس لحاظ سے اس نے اسلام اور تصوف کے بارے میں سنی سنائی باتوں کو بیان کیا ہے۔ باقی مستشرقین کی نسبت اس کتاب میں انصاف پر مبنی تجزیہ و تحلیل کیا ہوا ہے۔

6. **Edward Saeed, *Orientalism* (New York:Vintage Books, 1979)**

یہ ایڈورڈ ڈبلیو سعید کی کتاب ہے۔ایڈورڈ سعید(1935۔2003)عہد کے چند نامور ترین دانشوروں میں سے ایک تھے۔ادب، کلچر سیاست اور لسانیات سے متعلق موضوعات پر ان کی بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن کا دنیا کے مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ان میں سے سب سے زیادہ فکر انگیز کتاب شرق شناسی ہے۔یہ بہت مفید اور عمدہ کتاب ہے۔

7. **A J. Arberry, An *Introduction to the History of Sufism* (London:Longmans Green, 1943)**

یہ اے جے آربری کی مشہور کتاب ہے۔آربری کی یہ کتاب بنیادی طور پر اس کے ان تین لیکچرز پر مشتمل ہے، جو انھوں نے 1942ء میں سر عبداللہ میموریل ہال کلکتہ میں دیے تھے۔اس کتاب میں تصوف اور اس کی تاریخ کے حوالے سے انتہائی مفید معلومات موجود ہیں۔اس کتاب میں آربری زیادہ تر تصوف کے حوالے سے جن مستشرقین نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں ان پر تنقید کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔

8. **An Account of the Mystics of Islam by A.J .Arberry**

یہ کتاب بھی اے جے آربری کی ہے۔آربری غزالی اور ابن عربی جیسے مفکرین، ابن الفرید، رومی، حافظ اور جامی جیسے شعراء کی ابتدائی صوفیانہ زندگی اور اقوال سے بہت متاثر تھے۔اس لیے اس نے یہ کتاب تحریر کی۔اس کتاب میں مختصر انداز میں تصوف کی تاریخ، اور صوفیاء کے عقائد کے حوالے سے مختلف اقتباسات تحریر کیے گئے ہیں۔

9. Alexander Knysh, *A New History of Islamic Mysticism* Princeton University Press, 2017**)**

یہ کتاب الیگزینڈر کنیش(Alexander Knysh) کی ہے، یہ کتاب کل چھے ابواب اور 231 صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب میں اہل تصوف کے عقائد، خصوصیت اور اہل تصوف کون لوگ ہے؛ اکے حوالے سے اس کتاب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

تصوف کے حوالے سے کچھ اہم معاصر کتب بھی شامل مطالعہ رہی ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

10. پروفیسر یوسف سلیم چشتی، **اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش**،(انجمن خدام القرآن، لاہور، 1976)

اس کتاب میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے تصوف کے فکری و عملی اطوار میں ہونے والی اہم تبدیلیوں اور تصوف میں مختلف اوقات میں شامل ہونے والے غیر اسلامی نظریات اور افکار کی نشاندہی کی ہے۔ مزید یہ کہ انھوں نے تصوف کی تینوں اقسام ہندی، یونانی اور اسلامی کی تاریخ جمع کر دی ہے۔ قطع نظر اس بات کے، کہ اب اس میں بے شمار ایسے عقائد و نظریات داخل ہو چکے ہیں جن کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

11. الدکتور محمد مصطفیٰ الحلمی ،**الحیاۃالروحیۃ فی الاسلام**،(طبعۃ الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، 1948ء)

ڈاکٹر مصطفی حلمی کے مطابق تصوف کا آغاز آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے مبارک دور سے ہوا اور تصوف دراصل اسلام کی روحانی زندگی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی سیرت طیبہ کے مطالعے کے دوران بھی یہ بات ہمیں نظر آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم غار حرا جاتے تھے اور یہ معمول نزول وحی سے پہلے کا تھا اس کا مطلب ہے کہ اس وقت صوفیانہ زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی غار حرا کی تنہائی اور بعد کے زہاد و صوفیہ کی مجاہدات کی اصل الاصول رب کی معرفت تھی۔ لہذا جو تصوف اس اصول سے دور ہوا وہ اسلام سے بھی دور ہوا، وہ ہندی، یونانی یا مسیحی تصوف تو کہلایا جا سکتا ہے مگر یہ اسلام کے بالکل مخالف ہے، اصل تصوف وہی تصوف ہے جو قرآن و سنت اور آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے مطابق ہو۔

12. پروفیسر امان اللہ بھٹی ،**اسلام اور خانقاہی نظام**،(دار السلام، لاہور، 2008)

یہ کتاب بنیادی طور پر پروفیسر امان اللہ بھٹی کا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ تھا جس کو پروفیسر موصوف نے دار السلام کے پلیٹ فارم سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب موجودہ خانقاہی نظام کا ایک جامع جائزہ ہے۔ اس کتاب میں موجودہ

خانقاہی نظام کو اسلام کے بالمقابل ایک نظام کے طور پر پیش کیا ہے اور اس سے اسلامی تہذیب و ثقافت اور عقائد و عبادات شعائر ور سوم میں پیش آنے والی غیر اسلامی خرابیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

13. غلام مصطفیٰ، **تصوف پر دیگر مذاہب کے اثرات**،(ایم فل، جی سی یو فیصل آباد، 2007ء)

اس مقالہ میں تصوف پر دیگر مذاہب کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں تصوف کا تعارف اور آغاز وارتقاء کو بیان کرتے ہوئے کچھ مذاہب کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور ان مذاہب کے تصوف پر کیا کیا اثرات رونما ہوئے ہیں ان کو بیان کیا گیا ہے۔ مذاہب میں سامی اور غیر سامی مذاہب دونوں پر بحث کی گئی ہے۔ عیسائیت، یہودیت، ہندوازم، بدھ ازم، جین ازم وغیرہ کے تصوف پر اثرات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

5۔ سابقہ تحقیق میں موجود خلا:

درج بالا کتابیں اور مقالات تصوف اور استشراق کے حوالے سے ہیں ان میں تصوف کے آغاز وارتقاء اور تاریخی نکتہ نگاہ پر بحث کی گئی ہے۔ اسلامی تصوف پر مستشرقین کی طرف سے جو اعتراضات ہیں ان پر جزوی طور پر تذکرہ ملتا ہے ان اعتراضات کی توضیحات اور تجزیات پر کوئی الگ مقالہ اور کتاب نہ ہونے کے برابر ہے اور خصوصاً پروفیسر نکلسن، گولڈ زیہر اور اے جے آربری کے تصوف پر جو افکار ہیں ان پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ لہذا یہ تحقیقی مقالہ سابقہ تحقیقی کام میں موجود خلا کو پُر کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

زیر نظر مقالہ ''اسلامی تصوف اور مستشرقین کے افکار''اس حوالے سے ایک منفرد مقالہ ہے جس میں خصوصی طور پر پروفیسر نکلسن، گولڈ زیہر اور اے جے آربری ان مستشرقین کے افکار کا تجزیاتی انداز میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں اس موضوع پر تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے لہذا یہ مقالہ اس کمی کو پوری کرنے کی ایک کاوش ہوگی۔

6۔ مقاصد تحقیق:

موضوع تحقیق کے مقاصد درج ذیل ہیں:

1. تصوف کے ارتقائی ادوار اور مختلف مذاہب میں تصوف کے رجحانات کا جائزہ لینا
2. اسلامی تصوف کے بارے میں مستشرقین کے افکار کا تجزیہ و تحلیل کرنا
3. اسلامی تصوف پر وارد شدہ اعتراضات کو علمی و تحقیقی بنیادوں پر پرکھنا
4. اسلامی تصوف میں شامل غیر اسلامی اثرات کا عقلی و نقلی دلائل سے جائزہ لینا

7۔ سوالاتِ تحقیق:

تحقیق کے دوران درج ذیل سوالات کو مد نظر رکھا گیا ہے:

1. اسلامی تصوف کے ارتقائی مراحل اور مختلف مذاہب میں تصوف کے اہم رجحانات کیا ہیں؟
2. اسلامی تصوف پر مختلف ادوار میں غیر اسلامی اثرات کیسے مرتب ہوئے ہیں؟
3. مستشرقین کے اسلامی تصوف کے حوالے سے افکار و نظریات کیا ہیں؟
4. اسلامی تصوف پر مستشرقین نے اعتراضات کیوں کیے ہیں؟

8۔ موضوع کی تحدید اور دائرہ کار:

تصوف اور استشراق پر کام کرنے والے مستشرقین کی تعداد زیادہ ہے لیکن یہاں اس مقالے میں اسلامی تصوف پر مستشرقین میں سے نکلسن، گولڈزیہر اور اے۔ جے۔ آربری کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

9۔ منہجِ تحقیق:

1۔ تحقیق کے معیاری پیراڈائم (Qualittaive Paradigm) میں رہتے ہوئے تجزیاتی منہجِ تحقیق اختیار کیا گیا۔

2۔ تحقیق بنیادی مصادر (قرآن مجید، احادیث نبویہ، روایات اور صحاح ستہ) اور تصوف کی بنیادی مصادر (اللمع فی علم التصوف از شیخ طوسیؒ، رسالۃ القشیریۃ از امام ابوالقاسم القشیری، کشف المحجوب از سید علی بن عثمان ہجویری، احیاء علوم الدین از امام ابو حامد غزالی، تذکرۃ الاولیاء از شیخ فرید الدین عطار وغیرہ) سے استفادہ کیا گیا ہے۔

3۔ مستشرقین کے افکار کے لیے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

Reynold Alleyne Nicholson, *Studies in Islamic Mysticism*. (United Kingdom: Library of Alexandria, 2020), Arberry, Arthur J. *An Introduction to the History of Sufism*, (Longmans and green, 1942), Goldziher, Ignaz. *Introduction to Islamic Theology and Law* (United States: Princeton University Press, 2021), Said, Edward W., *Orientalism* (India: Penguin Group, 1995).

4۔ قرآن مجید کے ترجمے کے لیے سید ابوالاعلی مودودی کے ترجمہ 'تفہیم القرآن' سے استفادہ کیا گیا ہے۔

5۔ بائبل کے لیے کتاب مقدس (پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور، تاریخ اشاعت 1995) سے استفادہ کیا گیا ہے۔

6۔ حسب ضرورت ثانوی مصادر (احسان و تصوف از خواجہ شمس الدین عظیمی، اسلام اور تزکیہ نفس از ڈاکٹر محمد امین، حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہ، مذاہب عالم از عماد الحسن اور تاریخ تصوف از سلیم چشتی، وغیرہ کی طرف بھی رجوع کیا گیا ہے۔

7۔جدید تحقیق کے ذرائع، مثلاً علمی ویب سائٹس(مکتبہ شاملہ، اردو پوائنٹ ، بیسٹ اردو بکس، ڈیلی پاکستان،کتاب وسنۃ، محدث لائبریری)، ای کتب تحقیقی مجلات اور آرٹیکلز سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

8۔ مقالے کی تدوین اور حوالہ جات وغیرہ کے لیے NUML کے منظور شدہFORMATکواختیار کیا گیا ہے۔

محمد ذاکر

پی ایچ ڈی سکالر

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، نمل اسلام اباد

June, 19, 2023

باب اوّل:

تصوف کی حقیقت، حیثیت اور ارتقائی ادوار

فصل اوّل: تصوف کا آغاز وارتقاء

فصل دوم: تصوف مختلف مذاہب کی نظر میں

فصل سوم: تصوف میں غیر اسلامی افکار کی آمیزش

باب اوّل:

تصوف کی حقیقت، حیثیت اور ارتقائی ادوار

تصوف، اس طریقۂ کار یا اسلوبِ عمل کے لیے اختیار کیا جاتا ہے جس پر کوئی صوفی عمل پیرا ہو اور یہ قرآنی اصطلاح میں تزکیۂ نفس اور حدیث کی اصطلاح میں احسان کے مقابل سمجھا جاتا ہے۔

تصوف کا لفظ، اسلامی ممالک خصوصاً برصغیر میں روحانیت، ترکِ دنیاداری اور اللہ عزوجل سے قربت کے مفہوم میں لیا جاتا ہے، تصوف کو تزکیہ نفس بیان کرنے والے افراد تصوف کو قرآن و سنت کے عین مطابق قرار دیتے ہیں اور ابتدائی ادوار میں متعدد مکاتبِ فکر کے علماء کرام تصوف سے یہی مفہوم مراد لیتے تھے۔ پھر بعد میں تصوف میں ایسے افکار ظاہر ہونا شروع ہوئے جن کو علماء کرام نے نہ صرف ناپسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ ایسے تصوف کو رد بھی کیا۔ مسلم علماء تصوف پر معترض اور متفق، دونوں اقسام کے طبقات پائے جاتے ہیں؛ کچھ کے خیال میں تصوف شریعت اور قرآن سے انحراف کا نام ہے اور یہ طبقہ تصوف کے طریقہ کار سے متفق نہیں اسی لیے اس کو شریعت کے خلاف قرار دیتے ہیں اور کچھ اسے شریعت کے مطابق قرار دیتے ہیں اور وہ اس کو روحانی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے قرآن و شریعت سے عین مطابق قرار دیتے ہیں۔

سلفی علماء کے مطابق تصوف حضرت محمد ﷺ کے بعد اسلام میں داخل کیا گیا ایک بدعت ہے اور تصوف قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے افکار سے تصوف کی اصل روح بدل گئی وہ اپنی اصل تعلیمات پر قائم نہیں رہا۔ جبکہ انسانی زندگی میں مختلف شعبے ہوتے ہیں: شعبہ ایمانیات، احکامات اور شعبہ روحانیات وغیرہ ان تمام شعبوں کی ذمہ داریاں اسی شعبہ سے وابستہ لوگوں کے کندھوں پر عائد ہوتی ہے۔ شعبہ اخلاص و تزکیہ کا کام صوفیہ و اولیاء اللہ کا فریضہ ہے۔ تصوف کو تزکیہ نفس، طریقت اور اخلاص بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ تصوف کی اہمیت و ضرورت یہ ہے کہ مسلمان کو رذائل اخلاق سے پاک کر کے اس کے دل میں صرف اور صرف اللہ عزوجل کی معرفت پیدا کیا جائے۔

اس باب میں تصوف کی حقیقت، حیثیت اور اس کے آغاز و ارتقاء کو مختلف ادوار کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فصل اول: تصوف کا آغاز وارتقاء

اسلام اپنے معتقدین کو جہاں اعلیٰ و منفرد نوعیت کے اسلوبِ زندگی کی رہنمائی کرتا ہے وہیں ایک ایسے مثالی معاشرے کی تشکیل پر بھی زور دیتا ہے جس کی غایتِ اولی ایمانی، اخلاقی وروحانی اقدار کا غلبہ، احترامِ آدمیت، امن وآشتی اور وحدت نوعِ انسانی کا عالمگیر تصور ہے تاکہ معاشرے میں بسنے والے افراد اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں باہم متحد، مخلص، وفادار اور سماج کے کارآمد رکن کی حیثیت سے متحرک، محبِ انسانیت، روحانی ذہن اور اخلاق حسنہ کا عملی نمونہ ہوں۔ اسی غایت وضرورت کی تکمیل اور افراد کی روحانی نشوونما کے لیے اِسلامی تہذیب کا مستقل شعبہ اور علومِ دینیہ کا اہم موضوع تصوف (روحانیت) کے نام سے معروف ہے جسے انگریزی اصطلاح میں ''Mysticism'' یا ''Sufism'' کہا جاتا ہے۔

تصوف اپنی حقیقت و نصب العین میں فعّال، تکریم اِنسانی کا علمبردار، عالمگیر امن کا داعی، مکارمِ اخلاق، تزکیہ نفس، تصفیۂ قلب، خود گری (Self-actualization)، اخلاص فی العمل، حسنِ معاملہ اور معرفتِ ربّانی سے عبارت ہے جس کے مآخذ ومصادر قرآنِ کریم وسنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ تصوف اور اسلام ایک دوسرے کا تکملہ ہیں کیونکہ تعلیماتِ تصوف کو سمجھے اور اپنائے بغیر کماحقہ فہمِ دین ممکن نہیں کیونکہ تصوف نہ صرف اسلامی تعلیمات، روایات، ثقافت اور تہذیب وتمدن کا ناگزیر حصہ ہے بلکہ اسے روحِ دین (اسلام کا باطنی پہلو) کی حیثیت بھی حاصل ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اس حقیقت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

> '' جس طرح دین کے تمام اعمال کی ایک ظاہری شکل ہے اور ایک اس کی باطنی حقیقت ظاہری شکل کے بغیر باطنی حقیقت کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور باطنی حقیقت کے بغیر ظاہری شکل ایک بے جان جسم کی طرح ہے۔ بس یونہی دین کی ظاہری شکل کا تعلق شریعت سے ہے اور باطنی حقیقت کا تعلق طریقت یا تصوف سے''[1]۔

باالفاظ دیگر یہی حقیقت شیخ ابو نصر سراج الطوسیؒ نے ''کتاب اللمع فی التصوف'' میں کچھ اس طرح بیان کی ہے:

> ''اہل تصوف کے مطابق کائنات میں موجود تمام چیزوں کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک پہلو کا نام ظاہر کہلاتا ہے تو دوسرے پہلو کا نام باطن ہے۔ باطن کو روحانیت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ صوفیاء کی

---

[1] دہلوی، شاہ ولی اللہ، **القول الجمیل**، (کراچی: ایجوکیشنل پریس، 1970ء)، ص: ۲۵۔

اصطلاح میں اسی باطن کو طریقت بھی کہا جاتا ہے۔ طریقت قرآن وسنت سے ہٹ کر کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ انہی کے مغز و باطن کا نام ہے''[1]۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو تصوف کے آثار اوائل اسلام سے ہی ملتے ہیں۔ جبکہ دیگر اصطلاحات کی طرح علمی سطح پر حسبِ ضرورت لفظ ''تصوف'' اور ''صوفی'' کی اصطلاحات بعد میں رائج ہوئیں اور اس کا باقاعدہ آغاز دورِ اسلام کے بعد ہی ہوا۔ معروف انگریز سکالر رینولڈ اے نکلسن اپنی تصنیف A Literary History of the Arabs میں آغازِ تصوف کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

'' تصوف کی نشوونما کے دو ادوار ہیں۔ پہلا دور اسلام کی ابتدا سے نویں صدی عیسوی کے آغاز تک اور دوسرا نویں صدی سے بارہویں صدی تک اور اسلام کے آغاز کے بعد ہی تصوف کی باقاعدگی سے شروعات ہوئی''[2]۔

موضوع سے مطابقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تعریفِ تصوف اور صوفی سے متعلق آئمہ تصوف کے صرف چند اقوال درج کیے جاتے ہیں۔

امام قشیری اپنی مشہور کتاب ''الرسالۃ القشریۃ'' میں تصوف اور صوفی کی وجہ تسمیہ یوں بیان کرتے ہیں:

''وقال القشیری : فاماقول من قال انه من الصوف وتصوف اذا لبس الصوف کما یقال تقمص اذا لبس القمیص فذلک وجه''[3]۔

بعض محققین نے لفظ صوفی کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ صوفیاء اکثر صوف کا لباس پہنتے تھے اس نسبت سے انھیں صوفی کہا گیا، کیونکہ پہلے زمانے میں جب کوئی اونی لباس پہنتا تو عربی میں اس کے لیے تصوف کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس طرح قمیص پہننے کو تقمص کہا جاتا ہے۔

دونوں لفظ ''صوفی اور تصوف'' کے مادہ اشتقاق اور لغوی و اصطلاحی معنوں سے متعلق آئمہ، صوفیاء اور اصحابِ لغت نے اپنی مختلف آراء، اقوال اور نقطہ نظر پیش کیے ہیں۔ بعض کی رائے میں ''تصوف'' صفوہ (صفائی، پاکیزگی) سے

---

[1] الطوسیؒ، شیخ ابو نصر سراج، **اللمع فی علم التصوف** (مصر: دار الکتب حدیثہ، 1960ء)، ص: 65۔

[2] Nicholson, R. A., *A Literary History of the Arabs* (London: The Routledge Arabia Library. 1998,) 88.

[3] القشیری، الامام عبدالکریم، **الرسالۃ القشیریۃ**، (القاہرہ: مطبوعات مکتبہ ومطبعۃ محمد علی صبیح، س۔ن)، ص: 216۔

ماخوذ ہے، جبکہ بعض کے نزدیک صوفی کا لفظ ''صوف'' سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی ''اُون'' کے ہیں۔ حلقۂ علم و تحقیق میں یہ اقوال زیادہ قوی اور مدلل حیثیت رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ بھی کثیر آراء ہیں۔

امام القشیریؒ ''رسالہ قشیریہ'' میں صوفی کی تعریف اور وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو شخص دل کی صفائی پر توجہ دیتا ہے اور دنیوی مرغوبات سے کنارہ کش ہو جاتا ہے صوفی کہلاتا ہے۔ صوفی کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی کہ: ''صفائے باطن اور پرہیز گاری کی وجہ سے ایسے آدمی کو صوفی اور جماعت کو صوفیہ کہا جانے لگا۔اس جماعت سے وابستہ آدمی کیلیے متصوف اور جماعت کیلیے متصوفہ کا لفظ استعمال ہونے لگا۔'' [1]

شیخ ابو نصر عبداللہ بن علی سراج طوسیؒ لفظِ صوفی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''وہ اصحاب جو اون کا لباس پہنتے تھے انھیں صوفی کہا جاتا تھا۔۔۔صوف کا لباس انبیائے کرام (علیہم السلام) کا طریقہ اور اولیاءواصفیاء کا شعار رہا ہے''[2]۔

اس اقتباس کی رو سے جو اونی لباس زیبِ تن کرے وہ صوفی ہو گا کیونکہ ان کے نزدیک صوفیائے کرام سادہ زندگی گزارنے کے قائل تھے۔دنیا کے الائشوں اور زینت و آرائش سے پاک زندگی گزارنے کا نام صوفی سمجھا جاتا ہے۔

فقر و تصوف کے درخشندہ آفتاب سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو (قدس اللہ سرّہٗ) فرماتے ہیں:

''تصوف دل سے ماسویٰ اللہ کا زنگ اتارنے کی راہ ہے''[3]۔

اسی طرح شیخ ابوالحسن علی بن عثمان ہجویریؒ نے ''کشف المحجوب'' میں تصوف کے متعلق یہ قول درج کیا ہے:

''تصوف دل اور بھید کی صفائی کا نام ہے مخالفت کی کدورت سے۔''[4]

تصوف اور معارفِ اسلامی کی مشہور کتاب ''شرح فتوح الغیب'' میں صاحب کتاب تصوف کی تعریف اس انداز میں کرتے ہیں۔ ''تصوف کے معنی ہیں تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور ماسوی اللہ کی طرف التفات ترک کرتے ہوئے مولا کریم کی بارگاہ میں قرب و وصول حاصل کرنا تصوف کہلاتا ہے۔''[5]

---

[1] نوری، محمد عرفان بیگ، **روحِ تصوف**، (علی گڑھ: دارالعرفان،، 2005ء)، ص: 76 ۔

[2] الطوسی، ابو نصر سراج، **اللمع فی علم التصوف**، ص: 43 ۔

[3] باھوؒ، سلطان، **عین الفقر**، (بھارت: دارالعرفان، سرسید نگر، علی گڑھ،، 2003ء)، ص: 43 ۔

[4] ہجوری، سید علی بن عثمان، **کشف المحجوب**، (لاہور: ضیاء القرآن پبلیکشنز، 2010ء)، ص: 56 ۔

[5] دہلوی، شیخ عبدالحق محدث، **شرح فتوح الغیب**، (لاہور: صفہ اکیڈمی، 2000ء)، ص: 742۔

علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں تصوف کو یوں بیان کرتے ہیں:

''اصل التصوف العکوف علی العبادة والانقطاع الی الله تعالی والاعراض عن زخرف الدنیا و زینتها والز هد فیما یقبل الیه الجمهور من لذة ومال و جاه وکان ذلک عاما فی الصحابة و السلف''[1]

تصوف کا اصلی معنی عبادت پر ہمیشہ پابندی و لزوم اختیار کرنا ، اللہ تعالیٰ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا، دنیا کی زیب وزینت سے کنارہ کش ہونا، لذت، مال اور جاہ جس کی طرف لوگ مائل ہوتے ہیں ان سے اجتناب کرنا اور یہ طریقہ صحابہ کرام اور سلف صالحین میں عام مروج تھا۔

المعجم الوسیط میں تصوف کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''التصوف:طریقة سلوکیة قوامها التقشف والتحلی باالفضائل لترکو النفس و تسمو الروح''[2]

یعنی زندگی گزارنے کا ایسا راستہ جس کی اساس اعلیٰ و عمدہ فضائل سے مزین ہو۔جس سے نفس انسانی کو طہارت و پاکیزگی اور روح کو رفعت و بالیدگی میسر آئے تصوف اسلامی کہا جاتا ہے۔

چونکہ تصوف اپنی حقانیت میں عالمگیر اور آفاقی نوعیت کا ہے اس لیے تصوف نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ غیر مسلم معاشرے میں بھی مقبول ہیں جسے اہلِ مغرب اپنے سماج کا علمی، ادبی و فکری حصہ سمجھتے ہیں بلکہ مغربی دانشور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس مادہ پرست دور میں بھی اگر انسانیت کی باطنی تطہیر کا کوئی واحد ذریعہ ہے تو وہ اسلام کا روحانی نظام تصوف ہے۔ عصر حاضر کے نامور فرانسیسی سائنس دان ڈاکٹر موریس بوکائے اپنی معروف تصنیف ''بائبل، قرآن اور سائنس'' میں اس حقیقت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''موجودہ سائنس (کے تحت ہونے والی مادی ترقی) نے انسانی دماغوں کو جس قدر ناپاک کر دیا ہے ان کو پاک کرنے کے لیے بڑی روحانی قوت کی ضرورت ہے اور وہ اسلام کی تعلیمات سے ہی حاصل ہو سکتی ہے''[3]۔

---

[1] ابن خلدون، عبدالرحمن بن محمد، **تاریخ مقدمۃ ابن خلدون**، (لبنان: موسسہ جمال للطباعۃ والنشر، بیروت)، ص: 390/1

[2] إبراهيم أنيس، **المعجم الوسیط**، (بیروت: مجمع اللغة العربية، مكتبة الشروق الدولية، 2004ء)، ص: 529

[3] Bucaille, Maurice, *The Bible The Quran and science*, (2001), 81.

شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی مغرب میں Best Seller Books مولانا رومیؒ کی ہیں۔ تصوف اور تعلیمات تصوف؛ دینِ اسلام کے اہم ثقافتی و تہذیبی شعبہ کی حیثیت سے دنیا کے مختلف تحقیقی و تعلیمی اداروں اور جامعات میں بطورِ نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ کیونکہ مولانا رومی نے اپنی ان تصانیف کے ذریعے حقیقتِ تصوف کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، جبکہ اس کے برخلاف بہت سے مصنفین اور خصوصاً مستشرقین نے تصوف کو کسی اور رنگ میں پیش کیا تھا۔ انھوں نے تصوف کی تعلیمات کو اسلامی تعلیمات سے دور کر کے پیش کیا تھا تو اس اثناء میں مولانا روم جیسے لوگوں نے اصل تصوف کے بارے میں تفصیلا کتاب لکھی اس کے نتیجے میں دنیا کے مختلف تعلیمی اداروں اور جامعات میں تعلیماتِ تصوف کو بطور نصاب پڑھایا جانے لگا اور تصوف کی اصلیت سے لوگوں کو آگاہی ملی۔

مشہور مستشرق این میری شِمل تصوف کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتی ہے:

"Mysticism can be defined as love of the absolute- for the power that separates true mysticism from mere ascetcism is love .divine love makes the seeker capable of bearing, even of enjoying , all the pains and afflications that God showers upon him in order to test him and to purify his soul."[1]

تصوف کی تعریف مطلق کی محبت کے طور پر کی جاسکتی ہے- کیونکہ حقیقی تصوف کو محض تصوف سے الگ کرنے والی طاقت محبت ہے۔ محبتِ الٰہی سالک کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ تمام تکلیفیں اور محبتیں برداشت کر سکے، یہاں تک کہ اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، جو خدا اس پر آزمانے کے لیے اور اس کی روح کو پاک کرنے کے لیے نازل کرتا ہے۔

ایک اور جگہ این میری شِمل، جنید عراقی جو کہ ایک مشہور صوفی ہے اس نے تصوف کی جو تعریف بیان کی اس کو وہ یوں بیان کرتی ہے۔

Junayd the undisputed leader of the Iraqian school of mystism wrote "Sufism is not by much praying and fasting but it is the security of the heart and the generosity of the soul"[2].

عراقی مکتبہ تصوف کے غیر متنازعہ رہنما جنید نے لکھا ہے کہ "تصوف زیادہ نماز اور روزے سے نہیں ہے بلکہ یہ دل کی سلامتی اور روح کی سخاوت ہے۔

[1] Schimmel Annemarie *Mystical Dimension of Islam*, (USA:The University of North Carolina press Chapel Hill 1975),4.
[2] Ibid.,14.

تصوف کا مذکورہ بالا مفاہیم کی روشنی میں اسلامی تصوف کا یہ وہ مفہوم ہے جس کو اہل تصوف اپنا مقصدِ حیات بناتے ہیں،ان کی ساری زندگی تزکیہ کے کٹھن مرحلوں کو صدق دل سے طے کرنے کے لیے وقف رہتی ہے تاکہ آخر کار وہ حق تعالیٰ کے انوار و تجلیات مشاہدہ کی منزل میں خیمہ زن ہونے کی سعادت حاصل کریں اس طرح وہ انسانیت کے بلند مقام کو پالیتے ہیں۔

تصوف کی اہمیت:

تصوف کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ شریعت کے سامنے سر جھکایا جائے اور اس کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔اسی اسلام اور ایمان میں قلبی محبت اور ہمہ دم استحضار شامل ہو جائے اور شرعی احکام جنہیں احکام تکلیفی کے عنوان سے فقہاء تعبیر کرتے ہیں ان سے تکلیف کا مادہ ختم ہو کر انسان کا طبعی اور دلی تقاضا بن جائے؛جب انسان کے دل میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی تمام عبادات واعمال بلکہ اس کی پوری زندگی اسی کیفیت کے زیر اثر آجاتی ہے،اسی کیفیت قلبی کا نام رسول صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے حدیث جبریل میں احسان رکھا ہے۔

یہی احسان پورے دین کا مغز اور خلاصہ ہے۔اس کے حاصل ہونے کے بعد انسان کو خدا کا خصوصی قرب نصیب ہو جاتا ہے۔اسی احسان کو حاصل کرنے کی کوشش اور اس کی جستجو کا نام تصوف ہے۔تصوف کو احسان کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ حدیث کی کتابوں میں ایک حدیث ''حدیثِ جبرئیل'' کے نام سے مشہور ہے،اس میں ہے کہ ایک دن جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں حضور پاک صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے حضور حاضر ہوئے اور مختلف سوالات کیے گئے،ان سوالوں میں سے ایک سوال یہ تھا کہ :احسان کیا ہے؟آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا:

((أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ))[1]۔

ترجمہ: کہ تم خدا کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو، بھلا اگر تم خدا کو دیکھ نہیں رہے،تو کم سے کم یہ یقین کرلو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے،یہی احسان ہے۔

---

[1] مسلم، مسلم بن حجاج، **الصحیح** (بیروت: دار الجیل، 1334ھ-)، باب بیان الایمان، ولاسلام والاحسان، ص: 87/1 ؛القزوینی، ابوعبداللہ، محمد بن یزید ابن ابن ماجہ، **السنن**، (بیروت: دار الرسالۃ العالمیۃ، 1430ھ) باب فی الایمان، ص: 25/1۔

کتاب ''تصوف واہل تصوف'' میں احسان کے حوالے سے مصنف یوں بیان کرتا ہے:

''بندے کے دل میں اسی احسان کی کیفیت پیدا کرنے کا صوفیاء کی زبان میں دوسرا نام تصوف یا سلوک ہے۔ تصوف دراصل بندہ کے دل میں یہی یقین اور اخلاص پیدا کرتا ہے۔ تصوف مذہب کی روح ہے، مذہب سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ جس طرح جسم اس مردہ لاش کی طرح ہے جس میں کوئی جان نہیں اس سے روح نکل گئی ہے۔ جب روح جسم سے نکل جائے تو اس جسم کی کوئی حیثیت نہیں رہتا ،اسی طرح اللہ کی عبادت بغیر اخلاص کے بے قدر وقیمت ہے۔[1]

تصوف اللہ تعالیٰ کی محبت انسان کے دل میں پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جب کسی انسان کے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو جائے تو وہ انسان خود بخود اللہ کی مخلوقات سے محبت کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ صوفی مخلوقات کو خدا کا عیال تصور کرتا ہے اور اللہ کی محبت انسان کو اس کی نافرمانی سے روکتی ہے۔ صوفی حضرات کی زندگی حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پوری طرح ادا کرتے ہوئے گزرتی ہے۔

صاحبِ کتاب نے اپنی کتاب '' تصوف اور اہل تصوف''میں تصوف کو لفظِ احسان کا مترادف قرار دیتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ تصوف خدا کے قریب ہونے کا نام ہے اور خدا کے قریب ہونے کے لیے ایسے کام کرنے کی ضرورت ہے جس سے اللہ خوش ہو جائے۔ اللہ اس وقت خوش ہو گا جب اس کے بندے خوش ہو جائیں۔ اس لیے صوفی حضرات کی زندگی حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پوری طرح ادا کرتے ہوئے گزرتی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز انسان کو اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بنائے اور اس کے بندوں کا خیر خواہ بنائے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اسی کو احسان اور تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تصوف کا مختصر تاریخی پسِ منظر اور ارتقاء:

تصوف اسلام کا ایک اہم شعبہ ہے۔ اس کا ارتقائی مراحل رسول اکرم صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے شروع ہوتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں دینِ اسلام کا آغاز اور اس کی تکمیل ہوئی، اس لیے بھی تصوف کی بنیادی چیزیں کسی نہ کسی شکل میں عملی طور پر آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں موجود تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی حیاتِ اقدس کے تین ادوار اس اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں:

---

[1] بھٹو ، محمد موسیٰ، **تصوف واہلِ تصوف**، (سندھ: نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ حیدر آباد، 2008ء)، ص: 115۔

پہلا دور:

1۔ قبل از نبوت

2۔ قبل از ہجرت

3۔ بعد از ہجرت

1۔دور قبل از نبوت:

تمام تاریخ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبل از بعثت شور وشغف اور دنیا کی آلائشوں سے دور غارِ حرا میں جاکر اپنا کافی وقت تنہائی میں گزارتے تھے اور وہاں گوشہ نشین ہو کر کائنات کی اہمیت اور خالقِ کائنات کی قدرت کاملہ پر غور وفکر میں مشغول رہتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال قلیل اشیائے خورد ونوش کے ساتھ پورا رمضان کا مہینہ اس غار میں بسر کیا کرتے تھے۔دنیا کی عیش وعشرت کی زندگی سے قطعی بے نیاز رہتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ زندگی سراسر روحانی تھی۔اس طرح کی زندگی ان مسائل کے لیے ضروری ہے،جن کا تعلق معرفتِ معبود، معرفتِ کائناتِ عالم اور معرفتِ نفس انسانی سے ہو۔انسان کو چاہیے کہ پہلے اپنی نفس کو پاکیزہ کرے اور اپنے نفس کو پہچان لے پھر وہ اپنا رب کو پہچان سکے گا۔نفس کو پہچانے بغیر خدا کو پہچاننا ممکن نہیں۔اس لیے روایت میں آیا ہے:

((مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ)) [1] ۔

ترجمہ: جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کی گویا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

اس روایت کی صحت پر کوئی دلیل نہیں یہ ایک موضوع ومتکلم فیہ روایت ہے۔لیکن صوفی نفس کی تربیت پر زور دیتا ہے اس حوالے سے یہ روایت یہاں ذکر کی گئی ہے۔

جب تک انسان تزکیہ نفس کر کے خواہشاتِ نفسانی کو ترک نہ کرے،اس وقت تک اس کے لیے معرفتِ خداوندی ناممکن ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آئندہ چل کر نبوت کے منصبِ عظمیٰ پر فائز ہونا تھا،اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تزکیہ نفس پر اتنا زور دیا کہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طور پر چن لیا۔

---

[1] السیوطی،الجلال الدین،**الحاوي للفتاوي**(مصر:دار الکتب العلمیہ،1421ھ)،ص:288۔

دورِ نبوت قبل از ہجرت :

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب نفس کو پاک کر کے اپنے آپ کو منصبِ نبوت پر فائز ہونے کی صلاحیت پیدا کرلی، تواس وقت خداوند متعال نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اپنی توجہ منعطف فرمائی اور جبریل امین کے ذریعے وحی نازل ہوئی:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ،خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ، الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ،عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾[1]۔

ترجمہ:پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا (1) جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی (2) پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے (3) جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا (4) انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

یہی قرآن مجید کی پہلی آیات ہیں جو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئیں اور یہیں سے بنی نوع انسان کے لیے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوتی ہے۔[2]

بعثت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دینِ حق کا اعلان کرتے ہوئے لوگوں کو ایک خدا کی طرف دعوت دی تو کفار مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سخت برہم ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی شدید مخالفت کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ تبلیغِ دین کے عوض ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طرح طرح کی ایذائیں اور تکلیفیں دیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام رکاوٹوں کے باوجود دعوت توحید کو جاری رکھا۔[3]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب ایک مرتبہ امر حق کی صداقت عیاں ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محض اس کے اعلان کی خاطر تمام مشکلات کو برداشت کیا،مکہ معظمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت کے بعد تیرہ سال تک رہے۔ لیکن اس عرصے میں کفار مکہ کی مخالفت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عبادت اور ذکر و فکر کے لیے پر سکون مواقع میسر نہیں آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کی طرف اللہ کے اذن سے ہجرت کا فیصلہ کیا۔

---

[1] العلق:5-1/96

[2] نعمانی، شبلی، **سیرت النبی**، (اعظم گڑھ: دار المصنفین، 1952)، ص:202

[3] نور الدین ،ابو سعید، **اسلامی تصوف اور اقبال**، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 1995،)ص:75

دورِ نبوت بعد از ہجرت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور ایک نئی قوت اور ایک نئے عزم کے ساتھ دین اسلام کی تبلیغ و ترویج میں مشغول ہو گئے۔ کم عرصہ میں ہی اسلام کی بنیادیں اس قدر مستحکم ہو گئیں کہ کفر والحاد کی کوئی طاقت ان کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکی۔

آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کا یہ دور معنویت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔آپ کی اس زندگی میں ہمیں عملی تصوف کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نہایت خشوع کے ساتھ عبادت انجام دیتے تھے، حدیث میں آیا ہے کہ ایک سائل نے احسان کے متعلق سوال کیا تھا اس کے لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے فرمایا:

((الاحسانُ اَن تَعبدَ اللهَ کَانَّکَ تَرَاہ، فان لَم تَکن تَرَاہ فَانَّہ یَرَاک))[1] ۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق احسان اس حالت کا نام ہے جس میں بندے کو دیدارِ الٰہی جیسی کیفیت نصیب ہو جائے یا کم از کم اس کے دل میں یہ احساس ہی جاگزین ہو جائے کہ رب اسے دیکھ رہا ہے۔

امام نووی رحمۃاللہ علیہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

"کہ ایسی حالت میں بندہ اپنی عبادت کو پورے کمال کے ساتھ انجام دے گا اور اس کے ظاہری ارکان و آداب کی بجا آوری اور باطنی خشوع و خضوع میں کسی چیز کی کمی نہیں کرے گا۔ الغرض عبادت کی اس اعلیٰ درجے کی حالت اور ایمان کی اس اعلیٰ کیفیت کو "احسان" کہتے ہیں"[2]۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعلیم جس برگزیدہ ہستی نے دی ہے وہ خود پہلے اس پر عمل کرتے ہیں پھر دوسروں کو بتاتے ہیں۔اس کا ایک بہترین نمونہ ہمیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے ملتا ہے:

عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم پوری رات عبادت کرتے نتیجتاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمِ اقدس پر چھالے پڑ جاتے۔ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی تکلیف کیوں گوارا فرماتے ہیں، جب کہ خدا نے کے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں؟ تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] بخاری، محمد ابن اسماعیل، **الجامع الصحیح**،(القاہرۃ: دارالشعب، 1987)، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان ووجوب الایمان، ص: ٤٣

[2] مسلم، **الصحیح مسلم**، کتاب الایمان، ص: ٥٦

((أَفَلَا أحب أن أكونَ عبدا شَكُورًا))[1]۔

''کیا پھر میں شکر گزار بندہ بننا پسند نہ کروں؟''

آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم اللہ کے حضور، اللہ کو لائق عبادت سمجھ کے اس کی عبادت کیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی ان عبادات کو صوفیائے کرام نے اپنی تعلیمات کا حصہ بنا دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات میں تصوف کے بہت سے مقامات پائے جاتے ہیں جیسا کہ توبہ، زہد، فقر، توکل اور رضا، تصوف کی بنیادی مقامات اور تعلیمات ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

توبہ:

توبہ سلوک کا اولین مقام ہے جس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے لوگوں کو برابر تعلیم دی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا﴾[2]۔

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزانہ ستر مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا کرتے تھے۔

((وَاللهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً))[3]

صوفیائے کرام نے توبہ کے مختلف مدارج اور منازل بیان کئے ہیں۔ حضرت علی ہجویریؒ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں توبہ کے تین درجے بیان کیے ہیں:

1۔ **توبہ:** عذاب الٰہی کے خوف کے باعث گناہ کبیرہ سے ہوتی ہے اور یہ عام مومنین کا درجہ ہے۔

2۔ **انابت:** مزید ثواب کی طلب کے لیے ہوتی ہے جو اولیاء اور مقربین الٰہی کا مرتبہ ہے۔

3۔ **اوبت:** فرمان الٰہی کی رعایت کے لیے ہوتی ہے جو انبیاء و مرسلین کا درجہ ہے[4]۔

---

[1] القزوینی، محمد بن یزید أبو عبداللہ، **السنن**، باب ماجاء في طول القیام في الصلوات، ح:1419، ص:76

[2] التحریم:12/66

[3] بخاري، **الجامع الصحیح**، کتاب: بدء وحی، ص:3/8

[4] ہجویری، **کشف المحجوب**، ص:229

ان آیات واحادیث اور اقتباسات سے ظاہر ہو گیا کہ توبہ کا تصور ایسا ہے جس کی اساس قرآنِ حکیم، احادیث نبوی اور تعلیمات اسلام میں موجود ہے۔

ورع:۔

تصوف میں ایک مقام ورع ہے جس کے معنی اصطلاح تصوف میں پرہیز یا احتراز کرنا ہے۔بنیادی طور پر ورع کا مقصد حلال اور حرام کی تمیز ہے۔پرہیز کرنے والے حرام سے پرہیز کرتے اور حلال کو اختیار کرتے ہیں۔تصوف میں پرہیزگاری صرف یہ نہیں کہ جو صریحا حلال ہے اس کو حلال اور جو حرام ہے اس کو حرام سمجھا جائے، بلکہ اہل ورع ان چیزوں سے بھی پرہیز کرتے ہیں جو مشتبہ ہوں یعنی نہ صاف حلال اور نہ صاف حرام ہے۔اس کی تعلیم بھی حضور صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے ہاں پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں اس حوالے سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ذَلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ﴾[1]۔

ترجمہ:یہ تھا (تعمیر کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لیے بہتر ہے اور تمہارے لیے مویشی جانور حلال کیے گئے، ما سوا اُن چیزوں کے جو تمہیں بتائی جا چکی ہیں پس بتوں کی گندگی سے بچو، جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو۔

اس آیت کریمہ میں حلال اور حرام کی دو بیّن حدوں کے درمیان کچھ ایسی چیزیں ہیں، ان پر نہ عمومی طور پر نہ حلال کا حکم صادر آتا ہے اور نہ حرمت کا حکم۔ایسی چیزیں شبہات کہلاتی ہیں۔ایسی چیزوں سے اجتناب کرنا سالک کے لیے اشد ضروری ہے۔چنانچہ کسی صحابی نے رسول خدا صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم سے سنا:

((إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنْ النَّاسِ فَمَنْ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ))[2]۔

"بے شک کچھ چیزوں کی حلیت اور حرمت واضح ہوتی ہے اور کچھ چیزیں مبہم ہوتی ہے ان کا حکم کے حوالے سے بہت سے لوگ نہیں جانتے۔پس جو شبہات سے بچتا رہے اس کا دین اور عزت محفوظ ہو گا"۔

---

[1] الحج:30/22

[2] مسلم، **الصحیح**، باب: حلال و حرام، ح:4101، ص:50/5

اس روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شبہات سے دور رہنا واجب تو نہیں لیکن اہل تصوف اور اہل تقوی ان تمام چیزوں سے پرہیز کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں جن میں یقین نہ ہو بلکہ اس کے حوالے سے شبہات ہو۔ تو سالک ان چیزوں کو چھوڑنا اپنے اوپر لازم قرار دیتا ہے۔ شریعت نے ہماری سماجی زندگی میں حلال اور حرام کی دو بیّن حدیں قائم کر دی ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری روزمرہ زندگی میں ان کے درمیان ایسے گوناگوں شبہات درپیش ہوتے ہیں کہ اگر کوئی ان میں پڑ جائے تو ارتکابِ حرام کا امکان ہوتا ہے۔ اس لیے سالک ہمیشہ ان شبہات سے بچ کر مقامِ ورع تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

زہد:۔

تصوف کی تعلیمات میں ''زہد'' سلوک کا تیسرا مقام ہے۔ اس کے معنی ہیں دنیا سے متعلق جملہ آرزوؤں سے دست بردار ہو جانا، مومن غیر مشروع دنیاوی لذتوں سے پرہیز کرتا ہے لیکن زاہد ان لذتوں سے بھی پرہیز کرتا ہے جو مشروع ہیں۔ اس کی تعلیم بھی حضور صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی زندگی سے ملتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی زہد کے حوالے سے متعدد آیات ملتی ہیں اور قرآن کریم میں حیاتِ دنیا کو'' متاعِ الغرور'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور دنیا سے حتی الامکان کم وابستگی رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اسی کا نام زہد ہے۔ احادیث کی کتب میں زہد کی اہمیت پر بہت سی حدیثیں ملتی ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں اس حوالے سے آیا ہے:

((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ، أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ))[1]۔

ترجمہ: دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو جیسے تم مسافر ہو یا عارضی طور پر کسی راستے پر چلنے والے ہو۔

اس سے بھی صاف طور پر ''زہد'' ثابت ہوتا ہے اسلام میں ''زہد'' کو اعتدال کے ساتھ اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ عیسائی راہبوں کی طرح ترکِ دنیا نہ کی جائے یعنی دنیا سے مکمل قطع تعلق رہنا راہبوں کا شیوہ ہے زاہدوں کا نہیں۔

فقر:

یہ سلوک کا چوتھا مقام ہے۔ اصطلاح تصوف میں اس سے مراد ہے کہ صوفی کا ہاتھ متاع دنیا سے خالی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی اس کی خواہش سے خالی ہو[2]۔

---

[1] بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب: الرقاق، ح: 6053، ص: 2358/5

[2] عطار، **تذکرۃ الاولیاء**، ص: 102

فقر انسان کے لیے ایک ایسا اعلیٰ مقام ہے جہاں وہ خدا کے سوا ہر چیز سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ مقام فقر تک پہنچنے کی تعلیم و سعی کے پس منظر میں یہ فکر کار فرما ہے کہ دنیا میں مال جس قدر کم ہو گا، قیامت کے دن حساب میں اسی قدر سہولت ہو گی۔ مال سے سالک پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس لیے مال کا فقدان ہی سالک کے لیے بہتر ہے۔

صبر:

صبر سلوک کا پانچواں مقام ہے۔ صبر وہ جذبہ ہے جس کے ذریعے سے انسان تنگی اور فراخی میں فرق نہ کرے اور دونوں حالتوں کو یکساں سمجھے اور دونوں حالتوں میں یکساں طرز فکر و عمل اختیار رکھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں صبر کو خاص اہمیت حاصل تھی اور انھوں نے اس کی خاص تعلیم دی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾[1]۔

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

صبر ہر انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ دینی فرائض کی ادائیگی اور معاصی کو ترک کرنا بھی صبر کے بغیر ممکن نہیں۔ سالک کا دل بسا اوقات کسی نہ کسی چیز میں مشغول رہتا ہے، جو حصولِ مقصد میں مانع ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ سالک صبر و تحمل کے ساتھ اپنے دل کو اپنے مقصد کی طرف مبذول کرے۔

ان مقاماتِ تصوف کے علاوہ اور بھی بہت سے مقامات ہیں، لیکن طوالت سے بچنے کی خاطر یہاں کچھ اہم مقامات کا ذکر کیا گیا جو اسلامی تعلیمات میں کافی اہمیت کے حامل تھے۔ ان مقاماتِ تصوف کے بعد ذیل میں مختصر انداز میں تصوف کے اہم ادوار کا ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] آل عمران: 200/3

دوراول: اسلامی تصوف پہلی صدی ہجری میں:

اسلامی تصوف کے تاریخی پس منظر کے حوالے سے امام قشیری اپنی کتاب ''الرسالۃ القشیریۃ'' میں یوں لکھتے ہیں:

''اللہ تم سب پر اپنی رحمت نازل کرے اور تم سب لوگ جانتے ہو کہ مسلمان بزرگ ہستیاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے وصال کے بعد بھی اپنے آپ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نسبت دیتی رہیں کسی اور کی مصاحبت کو اپنے لیے پسند نہیں کیا۔ کیونکہ ان بزرگوں کو معلوم تھا کہ انھیں صحابیِ رسول کہنا ہی سب سے بڑی فضیلت کی بات ہے اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہو سکتی ہے۔''[1]

اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کو نہیں دیکھا انہیں صحابہ کرام کی صحبت نصیب ہوئی انھیں تابعین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انھوں نے یہی نام اپنے لیے باعث برکت ورحمت جانا۔ اس کے بعد کچھ ایسے لوگ ہیں جنھیں تابعین کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی شرفیت حاصل ہوئی انھیں تبعِ تابعین کے لقب سے یہ لوگ ملقب ہوئے۔ صحابہ کرام، تابعین اور تبعِ تابعین کے ادوار گزرنے کے بعد لوگوں میں اختلافات ہونے لگے اور انہی لوگوں کے درمیان الگ الگ مراتب ومناصب پیدا ہو گئے۔ ان میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی زیادہ تر دلچسپی دینی امور میں تھی یہ لوگ عابد وزاہد کے القابات سے مشہور ہوئے۔ اور آہستہ آہستہ ان مراتب میں غیر اسلامی افکار نے جنم لیا اور ہر کوئی زاہد وعابد ہونے کا دعوی کرنے لگا۔ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو نفسانی خوہشات سے بہت ہی دور رکھا اور اپنی جانوں کو اللہ کے نام وقف کر دیا۔ دنیا کے رغبتوں اور آلائش سے اپنے دلوں کو محفوظ رکھا۔ ایسے لوگ دوسری صدی ہجری سے پہلے اہل تصوف کے نام مشہور ہو چکے تھے۔''[2]

---

[1] القشیری، **الرسالۃ القشریۃ**، ص: 43

[2] ایضاً ص: 20-21

امام قشیریؒ کی اس تصریح سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے:

تصوف کی تعلیمات رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اصحابِ کرام، تابعین اور تبعِ تابعین کے زمانے میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن اس 'حقیقت' کی کوئی خاص اصطلاح نہ تھی، دوسری صدی ہجری کے اواخر میں اس حقیقت کو تصوف کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس سے قبل اس نام کے پیدا ہونے کے تاریخی اسباب ظہور میں نہیں آئے تھے۔

دائرۃ المعارف میں مسلکِ تصوف کی بارے میں یہ معلومات ملتی ہیں:

''یہ مسلک ان بزرگوں نے اختیار کیا جو عقیدے کے طور پر اہل سنت والجماعت تھے اور اہل سنت کی اصطلاح ان مسلمانوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور آثارِ صحابہ کرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔''[1]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تصوف اسلامی کا ماخذ ومصدر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ حسنہ اور صحابہ کرام کے پاکیزہ اخلاق اور اعمال صالحہ ہیں۔ صحابہ کرام کی زندگانی سے اس کی تائید ہوئی ہیں جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی زہد و تقویٰ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ایک دفعہ آپ پیوند شدہ قمیص پہنے ہوئے تھے تو کسی نے اس پر سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دل خدا سے ڈرتا رہے اور اصحاب صفہ جس انداز سے زندگی بسر کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے پسند فرماتے تھے۔ ان کی دلجوئی کیا کرتے ان کے ساتھ نشست و برخاست کرتے۔ اس برگزیدہ گروہ نے مسلمانوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ صوفیائے کرام کے لیے اصحاب صفہ کا طریقِ زندگی اور اسلوبِ حیات پر کشش تھا[2]۔

خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں کے تہذیب و تمدن میں اخلاقی اور روحانی طور پر تبدیلی آنے لگی۔ تہذیبیں آپس میں ملیں اور دنیا کی رنگینیوں نے مسلم معاشرے کی روح کو مجروح کرنا شروع کیا تو ایک ایسے گروہ نے اپنا وجود کا جوہر دکھاتے ہوئے ایک نیا معیار زندگی پیش کیا۔ یہ لوگ سیدھی سادی زندگی گزارتے، دنیا کی طرف بہت کم رغبت رکھتے تھے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ انھوں نے خالقِ کائنات کی یاد میں مستغرق و منہمک رہتے ہوئے اپنی زندگیاں

---

[1] **دائرۃ المعارف الاسلامیۃ**، (لاہور: دانش گاہ پنجاب، 1968)، ص: 588/3

[2] الحلمی، محمد مصطفیٰ، **الحیاۃ الروحیۃ فی الاسلام**، (مصر: طبعۃ الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، 1948ء)، ص: 41-47

گزارنے کی عادت ڈالی۔اس وجہ سے یہ لوگ 'زہاداور عباد' کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ دوسری صدی ہجری کے نصف میں ابوہاشم کوفی (المتوفی 160) کو صوفی کے لقب سے پکارا جانے لگا۔اس گروہ نے اخلاقی اقدار پر اتنا زور دیا کہ بصرہ و کوفہ جہاں اموی بادشاہت کے نغمے گائے جاتے تھے وہاں پر تصوف کا اولین مرکز بنااور یہیں سے اسلامی تحریک کا آغاز کرتے ہوئے دنیا جہاں تک پھیلانے میں کامیاب ہوا۔

دوسرادور:اسلامی تصوف دوسری صدی ہجری تاچوتھی صدی ہجری

اسلامی تاریخ کا یہ دور جو کہ تین صدیوں پر محیط ہے، اس دور میں اسلامی تصوف کو بہت فروغ ملا۔ علمی، فکری، روحانی اور دینی اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل دور قرار پایا۔ علمی سطح پر اس دور میں تدوینِ حدیث کا اہم کام جو کلامِ الٰہی کے بعد نصِ قطعی کا درجہ رکھتی ہے۔ تکمیلی مدارج تک پہنچااور اسی دور میں فقہ اسلامی کے مختلف مکاتبِ فکر وجود میں آئے۔ اس عہد میں خالص اسلامی نظام حیات کو جتنا عروج حاصل ہوااتنا کسی اور دور میں نہیں ہوا۔اس بناءپر اس دور کو اگر تاریخِ تصوف کا'' عہد زریں'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

تاریخِ تصوف میں یہ دور دو نمایاں خصوصیات کا حامل سمجھا جاتا ہے:

اول: یہ کہ اس دور میں تصوف نے اپنی تکمیل اورارتقاء کے اہم مدارج طے کیے۔

دوم : یہ کہ اس دور کے یونانی فلاسفہ اور عقلیت پسندوں کے متشکیکانہ رویوں اور ان کے تباہ کن اثرات کو رد کیااور اس کے مقابلے میں محبتِ الٰہی اور وجدان ویقین سے حاصل ہونے والی کیفیات اور مثبت اثرات کو فروغ دیا۔

اس دور کے اہل تصوف کا کمال یہ تھا کہ یہ لوگ خدا کی عبادت دوزخ کے عذاب سے ڈر کر یا جنت کی لالچ کے لیے نہیں کرتے تھے، یہ لوگ اللہ کو عبادت کے لائق سمجھ کر اس کی عبادت کیا کرتے تھے۔اس منہج اور اصول کو تبع تابعین کے دور کی صوفیہ سیدہ رابعہ عدویہؒ نے خوب پروان چڑھایا۔ وہ بصرہ کی رہنے والی تھی اور بچپن ہی میں یتیم ہوگئی تھیں۔وہ بڑی عابدہ تھیں، ہمیشہ روزہ رکھا کرتی تھیں۔ اور اس کی اصل یہ تھی کہ عبادت و زہد میں معبود سے محبت کا حقیقی جذبہ کارفرماہو، خوف جہنم اور طمعِ جنت سے بے نیاز ہو کر خدا کو اس لیے یاد کیا جائے کہ وہ لائق عبادت اور حقیقی معبود ہے۔ رابعہ عدویہ کے حوالے سے مشہور مستشرق این میری شِمل لکھتی ہے:

"The first figure from the history of Sufism to be introduced into European literature was Rabia al Adawaiyya the greatest woman saint of the eighth century : her legned was brought to Europe by Joinville, the chancellor of Louis IX, in the late thirteenth century. Rabia's figure was used in a seventeenth century French treatise on pure love as a model of divine love."[1].

یورپی ادب میں جس شخصیت نے تصوف کو متعارف کرایا گیا وہ رابعہ العدویہ تھیں جو آٹھویں صدی کی عظیم ترین صوفیہ تھیں: ان کو تیرہویں صدی کے آخر میں لوئس IX کے چانسلر جوائن ویل نے یورپ لائیں تھیں۔ رابعہ کی شخصیت کو سترہویں صدی کے فرانسیسی مقالے میں خالص محبت کے نمونے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کے دور میں جہاں مسلمانوں کے لیے فرائض دینی کی انجام دہی کا مقام مسجد تھا، وہاں روزمرہ زندگی کے مسائل بھی مسجد ہی میں طے پاتے تھے۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ جب عام مسلمانوں سے صوفیاء کا گروہ الگ ہوا، تو انھوں نے روحانی تربیت کے لیے ایک الگ مقام کی ضرورت محسوس کی۔ اس ضرورت کے پیش نظر انھوں نے جو جگہ بنائی وہ خانقاہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ دوسری صدی ہجری کے نصف میں صوفیاء نے اپنی تعلیم و تربیت کی خاطر شام کے مقام "رملہ" میں ایک خانقاہ تعمیر کی جو کہ تصوف کی تاریخ میں یہ پہلی خانقاہ ہے[2]۔ کتاب کشف المحجوب اور تذکرۃ الاولیاء میں ایسے صوفیوں کی خصوصیت یوں بیان کی گئی ہیں۔

"ان عظیم ہستیوں پر "خشیتِ الٰہی" کا بڑا غلبہ تھا اس لیے یہ حضرات ہمیشہ لوگوں کو توبہ کی ترغیب دینے میں لگے رہتے تھے۔ توبہ اور استغفار کی یہ عادت ان کی پوری زندگی میں نمایاں نظر آتی تھی اور کافی لوگ ان عظیم ہستیوں کی ان عادات سے بہت متاثر ہوئے۔ حضرت رابعہ بصریؒ فرمایا کرتی تھیں: کہ "زبانی توبہ جھوٹوں کا کام ہے"[3]۔

اس دور کے مشہور قابل قدر صوفیائے کرام درج ذیل ہیں:

حسن بصریؒ، عبد اللہ ابن مبارکؒ، جنید بغدادی، ابراہیم بن ادہمؒ، فضیل بن عیاضؒ، سیدہ رابعہؒ، ذوالنون المصریؒ اور سفیان ثوریؒ معروف الکرخیؒ شامل ہیں۔

اس دور میں صوفیائے کرام نے حقیقت تصوف کو واضح کرنے کے لیے تحریر و تصنیف کا آغاز فرمایا۔ اس سلسلے میں جو تحریر کیا گیا وہ نہ صرف تاریخِ تصوف بلکہ پورے مسلمانوں کی علمی تاریخ میں انتہائی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ اس دور کی تصانیف میں ایسے معیار اور اصول قائم کر دیے گئے جو حقیقی اور غیر حقیقی تصوف کے درمیان ہمیشہ ایک خط امتیاز کی

---

[1] Schimmel, Annemarie, *Mystical Dimention of Islam*, 8.

[2] جامی، نورالدین محمد عبدالرحمٰن، **نفحات الانس**، (لاہور: اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز، 2002ء)، ص:54

[3] ہجویری، علی بن عثمان، **کشف المحجوب**، ص:82

حیثیت باقی رہیں گے،ان تصانیف کی اہمیت کا اندازہ ان حقائق سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ بعد میں آنے والے صوفیائے کرام ؒ کے قلم سے جو کتب ورسائل تحریر ہوئے ان میں دور ثانی کی تصانیف کے اصول ومبادی سے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا گیا ہے۔

اس دور کی معروف تصانیف درج ذیل ہیں:

1۔حکایات الاولیاز شیخ ابو محمد الخلائی (م297ھ) ۔

2۔الطبقات، شیخ ابو سعید ابن العربی (م 341ھ) ۔

3۔اللمع فی علم التصوف، شیخ ابو نصر السراج (م378ھ) ۔

4۔ قوت القلوب فی معاملۃ المحجوب، شیخ ابو طالب مکی (386ھ) ۔

5۔التعرف لمذھب اھل التصوف، شیخ ابو بکر الکلابازیؒ (390ھ) [1] ۔

ان شاہکار تصانیف نے اہل تصوف کے لیے ایک معیاری پیمانہ دیا کہ وہ ان تصانیف کو پڑھ کر تصوف کے حقیقی اور غیر حقیقی ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس دور کے بعد آنے والے تمام حضرات نے انہی تصانیف کو بنیاد بنا کر انہی کتب سے تصوف کی تعلیمات کو حاصل کیا۔

تیسرا دور: اسلامی تصوف پانچویں صدی ہجری تا آٹھویں صدی ہجری

تاریخ تصوف کا یہ تیسرا دور طویل ترین دور میں شمار ہوتا ہے۔اسلامی تاریخ میں اس دور کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس دور میں اسلامی تاریخ پر بہت گہرے اور دیرپا اثرات رونما ہوئے۔اس دور میں تصوف کو حد سے زیادہ شہرت ملی اس لیے اس دور کو تصوف کی عمومی مقبولیت کے اعتبار سے زریں دور شمار کیا جاتا ہے۔کیونکہ اس دور میں تصوف کے مشہور سلسلے وجود میں آئے اور ایسے عظیم ہستیاں امام غزالیؒ جیسے بھی اس دور کے ہیں جن کی تعلیمات کو تصوف کے میدان میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور تمام اکابرینِ صوفیاء ان کی عظمت کے معترف نظر آتے ہیں۔

اس دور میں صوفیائے کرام نے نظم ونثر کی صورت میں کئی کتب تالیف کیں جو اپنی گہری معنویت، جاذبیت اور فکر انگیزی کے اعتبار سے اہل علم کی توجہ کا محور بنیں اور عوام الناس میں مشہور ہوئیں۔

اس دور کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں:

1۔طبقات الصوفیہ، ابو عبد الرحمٰن السلمیٰ (م413ھ)۔

---

[1] لطیف اللہ، **تصوف اور سریت**، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1990ء)، ص:232

2۔ حلیۃ الاولیاء، ابو نعیم الاصفہانی (م430ھ)۔

3۔ کشف المحجوب، علی بن عثمان الہجویریؒ (م465ھ)۔

4۔ رسالۃ القشیریۃ، ابوالقاسم عبدالکریم القشیری (م468ھ)۔

5۔ منازل السائرین، خواجہ عبداللہ انصاری (م480ھ)۔

6۔ احیاء العلوم الدین، امام محمد غزالیؒ (م505ھ)۔

7۔ فتوح الغیب، محی الدین ابو محمد عبدلقادر الگیلانی (م561ھ)۔

8۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید عطار (م620ھ)۔

9۔ عوارف المعارف، شیخ شہاب الدین سہروردی (م632ھ)۔

10۔ فتوحات مکیۃ، شیخ محی الدین ابن عربی (م638ھ)[1]۔

اس دور میں اسلامی دنیا میں چند ایسے اصحاب وجود میں آئے جن کا کارنامہ تصوف کی عملی صورت کو علمی صورت میں پیش کرنا یا تصوف کے مشکل نظریات کی تفسیر اور تشریح کرنا تھا۔ اس سلسلے میں شیخ ابوالحسن ہجویریؒ (م1072ء) امام غزالیؒ (م1111ء)، شیخ محی الدین ابن عربی (1240ء) اور مولانا جلال الدین رومی (1273ء) کے کارنامے قابل ذکر ہیں۔ یہاں ان میں سے کچھ کی خدمات کا اجمالی طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

علی ہجویری:۔ (1009ء–1072ء)

آپ کا پورا نام شیخ سیّد ابوالحسن علی ہجویری ہے۔ کنیت ابوالحسن لیکن عوام وخواص سب میں ''گنج بخش'' یا ''داتا گنج بخش'' کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ 400 ہجری میں غزنی شہر سے متصل ایک بستی ہجویر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی سید عثمان جلابی ہجویری ہے۔ جلاب بھی غزنی سے متصل ایک دوسری بستی کا نام ہے جہاں سید عثمان رہتے تھے۔ علی ہجویری، حضرت زید کے واسطے سے امام حسن کی اولاد سے ہیں۔ [2]

---

[1] لطیف اللہ، **تصوف اور سریت**، ص:209

[2] لاہوری، غلام سرور، **خزینۃ الاصفیاء**، (لاہور: مکتبہ نبویہ، 1994ء)، ص:240

آپؒ بہت بڑے عالم اور صوفی تھے، آپؒ کو سیر وسیاحت کا بڑا شوق تھا۔ شام، بغداد، فارس، عراق، آذربائیجان وغیرہ کے سفر کر کے وہاں کے اولیائے عظام اور صوفیائے کرام سے کسب کمال حاصل کیا۔ صرف خراسان ہی میں وہ تین سو مشائخ سے ملے[1]۔ آخر میں اپنے مرشد شیخ ابوالفضل محمد بن الحسن السرخی کے حکم سے لاہور آئے اور زندگی کے خاتمے تک لاہور میں ہی رہے[2]۔

شیخ ہجویری کے تصوف کے سلسلے میں کافی علمی کارنامے ہیں، جن میں ''کشف المحجوب'' سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہر زمانہ میں بے مثل اور فارسی نثر میں تصوف کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں تصوف کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں صوفی کی اصلیت کے متعلق یہ بتاتا ہے کہ صوفی کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب بنالیتا ہے اور طبیعت کی آفتوں سے پاک وصاف ہو جاتا ہے اور حقیقت میں صوفی وہ ہے جس کا دل کدورت سے پاک اور صاف ہو[3]۔

شیخ ہجویری وہ عظیم بزرگ ہستی ہیں، جن کی بدولت برصغیر میں پہلی بار صحیح اسلامی تصوف نے رواج پایا۔ اور اسلامی تصوف کی تعلیمات کو اپنے قلم کے ذریعے پوری دنیا تک پھیلانے میں آپؒ کا بہت بڑا کردار ہے۔ اس لیے تصوف کے میدان میں آپؒ کی شخصیت خاص اہمیت کی حامل ہے۔

امام غزالیؒ: (450ھ- 505ھ)

امام غزالیؒ کا اصل نام محمد اور ابو حامد کنیت تھی جبکہ لقب زین الدین تھا۔ آپ کی ولادت 450ھ کو طوس میں ہوئی اور 14 جمادی الثانی 505ھ/19 دسمبر 1111ء کو بعمر 55 سال قمری (53 سال شمسی) بمقام طوس میں وفات پائی[4]۔

امام غزالیؒ بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ علمی دنیا میں دراصل ایک 'مجمع البحرین' تھے وہ بیک وقت ایک جلیل القدر فقیہ اور صوفی تھے۔ انھوں نے جہاں ایک طرف اپنی قوتِ ایمان اور خداداد صلاحیت سے فقہاء کو متاثر کیا وہاں

---

[1] عبدالرحمن، سید صباح الدین، **بزم صوفیہ**، (اعظم گڑھ: اسلامک ریسرچ سنٹر، 1949ء) ص: 5

[2] ایضاً، ص: 8

[3] ہجویری، **کشف المحجوب**، ص: 22

[4] الذھبی، ابوعبداللہ، شمس الدین، **سیر اعلام النبلاء**، (بیروت: بیت الافکار الدولیہ، 2009) ص: 134

دوسری طرف تصوف کے علمی پہلوؤں کوازسرنوتدوین وترتیب دے کرایک دلکش صورت میں پیش کیا۔اس سلسلے میں ان کی یہ خدمات بہت اہم ہیں۔

انھوں نے چونتیس سال کی عمر میں بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں چار سال تک صدرِ مدرس کے طور پر اپنا کردار ادا کیااور اسی اثنامیں اتفاقاان کی طبیعت علومِ ظاہری سے برگشتہ ہوگئی اور روحانی تشنگی کومٹانے کے لیے انھوں نے تصوف کی طرف اپنی توجہ مبذول کی[1]۔

تصوف کی راہ اپنانے کے لیے آپؒ نے درس وتدریس کے اس منصب کو ترک کر کے بغداد سے شام کارخ کیااور دمشق میں پہنچ کر مجاہدہ وریاضت میں مشغول ہوئے،ان کی سیر وسیاحت کا سلسلہ دس سال تک جاری رہا۔علم تصوف پر آپؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف'' احیاءالعلوم الدین'' عربی میں اور'' کیمیائے سعادت''فارسی میں ہے۔ان کی شخصیت عالمِ اسلام میں بڑی موثر ثابت ہوئی۔جو بھی اکابرین آپؒ سے ملنے آتے تھے وہ آپ کی عظیم شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پاتے۔

شیخ محی الدین ابن عربیؒ:(1165- 1240)

آپ اندلس کے شہر مرسیہ میں 27 رمضان المبارک 560ھ مطابق 1165ء عیسوی کوایک معزز عرب خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام "محمد بن علی بن محمد ابن العربی الطائی الحاتمی الاندلسی" تھا۔ 620ھ میں آپ نے دمشق کواپناوطن بنایا، جہاں کے حاکم الملک العادل نے آپ کو وہاں پر آکر رہنے کی دعوت دی تھی۔وہاں آپ نے 28 ربیع الآخر 638ھ مطابق ء1240 کو وفات پائی اور جبل قاسیون میں دفن کیے گئے،جو آج تک مرجع خواص وعوام ہے[2]۔

تاریخِ تصوفِ اسلام میں شیخ محی الدین ابن عربی بڑے عظیم المرتبت بزرگ گزرے ہیں،ان کو شیخ اکبر بھی کہا جاتا ہے۔آپؒ نے تیس سال تک اشبیلیہ میں حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1194ء میں تیونس منتقل ہوگئے جہاں انھوں نے تصوف سے خاص دلچسپی لی،آٹھ سال قیام کے بعد 1202ء میں وہاں سے مشرق کی سیاحت کو روانہ ہوئے اور کچھ مدت تک مکہ میں رہنے کے بعد عراق کا سفر اختیار کیا۔بالآخر انھوں نے دمشق میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔علم تصوف پر آپ کی کتاب ''فصوص الحکم''مشہور ہے۔

---

[1] نعمانی، شبلی، **الغزالی**، (لاہور: اسلامی کتب خانہ، 1913ء)، ص:12

[2] لاہوری، غلام سرور، **خزینۃ الاصفیاء**، ص:140

تصوف اسلام میں ''انسانِ کامل'' کا نظریہ بہت اہمیت کے حامل ہے۔ صوفیاء کا عقیدہ ہے کہ انسان کی روح ربانی ہے ،انسان ہی دنیائے آب و گل میں رہ کر مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعے سے ذاتِ خداوندی سے اتحاد و اتصال پیدا کر سکتا ہے۔ صوفیانہ اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ وہ مجاہدہ سے مکاشفہ تک پہنچ سکتا ہے، یہاں پہنچ کر انسان ''انسانِ کامل'' کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ دنیا میں خدا کا نائب اور دنیا کا محافظ ہوتا ہے۔ اس کے وجود سے دنیا میں خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے [1]۔

تاریخ تصوفِ اسلام میں انسان کامل کی اصطلاح کو سب سے پہلے ابن عربی نے اپنی کتاب ''فصوص الحکم'' میں استعمال کیا ہے اور بعد میں عبدالکریم الجیلی (م1429ء) نے اس پر مستقل بحث کی اور انسان کامل کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی۔

اس بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تصوفِ اسلامی تیرہویں صدی عیسوی میں ارتقائی مراحل طے کر چکا تھا۔ اس دور میں روحانی سلسلے وجود میں آئے۔ اس طرح اسلامی تصوف کی تاریخ ہر اعتبار سے مکمل ہو چکی تھی۔ حقیقت میں یہ سلسلے تصوف کی ارتقاء اور نشو و نما کی آخری منزلیں ہیں۔ بعد کے صدیوں میں تصوف کی تحریک زوال و انحطاط، اصلاح و تجدد کی حالتوں سے دوچار رہیں لیکن بنیادی طور پر اس میں کوئی عملی تبدیلی نہیں آئی۔ امام غزالیؒ وغیرہ کے افکار کے گرد تصوف کی ساری دنیا گردش کرتی رہی اور ان بزرگوں کی تصانیف کے حاشیوں اور خلاصوں سے باہر نہیں نکل سکی۔ غرض ہر اعتبار سے تصوف کی تحریک دور ثالث میں اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی۔

---

[1] نورالدین، ابوسعید، **اسلامی تصوف**، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 1995ء)، ص:135

فصل دوم: مختلف مذاہب میں تصوف کا تصور اور ارتقاء

موجودہ وقت میں دنیا کے جو بڑے مذاہب سمجھے جاتے ہیں وہ اسلام، ہندومت، عیسائیت، یہودیت اور بدھ مت ہیں۔ تمام ادیان عالم میں خدا کی عبادت اور ذکر واذکار کے طریقہ ہائے کار ایک دوسرے سے کہیں مماثلت رکھتے ہیں تو کہیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ عبادت وریاضت کا ایک طریقہ یا ایک شعبہ، تصوف کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ تصوف کے رجحانات ان تمام مذاہب میں پائے جاتے ہیں۔ تصوف کا طریقہ بھی ادیان عالم میں الگ الگ ہے جس کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے۔

تصوف کسی مذہب کا نام نہیں ہے۔ تصوف نام ہے ایک رویے کا، تصوف نام ہے ایک خاص فکر و نظر کا۔ تصوف بعض مقامات پر مذہب سے اختلاف بھی رکھتا ہے اور یہ اختلاف تصور خدا سے شروع ہوتا ہے۔ اہل مذاہب کے مطابق خدا دنیا ومافیہا سے ماوراء ہے۔ وہ اس کائنات کا مالک بھی ہے اور خالق بھی ہے مگر وہ اس سے علیحدہ ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ساری کائنات پر اس کا اختیار اور اس کا تصرف ہے لیکن اس کے وجود سے اس کائنات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ **اذا اراد شیئا ان یکون لہ کن فیکون**۔ وہ اپنے ارادے اور اپنی مرضی کا خود مالک ہے۔ لیکن صوفیوں کے مطابق خدا اس کائنات سے الگ نہیں ہے۔ بلکہ وہ کائنات کے اندر موجود ہے اور اس کی ذات ہر ہر ذرے میں سمائی ہوئی ہے۔

عالمی مذاہب میں تصوف کی بحث کے حوالے سے سب سے بڑا مسئلہ مقدس کتابوں کے اثبات کا ہے کہ مختلف مذاہب کی جو مقدس کتابیں پوری دنیا کے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے پاس موجود ہیں ان کی حقیقت کو کیوں کر تسلیم کیا جائے۔ ایک صوفی کا یہ تشخص ہے کہ وہ مذہب سے متعلق تمام آسمانی کتب کا اعتراف کرتا ہے اور اس کی تعلیمات کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کسی ایک مذہب کو ماننا یہ صوفی ہونے کی علامت نہیں ہے، بلکہ کسی بھی مذہب کا انکار کرنا غیر صوفی ہونے کی نشانی ہے۔ بہر کیف عالمی مذاہب میں ایسے بہت سے رجحانات ہے جو تصوف کی سطح پر آکر ایک ایسا نظام زندگی مرتب کرتے ہیں جہاں دوئی کے جھگڑے کی یکسر تکذیب ہوتی ہے۔ اس باب میں چند ایک مقدس کتابوں کے حوالے سے مختلف مذاہب کی تعلیمات کو پیش کیا جائے گا، جس سے عالمی مذاہب میں تصوف کے رجحانات کا علم حاصل ہو جائے گا کہ کس طرح تصوف کے علمی اور عملی کردار سے کئی ایک پیمانوں پر الگ الگ مذاہب کے ماننے والے ایک سطح پر نظر آتے ہیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ دنیا بھر کے مذاہب کو عام طور پر دو خانوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک سامی مذاہب اور دوسرا غیر سامی مذاہب۔ سامی مذاہب میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا شمار ہوتا ہے اور غیر سامی مذاہب میں ہندو دھرم، زرتشتیت، بدھ مت، جین مت اور سکھ مت وغیرہ شامل ہیں۔

یہاں اس فصل میں سامی مذاہب میں سے اسلام، یہودیت اور عیسائیت اور غیر سامی مذاہب میں سے ہندومت میں جو تصوف کی تعلیمات ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

دینِ اسلام میں تصوف کا تصور

دین اسلام میں ہر خشک و تر کے حوالے سے کہیں نہ کہیں مختلف انداز میں تعلیمات ملتی ہیں اور ان کے حوالے سے دینِ اسلام ہر طرح کی رہنمائی کرتا ہے۔اسلامی تعلیمات کے مختلف شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ تصوف کا شعبہ ہے۔ تصوف میں جن تعلیمات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے ان میں سے چند اہم تعلیمات یہ ہیں:۔

1۔اللہ تعالیٰ کی محبت

2۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی اطاعت

3۔تزکیہ نفس (اپنے نفس کو فضائلِ اخلاق سے آراستہ کرنا اور رذائلِ اخلاق سے پاک کرنا)

4۔برداشت اور رواداری

5۔خدمتِ خلق

اللہ تعالیٰ کی محبت:

صوفی حضرات اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیتے ہیں وہ عشقِ حقیقی ہے، کیوں کہ محبت و مؤدت ہی ایک ایسی چیز ہے جو عاشق کو اپنے معشوق کی فرمابرداری پر مجبور کرتی ہے اور اس کی نافرمانی سے روکتی ہے اور محب کے دل میں محبوب کی رضا کی خاطر ہر مصیبت و تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی قوت وصلاحیت پیدا کرتی ہے اور محبت ہی وہ چیز ہے جو محب کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ایسا عمل کرے جس سے محبوب راضی ہو اور ہر اس عمل و کردار سے باز رہے جس سے محبوب ناراض ہو، چنانچہ صوفی حضرات اگر زہد، تقویٰ، عبادت، ریاضت اور مجاہدے کرتے ہیں تو ان کا مقصد صرف اور صرف خدا کی رضا حاصل کرنا ہوتا ہے۔وہ جنت کی لالچ یا جہنم کے خوف سے خدا کی بندگی نہیں کرتے، چنانچہ حضرت رابعہ بصریہ اپنی ایک دعا میں فرماتی ہیں :

''خدایا! اگر میں تیری بندگی جنت کے لیے کرتی ہوں تو مجھے اس سے محروم رکھنا، اگر میں جہنم کے خوف سے تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھے اس میں جھونک دینا، لیکن اگر میں تیری بندگی تجھے پانے کے لیے کرتی ہوں تو مجھے اپنے آپ سے محروم نہ رکھنا''[1]۔

فراق و وصل چہ خواہی؟ رضائے دوست طلب کہ حیف باشد از و غیر ازیں تمنائے۔

'' فراق و وصل کیا ڈھونڈتا ہے؟ محبوب کی رضامندی ڈھونڈ، کہ محبوب سے محبوب کے سوا کی تمنا، افسوس کی بات ہے۔''[2]

شبلی تو یہاں تک فرماتے ہیں:

''**الصوفی لا یریٰ فی الدارین مع اللہ غیراللہ**''[3] ۔

''صوفی دونوں جہانوں میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کے علاوہ اور کسی چیز کو نہیں دیکھتا'' ۔

امام ربانی صوفی کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مقربین بارگاہ الٰہی (یعنی صوفی حضرات) اگر بہشت چاہتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ان کا مقصد نفس کی لذت ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ خدا کی رضا کی جگہ ہے، اگر وہ دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ اس میں رنج والم ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ خدا کے ناراضگی کی جگہ ہے، ورنہ ان کے لیے انعام اور رنج والم دونوں برابر ہیں۔ ان کا اصل مقصود رضائے الٰہی ہے''[4]۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی فرماتے ہیں:

''اے موتی جیسے انسان! اپنے اندر میں خدا کی محبت کا الاؤ جلادے، یہ راہ اختیار کرو تو آپ کا لین دین کام یاب ہو۔''[5]

یعنی خدا سے عشق کرنے والے اسے کبھی نہیں بھلاتے، کبھی عشق و محبت کی آہ بھرتے ہوئے ان کی روحیں پرواز ہو جائیں گی۔ اور یہی بات قرآن و سنت کی تعلیم بھی ہے:

---

[1] بیگ، مرزا قلیچ، **مقالات الاولیاء**، (شکارپور: سندھ پرنٹنگ پریس، نوشہری دروازہ، 1927)، ص:15

[2] کاندھلوی، محمد زکریا، **شریعت و طریقت کا تلازم**، (کراچی: مکتبۃ الشیخ، 1993)، ص102

[3] ہجویری، **کشف المحجوب**، ص:76

[4] سرہندی، مجدد الف ثانی شیخ احمد، **مکتوبات امام ربانی**، (کراچی: دارالاشاعت، 2006)، مکتوب 35، ص: 1/ 191

[5] بھٹائی، شاہ عبداللطیف: **شاہ جو رسال**، (دہلی: روشنی پبلیکیشن کنڈیارو، 1997)، ص:114

چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾[1] ۔

" حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں"۔

ایک اور آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴾[2]۔

ترجمہ:" اے نبیؐ، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا "[3]۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ، وَأَبْغَضَ لِلَّهِ، وَأَعْطَى لِلَّهِ، وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الإِيمَانَ)) [4]۔

" جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کے لیے محبت کرے اور اللہ ہی کے لیے بغض رکھے اور اللہ ہی کے لیے دے اور اللہ کی خاطر منع کرے تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا "۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے:

((رب اجعل حبك أحب إلي من نفسي و أهلي و من الماء البارد))[5]۔

" اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ تیری محبت اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال سے اور پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو"۔

---

[1] البقرہ:165

[2] التوبہ:24

[3] نجفی، **الکوثر فی تفسیر القران**، (اسلام آباد: البلاغ القرآن، 2004ء) ص:455/3

[4] الطبرانی، أبوالقاسم سلیمان بن أحمد، **المعجم الکبیر**، (بیروت: دار إحیاء التراث العربي، 1983م)، ح:7737، ص:208/8

[5] النیسابوري، محمد بن عبد اللہ أبو عبد اللہ، **المستدرک علی الصحیحین**، (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 1990)، ح:3621، ص:299/3

اور صوفی حضرات اسی محبت کو اپنے دل میں اور اپنے مریدوں کے دل میں پیدا کرنے کے لیے مجاہدے اور ریاضت کرتے اور کراتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی اطاعت:

صوفی حضرات کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی اطاعت اور آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کیے بغیر معرفتِ خداوندی اور نجات کا حصول ناممکن ہے۔ چناں چہ امام ربانی شیخ احمد سرہندی ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''اس نعمتِ عظمیٰ یعنی معرفت خداوندی تک پہنچنا سید الاولین والآخرین کی اتباع سے وابستہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی اتباع کیے بغیر فلاح و نجات ناممکن ہے۔

''محال است سعدی کہ راہ صفا تواں رفت جز بر پئے مصطفٰے''

''اے سعدی! یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی پیروی کیے بغیر خدائی معرفت اور تصفیہ قلب حاصل ہو سکے'' [1]۔

سعدیؒ صوفیاء کے مستند ترجمان ہیں، تمام صوفیائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دنیوی واخروی تمام سعادات دامنِ مصطفٰی صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم سے وابستہ ہیں، اس کے بغیر سب ہیچ ہے۔

یہی بات قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اس طرح ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [2]۔

ترجمہ اے نبیؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ، "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے''۔

اس لیے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی اطاعت خود خدا کی اطاعت ہے، چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] سرہندی، **مکتوبات**، ص: 279

[2] آل عمران: 31

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا﴾ [1]

ترجمہ: " جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا، تو بہر حال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے"۔

کیوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ بولتے ہیں وہ وحی الٰہی ہی ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ [2]

ترجمہ: " وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اُس پر نازل کی جاتی ہے"۔

اس لیے ایک اور آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ [3]

ترجمہ: " جو کچھ رسولؐ تمھیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ"۔

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت نہ کرے اس وقت تک اللہ کی اطاعت کا کوئی فائدہ نہیں اللہ کی اطاعت کے لیے اس کے رسول کی اطاعت شرط ہے۔ اور انسان کے ایمان کی اکملیت کی بھی شرط یہی ہے کہ تم ہر چیز کو اللہ کے رسول پر قربان کرے۔ تب جا کر انسان کا ایمان مکمل ہوتا ہے۔

جیسا کہ اس بارے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

((لایوٴمن احدکم حتٰی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین)) [4]

اس حدیثِ مبارکہ کے مطابق انسان کے لیے مومن ہونے کی شرط یہ ہے کہ دنیا کے عزیز ترین رشتہ جیسا کہ والدین اور اس کی اولاد ہوتی ہیں ان سے بھی زیادہ رسول اللہ کی ذات کو محبوب بنائیں، پھر وہ مومن ہو سکتا ہے۔

ایک اور جگہ پر انسان کو مومن ہونے کے لیے دوسری شرط کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] النساء:80

[2] النجم:4،3

[3] الحشر:7

[4] مسلم ،الصحیح،ح:169 ص:۴۱

((لایؤمن أحدکم حتٰی یکون ھواہ تبعَ الما جئت بہ))[1]۔

اس میں فرمایا کہ انسان کی خوہشات رسولِ اکرم کے اصولوں کے مطابق ہو تب وہ انسان مومن ہو سکتا ہے۔

مشہور مستشرق این میری شِمل تصوف کے سلاسل کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> Muhammad is the first link in the spiritual chain of Sufism, and his ascension through the heavens into the divine presence , to which the first lines of sura 17 allude, became the prototype of the mystic's spiritual ascension into the inrimate presence of God[2].

محمد صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم تصوف کے روحانی سلسلے کی پہلی کڑی ہیں، اور آسمانوں کے ذریعے اس کا معراج الٰہی کی طرف جانا، جس کی طرف سورہ اسراء کی پہلی سطریں اشارہ کرتی ہیں، خدا کی ہر جگہ موجودگی کا تصور کرنا صوفی روحانی عروج پر پہنچنے کا نمونہ ہے۔

ان تمام اقتباسات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ صوفی حضرات اور مشائخِ عظام اور محققین کے نزدیک تصوف کا حاصل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کا اتباعِ کامل، اس کے واسطے حق تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو یہی تصوف کی روح اور اس کی غایت ہے۔ اگر یہ کسی کو حاصل ہو جائے تو گویا اس نے تصوف کی روح کو پالیا۔ پس معرفتِ خدا حاصل کرنے کے لیے معرفتِ رسول صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی ضرورت ہے۔ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی معرفت نہ ہو جائے اس وقت تک اللہ کی معرفت ممکن نہیں۔ کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی ذات شارح ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے توسط سے اللہ کی معرفت ہوتی ہے۔

تزکیۂ نفس

اصلاحِ نفس یا تزکیہ نفس جسے دین کا جزو بتایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا جزو ہے جو باقی اجزاء کے لیے تکمیل وتزئین کا کام کرتا ہے۔ اگر نفس کی اصلاح نہ ہو اور وہ اپنی بہیمیت پر قائم رہے، اور شہوت وخواہشات میں ملوث رہے تو ہو سکتا ہے کہ دین کے باقی اجزاء وجود میں آتے رہیں مگر نفس کی وجہ سے وہ مکدر ہوتے رہیں گے۔ جیسا کہ اس بارے میں قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] نووي، یحییٰ بن شرف، **شرح الأربعین النوویة**، (لبنان: دار الکتب العلمیة،2015)، ح، 40۔

[2] Shemmel, Annemarie, *Mystical Dimention of Islam*, 32.

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾[1]۔

ترجمہ: یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔اور نامراد ہوا وہ جس نے اُس کو دبا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ نفس انسانی وجود کا وہ جزو ہے جس میں بگڑنے اور فاسد ہونے کے امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے گویا اسے مطلقاً'' امارہ بالسوء'' برائی کا حکم دینے والا قرار دیا۔ لیکن یہی نفس تزکیہ اور طہارت قبول کر لینے کے بعد نفس مطمئنہ بن جاتا ہے، جس میں دخولِ جنت کی ندا سننے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔

مشہور صوفی بزرگ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی فرماتے ہیں:

''انسان کا نفس دنیا میں موجود اس تناور درخت کی مانند ہے جس پر شیطان اپنی خواہشات کے ذریعے سے اس کا بیج ڈالا ہے۔اس کے نتیجے میں وہ ایک تناور درخت بن گئی۔اگر انسان روزمرہ مصروفیات سے وقت نکال کر تقویٰ الٰہی، شب و روز کی عبادات اور حقیقی عشقِ خدا کی مدد سے اس شجر کو بار بار ہلاتا رہے تو ایک نہ ایک دن وہ درخت سوکھ جائے گی۔اسی طرح انسان کا نفس بھی ان قوت سے تربیت پا سکتا ہے''[2]۔

صوفی حضرات جتنے مجاہدے، ریاضات اور عبادات کرتے ہیں یا ان کا اپنے معتقدین کو درس دیتے ہیں ان کا اصل مقصد نفس کا تزکیہ اور تطہیر ہے۔

چناں چہ شاہ عبداللطیف بھٹائی فرماتے ہیں:

''اے انسان اس دنیا میں زیادہ پڑھ لکھ کر زندگی گزارنے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک اس کی تزکیہ نفس کی تربیت نہ ہو جائے، اگر کوئی اپنے آپ کو نفس کی غلاظتوں سے پاک وصاف کریں اور صرف ایک حرف پڑھ لے تو سمجھیں یہی انسان کامیاب ہے۔اس علم کا کچھ فائدہ نہیں جہاں صرف تعلیم ہو مگر تربیت نہ سے عاری ہو''[3]۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن وسنت میں کیا فرمایا گیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعا نقل کی ہے:

---

[1] الشمس:10،9

[2] اعظمی ،اعجاز احمد، **تصوف! ایک تعارف**،(خیر آباد: مکتبہ ضیاء الکتب،، 2008ء)، ص:47

[3] Shah Abdul Latif, *Shah Jo Risalo*, tr., Elas Kazi (Larkana: IT Scholars group, n.d), 9

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾[1]۔

ترجمہ:'' اے رب، ان لوگوں میں خود انہیں کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو، جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے''۔

ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے ظاہر ہے کہ کسی نبی کی بعثت، تلاوت آیات اور تعلیم کتاب وحکمت کا اصل مقصد لوگوں کے اندر کا تزکیہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴾[2]۔

ترجمہ:'' وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود اُنہی میں سے اٹھایا، جو اُنہیں اُس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اِس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے''۔

اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو خدائی آیات سنانا، ان کا تزکیہ کرنا اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دینا ہے۔ لیکن غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی بعثت کا اصل مقصد تزکیہ ہی تھا، کیوں کہ تلاوتِ آیات و تعلیمِ کتاب وحکمت کا اصل مقصد تو تزکیہ ہی ہے، کیوں کہ اگر تعلیم سے تزکیہ قلب و تطہیرِ نفس حاصل نہ ہو تو تعلیم و تعلم اور درس وتدریس ایک بے ثمر درخت کی مانند قرار پائیں گے۔

---

[1] البقرہ:129

[2] الجمعہ:2

ایک اور مقام پر ارشاد باری ہے:

﴿ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾ [1] ۔

ترجمہ: ''یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔ اور نامراد ہوا وہ جس نے اُس کو دبا دیا''۔

تصوف انسان کو جن اخلاقی رزائل سے اپنے اندر کو پاک کرنے کی تعلیم دیتا ہے وہ یہ ہیں: بدنیتی، ناشکری، جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، بددیانتی، غیبت اور چغلی، بہتان، بدگوئی و بدگمانی، خوشامد و چاپلوسی، بخل و حرص، ظلم، فخر، ریا و نمود و حرام خوری وغیرہ۔ جن چیزوں سے اپنے اندر کو سنوارنے کی تعلیم دیتا ہے، وہ یہ ہیں:

اخلاصِ نیت، ورع و تقویٰ، دیانت و امانت، عفت و عصمت، رحم و کرم، عدل و انصاف، عفو و درگذر، حلم و بردباری، تواضع و خاکساری، سخاوت و ایثار، خوش کلامی و خودداری، استقامت و استغنا وغیرہ [2]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن و سنت کا بیشتر حصہ ان ہی اخلاقی رزائل سے بچنے اور اخلاقِ حسنہ سے اپنے آپ کو مزین کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

نماز کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے۔

﴿ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾[3]۔

ترجمہ: '' یقیناً نماز فحش اور بُرے کاموں سے روکتی ہے'' ۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ بِأَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ))[4]۔

ترجمہ: ''جو بُرے قول اور بُرے عمل کو چھوڑے بغیر بھوکے پیاسے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو ایسے بھوکے پیاسے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

اس فصل میں اسلامی تصوف کا تصور اور اس کا آغاز وارتقاء کے حوالے سے تفصیلا بحث کی گئی۔ علامہ شبلی سے ایک

---

[1] الشمس: 9،10

[2] الطوسی، **اللمع فی علم التصوف**، (لاہور: تصوف فاونڈیشن،، 2000ء)، ص: 105

[3] سورۃ العنکبوت: 45

[4] ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسی، **الجامع**، (الریاض: دارالسلام للنشر والتوزیع،، 1999ء) باب: ماجاء فی التشدید فی لاغیبۃ للصائم، ح: 641 ، ص: 141/3

بار پوچھا گیا کہ صوفیوں کا نام صوفی کیوں ہے؟ انھیں اس نام سے پکارا کیوں جاتا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ نام جو صوفیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس کے اصل، مصادر اور مشتقات میں بہت سے اختلافات ہیں۔اور یہ اختلافات آج تک جاری ہیں۔ یہ بحث جس قدر مختلف فیہ ہے اسی قدر دلچسپ بھی ہے کہ تصوف کی اصل اور اس کے مشتقات کیا ہیں۔ اس سلسلے میں علماء اور صوفیائے کرام کے مختلف اقوال اور نظریات فصل میں تحریر کیے گئے ہیں۔ دین اسلام ہی سب سے قدیم اور ازلی وابدی دین ہے۔ چنانچہ تصوف کا آغاز بھی سب سے پہلے اسلام سے ہوتا ہے۔ دوسری صدی ہجری سے اس کی ابتداء ہوتی ہے اور ایک تحریک کی شکل اختیار کی ہے۔ جب دنیا عیش و عشرت میں غرق ہو جاتی ہے اور دین سے رو گردانی کرنے لگتی ہے تو ایسے وقت میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو صرف اللہ کی عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ تصوف کی ابتدا بھی ایسے ہی حالات میں ہوئی جب اسلامی معاشرہ عیش و عشرت اور دنیاوی لذتوں میں تقریباً غرق ہو چکا تھا۔ چونکہ یہ عیش و عشرت کا رد عمل تھا اس لیے یہ ظاہر ہے تصوف کی بنیاد خالص زہد و تقوی پر تھی۔ اس لیے شروع شروع میں بدعات اور فسق و فجور اس میں شامل نہیں تھے۔ لیکن چوتھی صدی تک آتے آتے اس میں غیر اسلامی عوامل واطوار بھی داخل ہونے لگے اور یونانی فلسفہ، ہندومت اور عیسائیت و نصاری کے فلاسفہ نے قصداً اور عمداً اس تصوف کو رواج دیا جو آج تک مروج ہے۔ اسلامی تصوف کئی افکار و نظریات پر مشتمل ہے، اس کے کچھ خاص عقائد اور نظریات ہیں جن کو فصل میں تفصیلا بیان کیا جاچکا ہے۔

تصوف پر یہودیت کے افکار و نظریات:

تاریخی لحاظ سے یہودیت دنیا کے بڑے مذاہب میں سے ایک ہے جس کی نسبت پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کی جاتی ہے۔ یہ ابراہیمی مذاہب میں سے ایک بڑا توحیدی مذہب ہے جس کے پیروکار بنی اسرائیل کہلاتے ہیں۔

ابتدائی زمانوں سے ہی روحانی تجربات یہودیت کا خاص جزو رہے ہیں۔ توریت میں بہت سی ایسی کہانیاں بیان ہوئیں ہیں جو روحانی تجربات پر مبنی ہیں۔ انبیاء پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے وہ مصدقہ خواب دیکھتے اور حیران کن مکاشفوں کا ان پر نزول ہوتا ہے۔ تالمود روح کے وجود اور جسد خاکی سے اس کے تعلق پر بحث کرتی ہے۔ یہودی روایات کے مطابق جب توریت بنی اسرائیل پر اتری تو اس وقت تمام ارواح وجود رکھتی تھیں۔ اس وقت سب ارواح نے خدا اور اسرائیل کے درمیان ہونے والے میثاق سے اتفاق کیا۔ روحانی تجربات کی یہ روایت آگے چل کر قبالے کی شکل اختیار کر گئی۔ جس نے یہودی نسل کو موسوی شریعت کی سنگلاخ معروضیت سے گریز کا راستہ فراہم کیا۔ تاہم ملحوظ خاطر رہے کہ 'قبالائی نظریہ معرفت' کے بارے میں یہودی مذہب میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض یہودی اس کو بہت زیادہ سنجیدگی سے

لیتے ہیں۔ ہسیدی یہودیت اس کی اہم مثال ہے۔ ہسیدی یہودیت جس کا بانی 'اسرائیل بن ایلی آزر' ہے، کی ابتداء مشرقی یورپ میں ہوئی[1]۔

یہودی تصوف نے " قبالہ "(Kabbalah) کے نام سے شہرت پائی۔ یونانیوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے یہاں بھی تصوف کی روایات زمانہ قدیم سے ملتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد بابل کی اسیری کے زمانے میں جب قوم اپنے ضعف وانحطاط کی انتہاء پر پہنچ چکی تھی اور یہی زمانہ تصوف کے عروج کا زمانہ تھا۔ان میں بھی کچھ کچھ باطنیت کے آثار نمودار ہونے شروع ہوگئے تھے۔ لیکن حقیقی تصوف ان میں اس کے بعد جاکر آیا جب ان کے مذہبی پیشواؤں نے اسکندریہ میں یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا[2]۔

قبالائی تفکر کی بہت ساری خصوصیات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں عرفان کا تعلق فرد کی ذاتی جدوجہد، مجاہدات، عبادات اور استغراق سے نہیں۔ عام عرفانی سلسلوں میں اصل بصیرت کا انحصار الہامی صحیفوں پر نہیں ہوتا۔ عارف بالعموم اپنا راستہ خود تلاش کرتا ہے۔ قبالہ روایت کے حامی اس کے برعکس راہ حکمت کو توریت میں تلاش کرتے ہیں، جو کوہ سیناپر حضرت موسیٰ کو تفویض کی گئی۔ اس حکمت کو بڑی احتیاط اور گہرے تفکر سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس روایت میں عارف کی تلاش وجستجو انفرادی راستے پر جدوجہد کا ثمر نہیں ہوتی۔ اس میں عارف کی حیثیت اس محنتی اور محتاط طالب علم کی سی ہوتی ہے جو روایتی صحیفوں سے سری اور روحانی متن تک پہنچنے کی کوشش میں سرگرداں ہو۔ مختلف زمانوں، خصوصاً قرون وسطیٰ کے دوران قبالہ کے ماہرین، صحائف میں سے نئی روحانی تعلیمات کی دریافت کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔

یہودیوں کے ہاں قبالہ کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف رائے موجود ہے۔ ایک طرف تو وہ لوگ ہیں، جو اس کو روایتی صحائف کا قابل قدر تجزیہ کہہ کر عبرانی مذہب کا لازمی جز قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف یہ لوگ جو اسے محض حاشیے پر موجود علم کی حیثیت دیتے ہیں۔ بعض راسخ العقیدہ تو اس کو ارتداد کی ایک صورت قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کے متنوع نظریات کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ اہم وجہ قبالائی فکر کا اپنا تنوع اور افتراق ہے۔

قبالہ کے ماہرین نے مختلف ادوار میں مابعد الطبیعات، علم نجوم، جادوٹونہ اور سفلی عملیات کو موضوع بحث بنایا اور اس طرح کائنات کی ایک غیر روایتی تشریح پیش کی جو نہ صرف سامی مذاہب کی بنیاد کے الٹ تھی بلکہ عقل وفہم کے اصولوں سے متصادم بھی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ قبالائی فکر کو چند بنیادی اصولوں میں ڈھالنے کی کوششوں کو ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں نظریات کا تنوع بہت زیادہ ہے۔ بعض کو قبولیت مل جاتی ہے۔ اور بعض لازمی طور پر مسترد ہو جاتے

[1]Steven T.Katz,*Comparative Mysticism*, (University Press, Oxford,2013)،29-
[2]Ed ward J .*The Great Religions of the Modern World*, (USA: Princeton University press, 1946),234.

ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کسی نظام فکر میں اس قدر متفرق نظریات ہوں تو معتقدین انفرادی طور پر اس میں وہ کچھ دیکھتے ہیں، جس کو دیکھنا وہ پسند کرتے ہیں۔ اس سے اختلاف رائے کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے [1]۔

یہ بات طے ہے کہ قبالے کا تصورِ خدا وہی ہے جو راسخ العقیدہ یہودیت میں رائج ہے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کائنات کے اندر موجود ہر چیز خدائے واحد کی تخلیق ہے تاہم قبالائی فکر کے مطابق ذات حق کی دو ممیز جہات ہیں۔ پہلی جہت اس کی قدرت مطلق ہے۔ جس کا ادراک جوہری طور پر ایک عام انسان کے بس میں نہیں۔ خدا کی یہ ماورائی جہت اس کی برتر طاقت اور اختیار مطلق کی آئینہ دار ہے۔ یہ جہت اس قدر وسعت کی حامل ہے۔ کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ذات حق کی دوسری جہت صیفیراٹ کی جہت ہے۔ [2] جسے اس کی ظاہری صورت کہا جا سکتا ہے۔ اس کی یہ صورت انسان اور دنیا کے درمیان واسطے کا کام دیتی ہے اس تعقل کے جز کو طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ خدا کے دس ظاہری پہلو ہیں جن کو تخلیق کے عمل میں بروئے کار لایا گیا ہے ذات حق ان کو انسان کی ظاہری اور باطنی دونوں سطحوں پر انسان کی فلاح اور ترقی کے لیے استعمال میں لاتی ہے۔ خدا اس وقت رحمت و برکت کو روک لیتا ہے۔ جب انسان غیر اخلاقی راستے پر چلنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی انسانی معاشرہ اخلاقی تنزل کا شکار ہو جاتا ہے۔ تو خدا سیفیراٹ کی بعض انعامی برکات کو واپس لے لیتا ہے اور معاملات زندگی میں انسان کو استعانت سے محروم کر دیتا ہے۔

توریت

توریت کو قبالہ کا نقطہ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ توریت میں عبرانی بائیل کی پانچ کتابیں ہیں اور اس لیے اسے پینٹاٹیوخ کا نام دیا گیا۔ ان پانچ کتابوں کا نام: باب پیدائش، خروج، احبار، گنتی اور استثنا۔ عام خیال یہی ہے کہ توریت سینائی کے پہاڑ پر حضرت موسیٰؑ کو مرحمت ہوئی۔ وہ اسے لے کر بنی اسرائیل کی طرف آئے۔ توریت کے ماخذ کی یہ تسلیم شدہ کہانی ہے۔ یہودی عبادت گاہوں اور یہودی فکریات میں اس کو مرکزی عقیدے کی حیثیت حاصل ہے۔ بالخصوص جب اسے ہاتھ سے لکھی ہوئی دستاویزات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

توریت کے سلسلے میں مسئلہ یہ تھا کہ یہ یہودی قوم کے رسم و رواج اور زندگی کرنے کی ہدایات کے بارے میں جامع نہیں تھیں۔ اس کے لیے تشریح کا ایک سلسلہ چل پڑا، جس کو زبانی قانون کا نام دیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ زبانی قانون کو تحریری شکل دی جائے۔ یہ کام دوسری صدی عیسوی میں مکمل ہوا اور اسے مشنہ کا

[1]Yochai,Rav Shimon Bar,*The Zohar*, (USA:the kabbalah Centre International Inc,2003),35.
[2]Leaman, Oliver. *Jewish Thought: An Introduction* , (London: Routledge,2006),93.

نام دیا گیا۔ پھر اس میں تشریح و تجزیے کا وہ کام جو بابل اور یروشلم میں قبل ازاں ہو چکا تھا شامل کر لیا گیا۔ یہ مجموعہ تالمود کہلایا۔ [1]

چونکہ یہودی روایت کی عارفانہ تحریروں اور افکار کا زیادہ حصہ توریت سے شروع ہوتا ہے اس لیے قبالے پر زیادہ تر کام جوہری طور پر توریت پر تبصروں کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ ان تبصروں کی کلیات کو "زوہار" کا نام دیا جاتا ہے۔

زوہار:

یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب " زوہار/زھار[2] " ہے[3]۔ کتابِ زوہار میں ہے کہ تورات کی روح در حقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے، بشرطیکہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز جان سکیں اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے میں لگ جائے[4]۔

زوہار کسی ایک کتاب کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی کتابیں شامل ہیں۔ کچھ آرامی زبان میں تحریر شدہ اور کچھ عبرانی میں۔ اس مجموعے کا مرکزی حصہ توریت کی پانچ کتابوں کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ اس میں انسانی روح کی نوعیت، خدا کی ذات اور تخلیقی عمل پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ حصوں میں خیر و شر کے معاملات پر گفتگو بھی ملتی ہے۔

یہ سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ زوہار کس کی تصنیف ہے لگتا ہے کہ یہ کتاب سب سے پہلے اسپین میں قرون وسطیٰ کے دوران لکھی گئی لیکن اس انداز میں لکھی گئی ہے کہ معلوم ہو کہ یہ بہت پہلے کی تصنیف ہے جو انبیاء اور مفکرین نے دوسری صدی کے لگ بھگ پایہ تکمیل کو پہنچائی۔ "زوہار" کی زبان نہایت پیچیدہ ہے۔ موسیٰ آف لیون نے اس دعوے کے ساتھ شائع کیا کہ اس کو ازمنہ قدیم کے عارفوں نے تحریر کیا تھا[5]۔

راسخ العقیدہ یہودیت میں زوہار کو اہم کتاب مانا گیا ہے۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ بہت ابتدائی دور میں لکھی گئی تھی اور یہ کہ خود لیون کی یہ تحریر ہر گز نہیں لیکن اس دعوے کو مسترد کرنے والے بھی بہت ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں شامل تحریریں پہلے زبانی روایت کا حصہ تھیں۔ لیون نے ان کو تحریری شکل دی۔ بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے بھی نظر آتے ہیں کہ اس کام کی تکمیل میں لیون کے علاوہ کچھ اور عارفین بھی یقیناً شامل تھے۔

---

[1] .Rosen, J. *Understanding Judaism*, (USA: Dunedin academy press ltd.2003),51.

[2] زوہار یا زوھر جس کا معنی شاندار اور چمکدار کے ہیں۔ زوھر بنیادی طور پر صوفیانہ یہودیت کی ایک قسم ہے جسے عام طور پر قبالہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ تورات کی تفسیر، تشریحات روحانی، یہودی صوفیانہ تحقیق و ترتیب، علم تکوین اور علم النفس (نفسیات) برائے صوفیائے یہودیت کی کتابوں کا مجموعہ ہے۔

[3] روبینہ ترین ، **تصوف**، (ملتان: بیکن بکس، 2001ء)، ص: 24

[4] پرویز، غلام احمد، **تصوف کی حقیقت**، (لاہور: ادارہ طلوع اسلام، 1981ء)، ص: 27

[5] خان، محمد ایاز، **اناجیل اربعہ کے اہم مضامین کا تحقیقی جائزہ**، (مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی، بہاوالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان: 2000ء) ص: 375

زوہار کی الٰہیات کا مرکزی نقطہ خدا کا تعقل ہے جو خاصا پیچیدہ اور کثیر الجہات ہے۔اس میں دو متضاد جہات کا اجتماع نظر آتا ہے۔ خدا بیک وقت مذکر ہے اور مونث بھی۔ یہ تضاد راسخ العقیدہ یہودیت کے سیدھے سادھے تصور خدا سے متصادم ہے۔اس کے علاوہ زوہار میں دنیا کی حقیقت کے دو ابعاد ہیں: ظاہری اور باطنی ابعاد۔ تجربی دنیا کا باطنی پہلو عارفین یہودیت کے پوشیدہ و سری دنیا کی تفہیم کی راہ سمجھاتا ہے۔ زوہار کے بہت سے حصے بائبل کی آیات کے تجزیہ پر مشتمل ہیں۔ لیکن یہ تجزیے اس قدر مشکل اور بے ترتیب انداز میں پیش کئے گئے ہیں کہ کتاب کے نظام کی تحسین وافہام ناممکن ہو جاتا ہے۔ زوہار میں ذاتی روحانی تجربے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ جو راسخ العقیدہ یہودی نظام عبادات کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اس میں عبادت کی ذاتی حیثیت پر زور دیا ہے تاکہ عارف انفرادی طور پر خدا کو جان سکے۔

زوہار میں کونیاتی موضوعات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ بطور مثال، اس میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ کس طرح صیفیراٹ (صفات، اعداد مقدس) کا خدا سے صدور ہوا اور کس طرح کائنات کی تخلیق میں اس کو بروئے کار لایا گیا۔ صیفیراٹ کے ذریعے ہی یہودی سماجی زندگی کی نوعیت، اس کی ساخت، کائنات اور اخلاقیات کا تعین ممکن ہوا۔ صیفیراٹ کی حیثیت یہودیت اور خدا کے درمیان ایک واسطے کی ہے۔ خدا نے سفیراٹ کے ذریعے ہی کائنات تشکیل دی۔ زوہار کے ذریعے ہی خدا کی روحانی قوت و قدرت کا نزول انسانوں پر ہوتا ہے۔ جب تک انسان اخلاقی اور روحانی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور جب تک انسان یہودیت کے اصولوں کے مطابق کردار ادا کرتا رہتا ہے اس روحانی قوت کا بہاؤ چلتا جاتا ہے۔اس کے الٹ جب یہودی قوم غیر اخلاقی انداز میں عملی زندگی گزارنا شروع کر دیتی ہے تو اس روحانی قوت کا بہاؤ گھٹنے لگتا ہے۔

دس صیفیراٹ[1] کا نظریہ (Sefirot/ Sephiroth)

قبالہ میں دس صیفیراٹ (صفات و جہات حق تعالیٰ) کا ذکر آیا ہے۔ قبالہ کے مطابق تخلیق کے عمل میں خدا کی لامتناہی روشنی کا درمیانی مراحل کے ذریعے اشراق ہوا تاکہ لامتناہی سے متناہی کو تخلیق کیا جا سکے۔ خدا زوہار کے مطابق قبل از تخلیق عالم اپنی ذات میں ہیئت، لامنتہیٰ اور نامعلوم تھا۔ یعنی معلومات کے دائرے سے باہر تھا۔ وہ مکمل طور پر پوشیدہ تھا کہ جس تک انسانی فہم کی رسائی ناممکن تھی۔ اس کی یہ حالت عین صوف کی حالت تھی[2]۔

ابتداء میں خدا بے ہئیت اور مکمل خلا تھا۔ اس نے چاہا کہ جانا جائے پس اس نے دس صیفیراٹ کو ذریعہ بنایا۔ یہ خدا اور انسان کے درمیان تخلیق کے دس مراحل دس صیفیرات کہلائے۔ دس اصدار، دس لوہی جمالات، دس الوہی قوتوں کا

---

[1] یہودی تصوف میں صیفیراٹ سے مراد وہ 10 تصورات، طاقتیں یا مراحل ہیں جن کے ذریعے خالق کو پہچانا جاتا ہے یہودیت میں یہ ایک خاص نظریہ ہے۔

[2].W.T.Stace, *The Teachings of Mystics*, (New York: Mentor Books,1960), 223.

نظریہ قبالہ کی داخلی حکمت کا آئینہ دار ہے۔ بعض اوقات دس کی بجائے انھیں گیارہ بھی قرار دیا گیا۔ یہ اس لیے ہے کہ کیٹر اور دآت کو ایک ہی صیفیراہ میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ ایک ہی قوت کی دو مختلف جہات ہیں۔ کیٹر، جو روح کا مافوق شعور ہے، شعوری عمل کے دوران خود کو منکشف کرتا ہے اور خود کو دآت میں ڈھال لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کیٹر اور دآت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ لاشعور کا ہے اور دوسرا رخ شعور کا۔ دس صیفیرات کی گنتی میں اگر ایک کو شمار کیا جائے تو دوسرے کو عام طور پر شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ اس لیے در حقیقت صیفیرات دس ہی ہیں لیکن گیارہ نام ہیں۔ پھر یہ بھی کہ دس صیفیرات کو مختلف اشکال میں گیارہ صیفیراٹ پیش کیا جاتا ہے۔ جن کو فوری طور پر ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ سب نور ازلی کی ہی مختلف جہات ہیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ہر صیفیراٹ کا تعلق انسانی جسم کے مختلف اجزاء (Organ) سے ہے۔ انسانی جسم صیفیراٹی ڈھانچے کی اناٹومی کے مطابق ہے۔

صیفیراٹ کا باہمی تعلق مربوط کرنے والے روابطی ذرائع سے ممکن ہوتا ہے۔ جن سے الوہی طاقت تمام مخلوقات تک پہنچتی ہے۔ ان روابط سے قیاس کیا جاتا ہے کہ مختلف صیفیراٹ کے اپنے جھرمٹ ہیں اور ایک جھرمٹ کا ہر یونٹ اپنے مخوص صیفیراٹ کی مشترکہ خصوصیات کو پیش کرتا ہے۔ اس طرح صیفیراٹ تین تین گروہوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پہلا گروہ ذہن کی صورت ہے۔ دوسرا گروہ قلب کی داخلی جذبی قوتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کسی چیز پر کام کرنے سے پہلے کی کیفیت کا ترجمان ہے اسے ٹفریٹ کا نام دیتے ہیں۔ تیسرا کا گروپ خود عملی کی صورت میں رونما ہوتا ہے یعنی یہ کرداری خصوصیات کا مجموعہ ہے اسے یساڈ لکھا گیا ہے۔ یہ بھی جذبات کی ہی صورتیں ہیں، جو صرف کردار میں ہی ظاہر ہوتی ہیں۔ آخری نکتہ میلیچٹ کو اس آخری گروپ کا ضمیمہ قرار دیا گیا ہے۔ اسے بعض اوقات آزاد اکائی کی حیثیت بھی دی جاتی ہے، جو قبل قوتوں کی تحصیل کرتی ہے آپ یوں سمجھ لیجے کہ میلیچٹ روح کے تمام تجربے کا ماحصل ہے[1]۔

ایک تسلسل کی صورت میں صیفیراٹ تخلیق کے مختلف مراحل کی نشاندہی کرتی ہیں جن کے ذریعے خدا نے اپنی لا متناہی ذات کے مرکز سے ہستی کی متنوع دنیاؤں کو نزولی انداز میں پیدا کیا۔ کوئی بھی صیفیراٹ ایک مشترکہ وجودی گروپ یا ایک واحد مابعد الطبعیت ڈھانچے کے اجزائے ترکیبی کو تشکیل دیتا ہے، جس کے آثار تمام سطحوں اور تخلیق کی تمام جہات کے اندر شناخت کیے جا سکتے ہیں۔ ہر صیفیراٹ کے خالص عملی ڈھانچے کے عقب میں خفیہ محرکاتی قوت موجود ہے جس کو زیادہ انداز میں اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کا روح کی کسی متعلقہ روحانی نفسیاتی قوت سے موازنہ کی جائے۔

---

[1] آفاقی ، اقبال ،**روایاتِ عرفان و تصوف**،(لاہور: صریر پبلیکیشنز ، 2020)،ص:44

پروفیسر اسٹیس [1] نے صیفیراٹ سے قبل کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ابتداء میں ہئیت اور تمثیل کا وجود نہیں تھا۔ اس لیے یہ ممنوع ہے کہ اسے اس حالت میں تعقل کا حصہ بنانے کی کوشش کی جائے کہ جس حالت میں وہ تخلیق عالم سے قبل تھا۔ اسے کسی بھی تشبیہ، استعارے، صورت اور تمثیل کے توسط سے پیش کرنا بہر حال ممنوع ہے۔ حتیٰ کہ اسے کسی قسم کے لفظوں سے بھی پکارا نہیں جا سکتا۔ اس کا مقدس نام بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی حرف، کوئی نشان اس کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ اس لیے لازم ہے کہ اسے تشبیہ و تمثیل کے ہر انداز سے بالا رکھا جائے۔ جو چیز بھی تشبیہ اور تمثیل کے دائرے میں آتی ہے۔ اس کی منتہی تعقل میں تجسیم ہوتی ہے۔

لیکن جب اس نے مافوق انسان کی تخلیق کی اس کے لیے بگھی بنائی اور اس پر وہ تشریف فرما ہونے کے لیے اترا کہ یہودا کے مقدس نام سے جانا جائے اپنی صفات سے پہچانا جائے اور وہ ان صفات میں متمکن ہوا۔ اس طرح اس کے ادراک کی دنیوی سطح وقوع پذیر ہوئی۔ اس نے خود کو مختلف ناموں سے معروف کیا۔ ایل، ایلوہیم، شیدائی، ضی واوٹ اور یہودا۔ یہ سب اس کے نام ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک انسانوں کے درمیان علامتوں کی صورت میں تھے اور اس کی صفات کے آئینہ دار۔ یہ واضح کیا گیا کہ دنیا انصاف اور رحم و کرم پر کھڑی ہے۔ ہر چیز کا فیصلہ انسان کے اعمال پر منحصر ہو گا۔ اگر "مقدس" کی عظمت کا روشن ہالہ تمام مخلوقات پر نہ پڑتا تو کسی صاحب حکمت و دانش کے لیے بھی یہ ناممکن ہوتا کہ اسے پہچان سکے۔ وہ حسب سابق نامعلوم ہی رہتا۔ یہ لفظ نہ کہے جا سکتے کہ پوری زمین اس کی شان سے لبریز ہے [2]۔

برا ہو اس شخص کا، جس نے خدا کو کسی ایک صفت سے پہچانا، خواہ وہ صفت خدا کی اپنی ہی کیوں نہ ہو۔ انسانی صفت و ہیئت کی تو کوئی حیثیت نہیں..... جس کی بنیاد مٹی اور دھول میں ہے۔ [3] اور جس کی مخلوقات ناتواں اور نحیف ہیں۔ جلدی ہی فنا ہو جاتی ہیں اور فراموش کر دی جاتی ہیں۔ ربائی سمئن نے بائبل کا حوالہ اس طرح دیا ہے۔ "تمھارا آقا و مالک یعنی خداوند جلا دینے والی آگ ہے [4]۔ پھر فرمایا گیا لیکن تم، جو خداوند اخدا سے جڑے ہوئے۔ تم زندہ ہو، تم میں سے ہر ایک آج بھی زندہ ہے [5]۔

---

[1] ایسٹس ایک امریکی اسکالر ہیں جو بطور صحافی اور مورخ مشہور ہیں۔

[2] بائبل، :یسعیاہ: 6:3

[3] بائبل: ایوب، 4:19

[4] بائبل، یوحنا، 4:24

[5] بائبل، اِستِثنا، 18: 18

مفسرین پہلے ہی ان دو متون کی عدم مطابقت کی نشاندہی کر چکے ہیں۔ ربائی سمئن کہتا ہے کہ میں اس کی وضاحت اس طرح کرتا ہوں۔

حواریوں نے اس کی تصدیق کی ہے کہ ایک ایسی آگ کا وجود ہے جو باقی سب قسم کی آگوں سے افضل ہے جو دوسری ہر شے کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اگر ہم اس سلسلہ تفکر جاری رکھیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو خداوند خدا کی مقدس یکتائیت کا راز جاننا چاہتا ہے اس کو جلتے ہوئے کوئلے یا جلتی ہوئی شمع پر غور کرنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ آگ کے جلنے کے لیے کوئی ایسا مواد ہونا چاہیے، جس سے شعلہ اٹھے۔ اس شعلے سے دو طرح کی روشنی کا خروج ہوتا ہے۔ ایک روشنی سفید اور چمک دار ہوتی ہے۔ اور دوسری روشنی کالی، یا نیلے رنگ کی ہوتی ہے ان دونوں میں سے سفید شعلہ اعلیٰ درجے کا ہے۔ یہ شعلہ ہلے بغیر اوپر اٹھتا ہے۔ اس کے نیچے نیلی یا سیاہ رنگ کی روشنی ہوتی ہے، جو سفید روشنی کو سہارا دیتی ہے۔ دونوں آپس میں متصل ہیں۔ سفید شعلہ تاریک شعلے کے تخت پر متمکن ہوتا ہے۔ اس طرح نیلگوں یا سیاہ شعلہ بھی اپنے سے نیچے کی آگ کا شاخسانہ ہوتا ہے جو اسے طاقت مہیا کرتی ہے اور اوپر کی سفید روشنی سے منسلک رکھتی ہے۔ کبھی کبھی یہ نیلی یا سیاہ روشنی سرخ بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے اوپر سفید روشنی ویسی کی ویسی رہتی ہے۔ نچلی روشنی جو کبھی نیلگوں اور کبھی سرخ ہوتی ہے کا کام سفید روشنی کو نیچے جلتے ہوئے مادی مواد سے منسلک رکھنا ہے کہ جس سے وہ جڑی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ روشن رہتی ہے۔ نچلی آگ (نیلی اور سیاہ) تباہی اور موت کا ذریعہ ہے جو چیز بھی اس کے قریب آتی ہے جلا ڈالتی ہے تاہم اوپر کی سفید روشنی جلاتی ہے نہ تباہ کرتی ہے نہ ہی وہ کبھی تبدیل ہوتی ہے۔

اس لیے موسیٰ نے فرمایا: "اے بندے تیرا خدا جلا دینے والی آگ ہے"۔ وہ آگ جو ہر اس چیز کو جلا دیتی ہے جو اس کے نیچے ہے۔ اس وجہ سے اس نے "تیرا خدا" کہا۔ ہمارا خدا نہیں۔ موسیٰ۔۔۔ خود تو سماوی نور کی فضا میں کھڑا تھا جو جلاتا ہے۔ نہ تباہ کرتا ہے[1]۔

وہ مزید کہتا ہے کہ یہ صرف اسرائیل ہی ہے جو نیلگوں روشنی کرتا ہے تاکہ سفید روشنی سے خود کو منسلک رکھ سکے۔ اسرائیل جو نیچے سے نیلی روشنی سے جڑا ہوا ہے۔ اگرچہ یہ کالی یا نیلی روشنی کی فطرت میں ہے کہ یہ ہر اس چیز کو تباہ کر دیتی ہے جو اس کے نیچے ہوتی ہے اس کے باوجود بنی اسرائیل اس سے منسلک رہ کر بھی تباہ نہیں ہوتے۔ اس لیے کہا گیا ہے "تم جو اپنے خداوند سے منسلک ہو تم میں سے ہر ایک آج بھی زندہ ہے" تمھارا خدا ہمارا خدا نہیں۔ مراد یہ کہ اس کالے یا نیلے شعلے کے نزدیک نیچے سے جو چیز بھی آتی ہے فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن تم تمام تر قرب کے باوجود زندہ سلامت ہو۔

---

[1] بائبل، :استثنا،4: 24

سفید روشنی کے اوپر ایک اور روشنی ہے جس کا ادراک کیا جا سکتا ہے اور جو سفید روشنی کو محیط ہے یہ روشنی علوی جوہر کی علامت ہے۔ اٹھتا ہوا شعلہ حکمت الہیٰ کے رموز کی نشان دہی کرتا ہے۔

کتاب زوہار (Zohar) میں مظاہر کو دو طرح کے عناصر پر مشتمل قرار دیا گیا ہے۔ اوّل خارجی، دوم باطنی۔ تجربی دنیا کی باطنی جہت عارفین کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ یہودیت کے اندر موجود دوسری دنیا کے اسرار سمجھنے میں مدد دے۔ زوہار کے بہت سے حصے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے توریت کی سورتوں کے تجزیے پر مشتمل ہیں۔ یہ تجزیے اس قدر پیچیدہ ہیں کہ کتاب میں کسی مجموعی ترتیب کی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ زوہار ذاتی وروحانی تجربے کو عبادات اور دعاؤں میں اہم ترین سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک خدا کے قریب تر ہونے کا یہی طریقہ ہے۔ اجتماعی عبادات کی حیثیت رسوم کی ادائیگی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ زوہار کا نظریہ ہے کہ خدا کی ذات سے برآمد ہونے والی روحانی طاقت انسانوں کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ جب تک انسان اخلاقی اور روحانی طور پر مضبوط کردار کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کردار یہودی اصولیات کے تابع رہتا ہے خدا کی رحمت اور طاقت کا ان پر نزول ہوتا رہتا ہے۔ اعمال کے حسن میں افزونی سے رحمت کا نزول بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس انسان اگر بداعمالیوں پر اتر آئے تو نزول رحمت کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔

یہودیوں کے یہاں ظاہری رسوم کی پابندی پر زور دیا گیا ہے۔ یونانی اثرات کے تحت یہودی مذہب میں جس تصوف نے جنم لیا۔ اس کا بہترین نمائندہ 'حکیم فیلو' ہے۔ حکیم فیلو کو یہودی تصوف کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس نے نے مذہب اور فلسفہ میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ورثہ اسرائیل کے مطابق عہد عتیق میں صوفیانہ خیال موجود نہ تھے لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں ہے اس لیے کہ عہد عتیق کی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کوئی مذہب اور عقیدہ انسان کی داخلی واردات اور متصوفانہ کیفیات سے تہی نہیں رہا عہد عتیق کے نوشتوں میں انبیاء اسرائیل کی ایسی داخلی واردات کا ذکر موجود ہے جن کی بنیاد پر یہودیوں کے یہاں تصوف کی روایت قائم ہو چکی[1]۔

مسلمان صوفیاء اور حکماء بلخصوص حلاج، ابن عربی اور غزالی حکیم فیلو سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس طرح ہریکلیٹس (ق م 475 Heraclitus۔583) کے نظریات بقول کورن فولڈ یہ ہے:

"Ancient Greek naturalists had a mystical reaction against materialism"[2]

" قدیم یونانی فطرتی فلسفیوں کی مادیت کے خلاف ایک صوفیانہ ردِ عمل تھے"[3]۔

---

[1] Bevan, Edwyn Robert, *The legacy of Israel*, (London: Oxford University,1927), 47.
[2] Lywosmour, *The Encyclopedia of World Religions*,(Oxford Press,1990),220.
[3] Ibid,134.

اس نے خارجیت کے مقابلے میں داخلیت پر زور دیااور نفس کے اندر ڈوب کر حقیقت کو پانے کا درس دیا یہودی صوفیاء نے اپنے اپنے حلقے اور سلسلے قائم کر رکھے تھے جہاں مخصوص لوگوں کو خفیہ طور پر تصوف کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن یہودی تصوف نے اخلاقی اقدار کی ترویج میں کوئی حصہ نہ لیااس لیے کہ اس کا مرکز انسان کبھی نہ رہا یہ تصوف زیادہ تر خدا کی ذات تک محدود رہا۔ انسان اور کائنات اس کے موضوع میں شامل نہ تھے۔

تورات کی شریعت ہر بنی اسرائیل کے لیے کھلی تھی لیکن تورات کے باطنی معانی صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ کتاب مشناہ میں ہے کہ: کتاب پیدائش کے باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دی جانی چاہیے اس کی سخت ممانعت ہے اور کتاب حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ہر کسی آدمی کو نہیں دینی چاہیے تاوقتیکہ اس نے مقامِ ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تورات کے اصل معانی کی تعلیم اس کے الفاظ سے نہیں مل سکتے۔ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ایک اور طریقہ ہے جو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ عبرانی زبان کے حروفِ ابجد میں عجیب و غریب تاثیر ہے اور انھیں خاص خاص طریقوں سے اکٹھا کرنے اور دہرانے سے تورات کے الفاظ کے باطنی معانی معلوم ہو جاتے ہیں[1]۔

ان حروف اور اعداد کا باطنی علم علمِ حقیقی ہے اور اس سے انسان پر اسرار و رموزِ کائنات اور تورات کے حقیقی مفہوم کی راہیں کھلتی ہیں۔ جس پر یہ راہیں کھلتی ہیں اس سے عجیب و غریب کرامات صادر ہونے لگ جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کے ''ربانی صوفیوں'' کی شعبدہ بازیوں کے عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ مثلا: یہ کہ وہ سبت کی شام کو رموزِ کائنات کے حل کرنے میں مصروف ہوتے، بھوک لگتی تو ایک تین سالہ بچھڑا نمودار ہو جاتا جسے وہ کھا جاتے وغیرہ۔

ان کے یہ ارباب تصوف اپنے ہاں کی الہامی کتابوں کی تاویلات اپنے ذاتی مکاشفات سے کرتے اور خوبوں کی تعبیر سے زندگی کے مسائل حل کرتے اور آنے والے واقعات کی خبریں دیتے ہیں۔ جب عیسائیت کا ظہور ہوا تو یہ تصوف یہودیوں میں عام تھا۔

عیسائیت میں تصوف کا تصور:

مذاہب میں عیسائیت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ موجودہ دور میں سیاسی و معاشی طور پر سب سے زیادہ مستحکم مذہب نظر آتا ہے۔ دنیا کی تیس فیصد آبادی اس مذہب سے تعلق رکھتی ہے اس اعتبار سے یہ مذاہب بلحاظ آبادی دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ یہودیت اور اسلام کی طرح یہ بھی در حقیقت ابراہیمی مذاہب ہی کی ایک شاخ ہے۔ جس کے

[1]Lywosmour, *The Encyclopedia of World Religions*, 227.

ماننے والے عیسائی اور مسیحی کہلاتے ہیں۔ عیسائیت کی ابتداء اس وقت ہوئی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تیس سال کی عمر میں نبوت ملی۔ عیسائی مذہب کے ماننے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اپنے آپ کو منسوب کر کے خود کو عیسائی کہتے ہیں۔

قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اللہ کا قرب، اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے جو تعلیمات حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بیان کی تھیں ان میں عیسائیوں نے تحریف کر دی۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اللہ عزوجل نے ہر پیغمبر کو دوسرے پیغمبروں کے مقاصد اور اہداف کو بچانے اور ان کی پرچار کرنے کے لیے مبعوث فرمایا ہے بعد میں ان کے پیروکاران کی تعلیمات کو اپنی منشا و مرضی کے مطابق تبدیل کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت عیسی علیہ السلام کا ایک مشہور خطبہ ہے:

خطبہ دیتے ہوئے حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا:

> "یہ نہ سمجھو کہ میں اگلے پیغمبروں یا ان کے بنائے ہوئے قوانین کو توڑنے آیا ہوں۔ میں تو اس کے حقیقی مقصد و منشاء کو پورا کرنے آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان قوانین کے ایک ایک حرف اور ایک ایک شوشے پر عمل ہو۔ خدا کی رحمت ہو ان پر جو تحمل و بردباری سے کام لیتے ہیں۔ وہی خدا کے رحم کے مستحق ہیں۔ خدا کی رحمت ہو ان پر جو امن و صلح کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہی خدا کے محبوب بندے ہیں۔ خدا کی رحمت ہو ان پر جو ظلم و ستم سہتے ہیں ۔ وہی خدائی حکومت کے اصلی حق دار ہیں۔"[1]۔

مندرجہ بالا عبارت سے واضح ہے کہ عیسائیت کی ابتدائی تعلیمات میں کوئی غلط عقائد اور رسوم کارفرما نہیں تھے لیکن بعد میں ان کی تعلیمات میں کافی رد و بدل ہوئے، لوگوں نے اپنے من کے مطابق اس کی تعلیمات میں تبدیلی لائی اس طرح ان کی تعلیمات حضرت عیسی علیہ السلام کی تعلیمات سے یکسر مختلف ہونے لگی۔ اس فصل میں دینِ عیسائیت میں جو تصوف کا تصور ہے اس کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

عیسائیت میں تصوف کی تعلیمات:

عیسائیت میں تصوف کی بنیاد بابلی اور مصری تہذیب کی وجہ سے ہے۔ عیسائیت کا ابتدائی دور در حقیقت تصوف ہی کا دور تھا۔ بعد میں عیسائی صوفیاء نے یوحنا کی انجیل کے صوفیانہ تصورات کو اپنایا۔ عیسائی تصوف کی تاریخ میں پہلی اور اہم شخصیت

---

[1] بائبل: مرقس: 21:54

کلیمنٹ Clement(ھ216-150) نے ایمان اور روحانیت پر زور دیا۔دوسرا اہم عیسائی صوفی آگسٹائن(354ء-430ء) جس کی اہم کتاب(Confessions)ہے،اپنے عہد کی مذہبی زندگی کی بہترین ترجمانی کرتی ہے[1]۔

صوفیائے کرام کے مطابق کائنات کے تمام حادثات، قوانین فطرت اورانسانی ارادہ کی بجائے دیوتاؤں کے فیصلہ کا نتیجہ ہیں۔ یہ دیومالائی فیصلے باطنی اسرار سمجھے جاتے ہیں۔ مسیحی سریت کے بطون میں بہت سے ایسے عومل ہیں جو دوسرے مذاہب کے عرفانی تصورات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر عباداتی مشقوں اور خود انکاریت کے حوالے سے ان میں اشتراک عمل پایا جاتا ہے۔ عباداتی مشقوں اور خود انکاریت کو راہِ سلوک میں اہم سمجھا جاتا ہے۔ان کے بغیر خدا تک رسائی نا ممکن ہے۔تاہم مسیحیت کا خاص پہلو یہ ہے کہ اس کی حقیقی سمت کا تعین حیات مسیح سے ہوتا ہے۔ خاص طور پر مسیح کا انسانیت کے لیے مصلوب ہونے کا واقعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ مسیحی عرفان کی جڑیں عہد نامہ جدید اور مسیح کی دنیوی حیات کے دوران اپنے مشن اور زمین پر تقدیر کے لیے جدوجہد سے بر آمد ہوئی ہیں۔

عیسائیت میں راہِ تصوف یا عرفان کی مختلف تعلیمات اور منازل معین ہیں۔ان تعلیمات اور منازل پر عمل پیرا ہونے سے انسان تصوف اور عرفان کی منازل طے کر سکتے ہیں۔ان اہم تعلیمات اور منازل میں سے کچھ درج ذیل ہیں:۔

نفس کی تربیت :

نفس کی تربیت کے دوران بہت سی سرگرمیوں میں حصہ لیا جاتا ہے۔ بہت سی ایسی سرگرمیاں ہیں جو دوسری عرفانی روایات میں بھی معروف ہیں۔ خواہشات نفس انسان کو دنیا و آخرت میں تباہ کر دیتی ہیں اسی لیے تمام مذاہب میں خواہش نفس پر قابو رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔اسی طرح دین عیسائیت میں بھی بہت تاکید ہے کہ خواہش نفس کے پیچھے نہ چلے بلکہ نفس کو اپنے کنٹرول میں رکھے۔اس حوالے سے حضرت عیسی علیہ السلام سے منسوب ہے:

> ''جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی تو وہ دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ پس اگر تیری داہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے کیونکہ تیرے لیے یہی چیز بہتر ہے کہ تیرے اعضاء میں سے ایک جاتا رہا اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے''[2]۔

عبادت اور توبہ کی تلقین:

عبادت اور توبہ یقیناً ایک ایسا کلیدی عمل ہے۔عبادات اور توبہ کے طریقے معین ہیں۔ان کی ایک ترتیب اور شکل ہوتی ہے۔ کسی مذہبی روایت کے مطابق عبادت اور توبہ کے لیے دن کے اوقات مقرر کیے جاتے ہیں۔ اوقات کے مطابق

---

[1] ترین، روبینہ، **تصوف**، ص:26

[2] انجیل متی:5: 27-29

عبادت اور توبہ کی عادت بنانا عارفانہ تربیت کا حصہ ہے۔ دین مسیح میں تعلیماتِ تصوف میں سے ایک یہ ہے کہ یہاں توبہ پر زور دیا جاتا ہے۔

حضرت عیسی علیہ السلام نے توبہ اور استغفار کرنے کی بہت زیادہ تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

''بنی نوعِ انسان اپنے سے سرزد ہوئے گناہوں اور لغزشوں کو اللہ کے بارگاہ میں استغفار کر کے ان کو مٹا سکتا ہے''[1]۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر نبی نے انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کا نسخہ کیمیا توبہ ہی بتایا ہے۔ توبہ سے خدا تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔ توبہ سے جنت حاصل ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا:

''آسمان کی بادشاہت قریب پہنچ گئی ہے لہٰذا توبہ و استغفار کو اپنا شیوہ بناؤ''[2]۔

ایک اور جگہ حضرت مسیح فرماتے ہیں:

''جب گڈریا کو کافی عرصے بعد گمشدہ بھیڑ مل جائے تو اس کے لیے خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ اسی طرح خداوند اپنے اس بندے سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو گناہ کرنے کے بعد اس پر شرمندہ ہو کر اس کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے۔ اور ننانوے سچ بولنے والا ہو جنھیں توبہ کی حاجت نہیں اور ایک توبہ کرنے والا ہو تو، خدا ننانوے کی نسبت اس ایک سے زیادہ خوش ہوتا ہے''[3]۔

رہبانیت اور ریاضت:

رہبانیت وہ نظریہ ہے جس کے مطابق انسانی جسم شر کا منبع اور اس کی روح پاک اور مقدس ہے۔ اس نظریے کی رو سے انسان اپنی جسمانی ضروریات اور خواہشات کو زیادہ سے زیادہ کچل کر روحانیت کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ سکتا ہے، رہبانیت کا تصور عیسائیت کے علاوہ قدیم زمانے کے بیشتر مذاہب مثلاً ہندومت اور بدھ مت میں بھی ملتا ہے، جبکہ اسلام اس کو ناپسند کرتا ہے۔[4]

حضرت عیسی علیہ السلام کے بعد دو سو سال تک عیسائیت رہبانیت سے ناآشنا تھی مگر اس کی پسندیدگی شروع ہی سے ان کے اندر پائی جاتی تھی۔ مسیحی علماء نے اس کا طریقہ کار اور فلسفہ ہندو جوگیوں اور بدھ مذہب کے بھگشوؤں، قدیم مصری فقراء، ایران کے مانویوں اور افلاطون اور فلاطینوس کے پیروکار اشراقیوں سے اخذ کیا اور اسی کو قربِ الٰہی اور تزکیہ

---

[1] دیدات، شیخ احمد، **یہودیت، عیسائیت اور اسلام**، (لاہور: عبداللہ اکیڈمی، 2010ء)، ص:162

[2] انجیل متی:4:17

[3] انجیل لوقا:15: 17

[4] نائیک، عبدالکریم ذاکر، **مذاہب عالم میں خدا کا تصور**، (لاہور: دارالنوادر، 2006)ص:119

نفس کا ذریعہ سمجھا۔ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک مسیحیت کے بزرگ ترین پیشوار ہبانیت کے زبردست علمبردار تھے۔ تاہم اس کا آغاز مصر سے ہوا۔ سینٹ اینتھونی پہلا مسیحی راہب قرار دیا جاتا ہے اسی نے پہلی مرتبہ خانقاہیں تعمیر کیں اور اس کے بنیادی قواعد تحریر کیے اس کے بعد مصر میں ہر جگہ خانقاہیں نظر آنے لگیں۔ پھر یہ نظام شام، فلسطین، افریقہ اور یورپ میں پھیلتا گیا۔ عیسائی راہب اپنے جسم کو سخت اذیتیں دے کر ریاضتیں کرتے تھے۔ زندگی کی آسائشوں سے گریز کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور کھانا صرف بنیادی ضرورت کے لیے کھایا جاتا تھا۔ لباس تصنع سے پاک اور سادہ ہوتا تھا اس دوران سالک زیادہ سے زیادہ خیرات دے کر بے یار و مددگار کی مدد کرتے تھے۔ ایسے کاموں سے ان کے عقیدے کے مطابق ان کے اندر روحانی طاقت آجاتی تھی۔

مسیحی مذہب دراصل رہبانیت کا مذہب ہے اس میں انسان کی تمدنی زندگی کے لیے کوئی دستور العمل، شریعت اور قوانین وضوابط نہیں ہیں۔ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا مسیحیت کا مقصد ہے اور اس کے لیے انسان کو دنیوی ساز وسامان سے مکمل اجتناب کیا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ مسیحیت کا اصول یہ ہے کہ انسان ایک وقت میں دین و دنیا میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ آسمانی بادشاہت کا دروازہ اس وقت کھل سکتا ہے جب وہ مسیحی دینی تعلیم حاصل کرے[1]۔

عیسائی تعلیمات کی رو سے قرب خداوندی درکار ہے تو شادی سے پرہیز، مال و دولت سے دوری اختیار کرنا، دنیا سے قطع تعلق کرنا، بھوکا پیاسا رہنا، برہنہ رہنا، دنیا کی لذتوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا ضروری ہے۔ عیسائی پادری اور راہبائیں شادی نہیں کرتی ہیں ان کا ماننا ہے کہ غیر شادی شدہ لوگ رضائے الٰہی اچھے طریقے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ جب کہ شادی شدہ لوگ اپنی بیویوں کی رضامندی کے زیادہ خواہش مند ہوتے ہیں۔

خیرات وصدقات کی تاکید:

عیسائیت میں تصوف یا عرفان کی مختلف تعلیمات اور منازل موجود ہیں۔ ان تعلیمات پر بہت تاکید کی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک خیرات وصدقات ہے۔ جیسا کہ انجیل میں اس حوالے یوں تحریر ملتی ہے:

> ''ایک دولت مند شخص حضرت مسیحؑ کے پاس آیا اور پوچھا: اے نیک استاد! میں کون سا نیک کام کروں کہ ہمیشہ زندگی پاؤں؟ آپ عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: اگر تو کامل ہونا چاہے تو جا کر سب کچھ تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے۔ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔ تب آکر میرے پیچھے ہو لے''[2]۔

---

[1] عروج، مہوش، **تصوف میں شامل غیر اسلامی تصورات**، (ایم فل)، (اسلام آباد، نمل، 2011ء)، ص:119

[2] انجیل متی:18: 2

اسی طرح ایک اور جگہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا:

''دنیا کیڑے مکوڑے رہنے کی جگہ ہے اس لیے یہاں اپنے لیے مال و دولت اکٹھا نہ کیا کرو وہ جو کیڑے مکوڑوں کی خوراک بن جاتے ہیں اور اگر کیڑے نہ لگے تو چور اسے چرا لے گا۔اس لیے مال و دولت جمع کرنا ہے تو ایسی جگہ جمع کر جہاں نہ کیڑے لگتے ہیں اور نہ چور وہ جگہ آسمان ہے''[1]۔

الغرض دین عیسائیت کی تعلیمات توحید، رسالت اور دوسرے عقائد اور اخلاقیات اعمال صالح پر مبنی تھیں۔انھوں نے کوئی نیا دین یا نئی شریعت پیش نہیں کی تھی۔ان کی دعوت موسیٰ عیسی علیہ السلام کے دین کی تکملہ و تتمہ تھا جیسا کہ آپ عیسی علیہ السلام کا قول ہے: میں احکام موسوی کی تعمیل کرانے کے لیے آیا ہوں نہ کہ ان کی منسوخی کے لیے۔لیکن بعد میں آنے والے ان کے پیروکاروں نے اپنی مرضی سے دین عیسائیت کے احکامات کو تبدیل کیا۔جیسا کہ پادریوں نے معرفتِ الٰہی کے حصول کے لیے جو تعلیمات بیان کی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

حواریوں میں سے ایک حواری کہتا ہے:

''کہ جس بات کا تم نے مجھ سے سوال کیا اس کے بارے میں یہی کہوں گا کہ مرد کی خوبی یہ ہے کہ وہ عورت کو نہ چھوئے'' آگے کہتا ہے ''کہ میں غیر شادی شدہ اور کنواروں سے کہتا ہوں کہ وہ بھی میری طرح اس کنوارے پن کے لباس کو ہمیشہ پہنے رہیں'' [2]۔

روحانی ارتقاء کا یہ زینہ ایک ایسی منزل کی طرف لے جاتا ہے کہ جس میں ذاتی استغراق اور تفکر کی مشقوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔یسوع مسیح کی زندگی کی مثال پر غور کیا جاتا ہے۔اور خدا کی ذات نفس کے احوال کو مرکوز کیا جاتا ہے۔سالک مسیح کی زندگی بالخصوص، ان کی زندگی کے ان دورانیوں کے بارے میں تفکر کرتا ہے۔جب حضرت عیسی علیہ السلام نے دنیا سے علیحدہ ہو کر خود کو عبادات اور تفکر میں گم کر دیا تھا۔اس منزل پر سالک روح القدس کے انسانی ذات پر اثرات سے آشنا ہوتا ہے۔آخر کار اسے خدا کی ذات کے بارے میں قریب ترین بصیرت عطا ہوتی ہے۔اس بصیرت کے نتیجے میں اس کے اندر حضرت حق سے اتحاد کا احساس پیدا ہوتا ہے۔جس طرح کہ تمام روحانی تجربوں میں ہوتا ہے۔مسیحیت بھی خود خبری اور خود نگہداری کا ماحصل ہے۔دوسرے الفاظ میں چونکہ عارفانہ تجربے سے آگاہ ہی عارفین کی بیان کردہ روداد سے ملتی ہے۔اس لیے ہمیں ان کے مکمل تجربے کی نوعیت کو جاننے کے لیے ان پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔یہ درست ہے کہ مختلف عارفین کے تجربات کے بیان میں فرق موجود ہوتا ہے۔جب وہ تفاصیل بیان کرتے ہیں تو بہت سے اختلافی نکات سامنے

---

[1] انجیل متی:6: 19،20

[2] فاروقی، عماد الحسن آزاد، **دنیا کے بڑے مذاہب**، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، 1986ء)، ص: 273

آتے ہیں تاہم ان میں مرکزی معاملات کے بارے میں خاصی حد تک اتفاق پایا جاتا ہے۔ جو ہمیں یقین کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ ان کے تجربات حقیقی اور مستند ہیں۔

مسیحیت کے اندر روحانی تجربے سے مراد دنیا سے دست بردار ہونے کا عمل ہے، جیسا کہ دوسری مذہبی روایات میں بھی ہے۔ طالب ان رشتوں سے منقطع ہونے کی کوشش کرتا ہے جو اس کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ وہ زندگی کی مادی اور نفسانی لذتوں سے الگ ہو کر روح القدس کی قوت پر استغراق کرتا ہے۔ اور خدا تعالی کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔ یہ کام کبھی آسان نہیں رہا۔ دنیا سے خود الگ کر لینے اور روحانی منازل طے کرنے کے فوائد بے پناہ ہیں۔

تھامس اے کیمپس (Thomas A Kempis) نے اپنی کتاب The Imitation of Christ میں ان فوائد پر تفصیل سے بات کی ہے۔

اس عمل کی سالک عقلی تفہیم تو نہیں کر سکتا ہے لیکن اس کا عملاً حصول بہت مشکل ہے۔ دنیا سے دست بردار ہونے کے لیے مختلف تراکیب سے کام لیا جاتا ہے۔ ان میں سے مرکزی حیثیت مراقبے اور گیان دھیان کی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کوئی شخص گیان دھیان یا مراقبہ کر رہا ہے تو اس کے افعال میں معروض مفقود ہوتا ہے۔ ان اصطلاحوں کو ایک فعلیت کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے دوسری طرف ہم یہ بھی کہ سکتے ہیں کہ کوئی شخص کسی چیز پر دھیان کر رہا ہے۔ یعنی معروض میں کوئی چیز موجود ہے جس پر دھیان کیا جارہا ہے۔ اگرچہ ہم کسی کے بارے میں کہ سکتے ہیں کہ وہ کسی چیز پر غور و فکر کر رہا ہے لیکن ہم اس سلسلے میں بالعموم فعل لازم سے کام چلاتے ہیں[1]۔

آر تھوڈاکس مسیحیت کے دائرے میں گیان دھیان کا ایک مذہبی حیثیت کا حامل مستند کردار ہے جس میں معروضی طور پر کوئی بات ہو سکتی ہے کوئی متبرک نشان کوئی تصویر یا بائبل کا کوئی جملہ۔ سالک کسی مجرد شے جیسے خیر یا مسیحی فضیلت پر بھی ذہن کو مرکوز کر سکتا ہے۔ وہ یسوع مسیح یا کنواری مریم کو روحانی مثالوں کے طور پر فکر اور دھیان کا مرکز بنا سکتا ہے۔ مسیحیت کے اصولوں سے باہر کی چیز ہے۔ اسے بہت زیادہ باطنیت کا حصہ قرار دے کر مسیحیت سے باہر کے عقائد میں شمار کیا گیا ہے۔ اس لیے اسے پوری طرح قبول نہیں کیا جاتا تاہم بعض مسیحی گروہ اس کو بطور طریقہ وہ تکنیک بروئے کار لاتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ غیر مسیحی مسالک سریت کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ اس طریقہ کار میں سانس کی مشقوں، روحانی جملوں کی تکرار اور منتروں کو ذہن کے بہاؤ کو روکنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات عبادات کو بار بار

[1] Kempis, A Thomas, *The Imitation of Christ*, (cologne: M.Glashan and Gill.1873), 65

دہرایا جاتا ہے تاکہ شعور کی رو سے آگے بند باندھا جائے۔ مجموعی طور پر گیان دھیان اور مراقبہ دونوں ذہن کو ساکن کرنے کے لیے استعمال میں آتے ہیں تاکہ سالک معاملات دنیا سے منقطع ہو کر صرف خدا سے وابستہ ہو سکے۔

مسیحی عارفین کے یہاں روح القدس کے تعقل کو مرکزیت حاصل ہے۔اس تعقل کا انتقاد کئی لحاظ سے مشکل ہے اس کے بارے میں مسیحی گروہوں میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مختلف طبقے اسے مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔الہیاتی سطح پر روح القدس تثلیث کا حصہ ہے۔ جو اس طرح ہے خدا باپ، خدا بیٹا اور خدا روح القدس۔ مسئلہ یہ ہے کہ بائبل کے مختلف متون مقدس روح کے بارے میں مختلف اور متنوع اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ روح القدس کو کبھی ایک الگ ہستی سمجھا جاتا ہے، مقدس تثلیث کے حصے کے طور پر جس کی اپنی ممیز صفات ہیں یا اس کو روحانی قوت کے طور پر لیا جاتا ہے یا شاید ایک ظہور کے طور پر جو خداوندِ خدا کی قوت کا مظہر ہے، جیسے یسوع مسیح نے خدائی قوتوں کا مظاہرہ کیا۔ مسیحی عارف اسی زاویہ، نظر کو بالعموم اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔اس زاویے کے اندر وہ عبادت کی طاقت، گیان دھیان اور مراقبے کے ذریعے کوشش کرتے ہیں تاکہ اپنے اندر موجود روح القدس کی قوت اور اثر ورسوخ کو مضبوط تر کریں۔اس طرح وہ اپنی روحانی بصیرت کو وسعت دینے کی امید رکھ سکتے ہیں۔تاکہ قرب خداوندی کا حصول ان کے لیے ممکن ہو جائے۔

اب یہاں چند ایک مسیحی عارفوں کی حیات اور افکار جو اس موضوع سے مربوط ہے ان میں سے چند اہم عرفاء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ڈائیونی سیئس[1] (Dionysius)

یہ جو سینٹ پال کے ایتھنز کے سفر کے دوران اس کا قریبی مسیحی ساتھی تھا۔اس نام کو اپنانے کا مقصد شاید یہ بتانا ہے کہ سینٹ پال کا ساتھی اور شریک کار اس کا مصنف تھا۔اندورنی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ وہ پانچویں صدی عیسوی سے پہلے موجود نہیں تھا۔اس کے کام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر فلاطینیوس کے نظریات کی گہری چھاپ ہے لیکن مسیحی ہونے کے حوالے سے اس کے فلاطینیوس سے اختلافات بھی واضح ہیں اور کئی کتابوں کا مصنف تھا۔

ایک کتاب کا نام The Divine Names[2] ہے اور دوسری کتاب کا نام The Mystical Theology[3] شواہد سے پتا چلتا ہے کہ اس نے یہ کتابیں اپنے روحانی تجربے کی بنیاد پر تحریر کیں کیونکہ وہ نہ صرف ماہر الہیات اور فلسفی تھا بلکہ ایک عارف تھا[4]۔

---

[1] یہ ایک جج تھا، سینٹ پال نے اسے عیسائیت میں تبدیل کیا۔اس کے بعد سے یہ مسیحی عارف سے جانا جاتا ہے۔

[2] Dionysius *The Divine Names* (Nicolas- Hays Inc, 2004), 51.

[3] Dionysius, *The Mystial Theology*, (kessinger publishing, LLc,2003), 64.

[4] Norman Tresa, *The world Baby Name*,(USA, The Berkley Publishing Group, 1996), 6.

ڈائیونی سیئس خاص طور پر عرفان کے تنزیہی طریق کار کے لیے مشہور ہے جو کہ بقول اسٹیس روحانی تجربے کا بنیادی طور پر منفی رخ ہے۔ روحانی تجربے میں منفی رخ خلا، عدمیت اور ناموجودیت کی نشاندہی کرتا ہے اس کے الٹ مثبت رخ میں حقیقت مطلق یا خدا سے اتحاد اور وصال کا تجربہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔[1] ڈائیونی سئس تنزیہی منہاج کی انتہا کو چھوتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ خدا کے ساتھ کوئی نہیں صفت لگائی جاسکتی۔ کوئی لفظ اس کے بارے میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی کسی لفظ میں اتنی سکت نہیں کی خدا کی حقیقت کو بیان کر سکے۔ وہ خدا کو مکمل تاریکی کا نام دیتا ہے۔ نہ وہ عدد ہے اور نہ ہی کوئی تنظیم۔ نہ وہ برتر ہے اور نہ ہی کم تر۔ نہ وہ مساوی اور نہ ہی غیر مساوی۔ وہ غیر متحرک ہے نہ ہی حرکت میں۔ وہ ساکن بھی نہیں۔ وہ واحد بھی نہیں اور نہ ہی کثیر۔ وہ خیر ہے نہ ہی اس کے الٹ۔ وہ غیر موجود نہیں لیکن وہ وجود بھی نہیں رکھتا۔

لیکن چونکہ وہ مسیحی بھی ہے اس لیے اس پر فرض بنتا ہے کہ مسیح کے خدا کی مثبت صفات وجود تسلیم کرے۔ وہ صفات محبت، انصاف صداقت، طاقت ودانش وغیرہ کی صفات ہیں۔ چنانچہ ان صفات کا اس کے اوپر کے بیان سے کسی نہ کسی طرح ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ بہر طور واضح کرے کہ ہم ان مثبت الفاظ کو خدا کی ذات کے ساتھ کیوں کر استعمال کرتے ہیں۔ یہی وہ مقصد ہے، جس کے لیے اس نے اپنی کتاب The Divine Names تحریر کی۔ اس کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ خدا اپنی ذات میں نامعلوم ہے اور جو کچھ بھی ہم اس کے بارے میں کہتے اور بولتے ہیں وہ در حقیقت باطل ہے لیکن اس کے باوجود وہ مثبت الفاظ، جو خدا کے بیان میں استعمال کیے جاتے ہیں اس لیے اہم ہیں کہ خدا خود نیا میں موجود تجربی اور مثبت الفاظ کی علت ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا کا وجود ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام موجودات کی علت ہے۔ ہم اسے خیر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ خیر کے تمام مظاہر کا ماخذ ہے۔ وہ طاقت ور ہے اس لیے کہ وہ تمام طاقت اور قدرت کی علت ہے وہ محبت کرنے والا ہے، اگرچہ وہ نہ محبت ہے اور نہ ہی محب۔ اس کے باوجود وہ تمام محبت کا منبع اس کی ذات ہے۔

ڈائیونی سئیس کی یہ تھیوری نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ اہم بھی ہے کیونکہ اسٹیس کے مطابق اس نظریے کی واضح بنیاد ہے، جسے رڈولف اٹو اور کئی دوسرے ماہرین الہیات نے اپنایا ہے۔ اس نظریے کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ جو الفاظ بھی ہم خدا کے بارے میں استعمال کرتے ہیں ان کی حیثیت استعاراتی اور علامتی ہے۔ ان کو کبھی لفظی معنوں میں نہیں لینا چاہیے۔ یہ تھیوری اپنی جدید ترین شکل میں بھی واضح کرنے سے قاصر ہے اگر کوئی لفظ مثبت ہو یا منفی، لفظی معنوں میں خدا پر منطبق نہیں ہوتا تو کیا ہم کوئی بھی لفظ معنوی سطح پر اس کے بارے میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1]W.T.Stace, *The Teachings of Mystics*,(New York: Mentor Books, 1960), 132.

ڈائیونی سئیس اس فکر میں سر گرداں نظر آتا ہے کہ کیا خدا کی ذات پر مثبت اور منفی الفاظ دونوں طرح سے منطبق کیے جا سکتے ہیں؟ دوسرا قابل غور سوال یہ ہے کہ اگر ہم خدا کے لیے مثبت الفاظ بروئے کار نہیں لا سکتے تو کیا منفی الفاظ استعمال میں لائے جا سکتے ہیں؟ اس کے کتاب کے بعض اقتباسات اگر ایک نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہیں تو بعض دوسرے اقتباسات دوسرے نقطہ نظر کی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی نقطہ نظر قابل مدافعت نظر نہیں آتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ منفی الفاظ منطبق کیے جا سکتے ہیں مثبت نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ مثبت اور منفی کے درمیان مطلق امتیاز ناممکن ہے۔ مزید یہ کے اگر مثبت اور منفی دونوں طرح کے الفاظ کا اطلاق خدا پر نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں اس بات کا حق نہیں کہ ہم یہ دعوی کریں کہ خدا کو جانا نہیں جا سکتا یا یہ کہ ہم اسے خدا کہ کر پکاریں۔ اگر ان معنوں میں خدا کلی طور پر نامعلوم ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ہم اس کی نامعلومیت کو بھی نہیں جان سکتے۔ یہ مذہبی زبان کی نوعیت اور عمل کاری کا لاینحل مسئلہ تھا جسے ڈائیونی سئیس نے میراث کے طور پر آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑا۔

میسٹر ایکارٹ[1] (Meister Eckhart)

دوسرا مسیحی عارف جس کے بارے میں ہم ذیل میں بات کریں گے۔ میسٹر ایکارٹ ہے، جو 1260ء میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ اوائل عمر میں وہ ڈومینیکن تنظیم میں شامل ہوا۔ اس نے روحانی ترقی کی منازل تیزی سے طے کیں اور جلد ہی اس تنظیم کا بوہیمیا اور سیکسونی کا سربراہ بن گیا۔ اس کی وفات 1328ء میں ہوئی۔ اپنی زندگی میں ہی اسے ایک سرکردہ اور طاقت ور شخصیت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ وہ دوسرے تمام مسیحی عارفین کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت پسند اور گہرے فلسفیانہ افکار کا حامل تھا۔ اس کی خالصیت اور آزردہ روی نے اسے مصائب میں مبتلا بھی کیا[2]۔

اس پر وحدت الوجودی خیالات اور الحاد کی طرف جھکاؤ رکھنے کا الزام عائد کیا گیا۔ کلیسا کے حکام نے اس پر مقدمہ چلایا، جس میں اس کو اپنے افکار کا دفاع کرنا پڑا۔ اس نے اپنے اوپر لگنے والے الزام کا طویل اور تفصیلی جواب تحریر کیا جس میں اس نے کلیسا سے وفاداری پر اصرار کیا۔ اس نے دعوی کیا کہ وہ کبھی بھی راسخ عقائد کی حدود سے باہر نہیں نکلا۔ بہر حال

---

[1] میسٹر ایکارٹ، ایک جرمن کیتھولک ماہر الہیات، فلسفی اور صوفی تھا، 1260 میں پیدا ہوئے اور 1328 میں وفات پائے۔

[2] John, M. Farley, *The Catholic Encyclopedia*,(New York: Robert Appleton Company,1909), 56.

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وہ مقدمہ چلنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پوپ نے بعد از مرگ اس کی مذمت کی اور کہا کہ اسے شیطان نے ورغلا کر اہل ایمان اور سادہ عوام کو گمراہ کرنے پر لگا دیا تھا[1]۔

ایکارٹ (Eckhart) کے افکار کو ہندو مت اور بدھ مت کے سری تصورات سے گہری مماثلت دی جا سکتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ہندی اور بدھ سری روایتوں سے کلی طور پر ناواقف تھا اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس کا ذہنی تناظر کبھی مسیحیت کے دائرے سے باہر نہیں نکلا۔ ایکارٹ کا اپنا ذخیرہ الفاظ اور فیروز ہیں جن سے ایکارٹ کے مطالعہ سے پہلے واقفیت از حد ضروری ہے۔ اس کا ایک مخصوص جملہ تھا روح میں مسیح کی پیدائش۔ اس جملہ کو اس نے مختلف انداز میں استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد بقول اسٹیس عارفانہ شعور کا حصول ہے۔ ایکارٹ جب اس زبان کو استعمال میں لاتا ہے تو اس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ وہ اپنی عارفانہ واردات کی تشریح مسیحی عقیدے کی حدود میں رہ کر کر رہا ہے۔ وہ یہ ظاہر بھی کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس مقام پر کھڑا ہے جہاں سینٹ پال ایستادہ تھا یعنی جہاں سینٹ پال نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں زندہ ہوں لیکن نہیں ہوں۔ میرے اندر دراصل مسیح زندہ ہے۔ روح کے اندر مسیح کی پیدائش سے مراد اس باطنی روحانی شعور کی نشاندہی ہے جو عارفانہ واردات کے نتیجے میں برآمد ہوتی ہے۔ وہ ہمیں مزید بتاتا ہے کہ یہ اشرف پیدائش روح کے داخل میں، روح کے جوہر میں۔ روح کے اوج کمال پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ایک مقام پر وہ کہتا ہے کہ روح کے قلب میں مکمل سکوت اور خالص امن ہوتا ہے۔ یہ قلب بہشتی پیدائش کا مسکن ہے۔

اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ روح کا اوج کمال کیا ہے اور ہم اس تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے خارج کو چھوڑ کر اپنے باطن میں داخل ہو جائیں۔ اس تک پہنچنے کا طریقہ وہی عارفانہ مجاہدے کی معروف ٹیکنینگ ہے۔ یعنی ہم اپنے شعور کو تمام تجربی متون سے خالی کر دیں۔ تجربی متون سے مراد حسیات، محاکات اور تفکر کا عمل ہے۔ ایکارٹ اپنے ایک وعظ میں لکھتا ہے۔ اگر تم اس بہشتی پیدائش کے تجربے سے گزرنا چاہتے ہو تو تمھیں ہجوم سے علیحدہ علیحدہ ہونا پڑے گا۔[2] یہ ہجوم روح کا ایجنٹ ہے۔ اس ہجوم کے افعال میں شامل ہیں۔ حافظہ، افہام اور ارادہ اور اس کی متنوع شکلیں۔ تمھیں ان سب کو جن میں حسیات ادراک، متخیلہ اور اس تمام کو جو تم اپنی ذات میں منکشف پاتے ہو، چھوڑنا پڑے گا۔ وہ لفظ ہجوم کو کثرت ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اسٹیس کے مطابق ہجوم سے نجات پانے کا مطلب حسیات، یادوں اور تصویروں سے نجات حاصل کرنا ہے[3]۔

---

[1] Bernard McGinn, *The Mystical Thought of Meister Eckhart*, (New York: Crossroad Publishing Company, 2001), 2.

[2] Blakney R. E., *Meister Eckhart, trans*, (London: Harper ,1941), 118.

[3] W.T.Stace, *The Teachings of Mystics*.(New York Mentor Books,1960), 141.

ایکارٹ نے زور دے کر یہ بتایا ہے کہ ان ہدایت پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ جب تک جو اس کی سلطنت سے پسپائی نہ اختیار کی جائے۔ "مسیح کی پیدائش" ناممکن ہے۔ روح کے ایجنٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت زیادہ طاقت درکار ہے تاکہ ان کو شکست دی جاسکے۔ ان کو عمل کرنے سے روکا جاسکے۔ یہ کام طاقت کے بغیر ناممکن ہے۔ اگر ہم روح کو تجربی متون سے خالی کر لیں تو تب ہی ہم اپنی ذات کے باطن تک پہنچ سکتے ہیں، جسے وہ روح کا نکتہ کمال قرار دیتا ہے اس کے بعد ہی روح میں مسیح کی پیدائش ہوتی ہے۔ روح کے نکتہ کمال سے اس کی مراد خالص ذات ہے جو اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب ہم اپنی روح کو تمام خارجی عوامل سے پاک کر لیتے ہیں۔ یہ خارجی عوامل کثرت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ روح کی وحدت میں حائل ہوتے ہیں۔ اس سے بقول ایکارٹ خداوند خدا سے وصال اور اتحاد حاصل ہوتا ہے۔

جان آف رُسی بروک[1] (John of Ruusbroec)

جان وان رسی بروک ہیلجم کے صوبے فلانڈر میں 1293ء میں پیدا ہوا۔ اس کا گاؤں برسلز سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ ابتدائی زندگی میں کلیسا کی تنظیم میں شامل ہوا اور کئی سال تک برسلز کا کیتھیڈرل چیپلین رہا۔ پچاس سال کی عمر میں کیتھیڈرل عبادات کی ہئیت پسند اور خارجیت سے اکتا کر اپنے دو اور مذہبی دوستوں کے ساتھ برسلز سے نکل گیا اور قریب کے ایک جنگل میں آباد خانقاہ میں پناہ لی۔ اس طرح وہ اس قابل ہوا کہ روح کی داخلی زندگی پر ارتکاز کر سکے۔ یہاں وہ اڑتیس سال تک سوچ، بچار اور عبادت کی زندگی گزرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ داخلی عارفانہ زندگی کو متوازن رکھنا چاہیے عبادت اور مراقبوں کے ساتھ ساتھ غریب لوگوں کی خدمت کے کاموں میں بھی حصہ لینا ضروری ہے۔ اس کی وفات 1381ء میں اٹھاسی سال کی عمر میں ہوئی[2]۔

رسی بروک زبان اور فکر کے معاملات میں عام طور پر ایکارٹ کی نقل کرتا ہے لیکن دونوں میں بہت سے معاملات پر اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ یہ افہام و تفہیم کے لیے ضروری ہوگا اگر ہم ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اور اتفاقات کی نشاندہی سے اپنے مطالعے کا آغاز کریں۔ رسی بروک اس شخص کو خدا شناس اور بعض اوقات روشن ضمیر کا نام دیتا ہے۔ جو عرفانی شعور سے مشرف ہوتا ہے یہ اس کے اپنے جملے ہیں لیکن وہ ایکارٹ کے استعارے ..... "روح کے اندر مسیح کی پیدائش" کو بھی استعمال میں لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس اندھیرے میں ایک ناقابل فہم روشنی جنم لیتی ہے جو کہ خدا کا بیٹا ہے اپنی کتاب کے تقریباً ہر ایک صفحے پر وہ اتحاد کے لیے تاریکی کے استعارے کو

---

[1] یہ ایک فلیمش صوفی تھا، اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہے۔

[2] https://ur.dainamtechnology.com/140947- John of Ruusbroec (Accessed, 9 Feb. 2022)

بروئے کار لاتا ہے۔ جس میں ہر طرح کا فرق و امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اس کے لیے جو دوسرا استعارہ اس نے استعمال کیا ہے وہ برہنگی کا ہے۔ وہ روحانی تجربے کے لازماں لمحے کو ابدیت کا نام دیتا ہے۔ اس کی کتاب کا نام The Adomment of the Spiritual Marriage. اس کتاب میں اس نے انسانی وصال، جو شادی کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کو عرفانی اتحاد کے لیے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اسی انداز میں وہ روحانی تجربے کے واقع ہونے کو دولہا کے آنے کے مماثل قرار دیتا ہے لیکن وہ عام طور پر اس جنسی لفظیات سے اجتناب کرتا ہے جو بعض مسیحی اور اسلامی عارفوں کے یہاں مستعمل ہے۔ یہ درست ہے کہ اس نے آتش عشق ایسے جملے استعمال کیے ہیں اس کا متن ہر طرح کے شور شرابے سے پاک ہے۔ مجموعی طور پر اس کا شمار متین قسم کے عارفوں میں ہوتا ہے اس کی تحریر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ فنکارانہ طبعیت کا حامل تھا۔ بعض تحریروں سے اس کیے سیاسی خیالات کا بھی پتہ چلتا ہے [1]۔

سینٹ ٹریسا آف ایویلا[2] (Saint Teresa of Ávila)

سینٹ ٹریسا 1515ء میں پیدا ہوئی اور 1582ء میں وفات پا گئی۔ سپین کی مشہور کیتھولک ہے۔ اس کے حالات زندگی کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں۔ سوائے اس زمانے کے حالات و واقعات کے جو اس نے سینٹ جان آف دی کراس کے ساتھ مل کر کارمیلائٹ فرقے کی تطہیر کے لیے صرف کیا۔ اس سلسلے میں انھیں بہت زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ سینٹ جان اس سے ستائیس سال چھوٹا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس کے کمالات کی معترف تھی اور اسے اپنا روحانی رہنما مانتی تھی۔ اس نے اپنے روحانی تجربات کو اپنی سوانح میں بڑی قلبی گہرائی کے ساتھ بیان کیا۔ یہ سوانح 1588ء میں The Interior Castle کے نام سے شائع ہوئی۔ سینٹ ٹریسا نے اپنے روحانی تجربے کو نہایت سادگی سے اتحاد کے تجربے کی صورت میں بیان کیا ہے۔ چونکہ بقول اسٹیس اس کو تجزیاتی ذہن ودیعت نہیں ہوا تھا اس لیے وہ ابتدائی تفصیلات سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ وہ اپنے بارے میں لکھتی ہے:

> ''جس طریقہ سے میں اتحاد کے تجربہ سے دوچار ہوئی اس کی نوعیت کی مناسب الفاظ میں تشریح کرنے سے قاصر ہوں۔ اسے عارفانہ الہیات میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن میں مناسب اصطلاحات سے ناواقف ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہاں ذہن سے کیا مراد ہے یا روح اور نفس سے کس طرح مختلف ہے۔ مجھے یہ سب ایک ہی لگتے ہیں''[3]۔

---

[1] Ruysbroeck ,Jan van, *The Adornment of the Spiritual Marriage*, (London: Oxford Press,1916),35.

[2] سینٹ ٹریسا رومن کیتھولک چرچ کی عظیم صوفیانہ اور مذہبی خواتین میں سے ایک ہے اور روحانی کلاسیکی مصنفہ بھی ہیں۔

[3] Allison Peers، *The complete works of Saint Teresa*, (London: E,C.D. 1946),18.

سینٹ ٹریسا اپنی سوانح میں لکھتی ہے کہ جب اسے خدا کی عارفانہ طریق سے طلب ہوتی ہے تو وہ مکمل طور پر غشی کی حالت میں چلی جاتی ہے، جیسے بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ ایک ایسی بے ہوشی جو لذت مسرت سے لبریز ہو۔ نفس بتدریج سانس لینا بند کر لیتا ہے اور جسمانی طاقت جواب دینے لگتی ہے۔ انسان اپنے ہاتھ کو بھی ہلا نہیں سکتا شدید درد کے بغیر بھی آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ اگر کھلی رہیں تو بمشکل دیکھ سکتیں ہیں۔ اگر اس حالت میں انسان پڑھنے کی کوشش کرے تو وہ ایک لفظ کے ہجے نہیں کر سکتا۔ وہ انھیں پہچان نہیں سکتا۔ وہ خواہش کے باوجود انھیں نہیں پڑھ سکتا۔ وہ سن سکتا ہے لیکن سمجھ نہیں سکتا کہ وہ کیا سن رہا ہے۔ وہ اپنے حواس سے کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ روح کی مسرت کے حصول میں حائل ہوتا ہے اعانت کا باعث بننے کی بجائے اس کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے بولنے کی کوشش بے سود ہوتی ہے۔ اس کا ذہن ایک لفظ بھی بنانے سے قاصر ہوتا ہے۔ اگر وہ بنا بھی لے تو اس کے بولنے کی اس میں سکت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس حالت میں ظاہری طاقت معدوم ہو جاتی ہے اس کے برعکس روح کی طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے اسے ہم آسانی سے پہچان جاتے ہیں۔ یہ عبادت خواہ کتنی دیر تک چلتی رہے نقصان دہ نہیں ہوتی۔ خصوصاً مجھے تو اس سے کبھی ضرر نہیں پہنچا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس کے کبھی مضر رساں اثرات مجھ پر پڑے ہوں۔ میں کتنی ہی بیمار کیوں نہ ہوں۔ جب خدا مجھے اس تجربے کی توفیق دیتا ہے تو میں اس تجربے کے بعد پہلے سے بہتر محسوس کرتی ہوں۔ اتنی بری رحمت سے کسی کو کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ اس کے ظاہری اثرات اتنے توجہ طلب ہوتے ہیں کہ بے شک ایسے محسوس ہوتا ہے کہ بہت بڑا واقعہ ہوا ہے۔ ہمارے جسم میں کمزوری آتی ہے لیکن تجربہ اس قدر پر مسرت ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہماری طاقت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے [1]۔

یہ درست ہے کہ یہ تجربہ پہلے پہل مختصر عرصے کے لیے ہوتا ہے کم از کم میرے ساتھ یہی تھا۔ یہ تجربہ اس تیزی کے ساتھ وارد ہوتا ہے کہ اس کا احساس ظاہری نشانات سے ہوتا ہے نہ ہی حواس کی ناکامی سے لیکن روح پر یہ تجربات جب زیادہ مقدار میں وارد ہوتے ہیں تو یہ واضح تر ہو جاتا ہے کہ روح پر جو سورج نکلا ہے وہ کتنا روشن ہے جس میں روح پگھل کر رہ جاتی ہے میرا مشاہدہ یہ ہے کہ اس تجربے کی کتنی ہی زیادہ طوالت کیوں نہ ہو جس میں کہ روح کے تمام اعضاء مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ تجربہ بہت مختصر ہوتا ہے اگر یہ آدھے گھنٹے کے لیے وارد ہو تو یہ بہت طویل ہے، میرے ساتھ یہ واقعہ اس سے زیادہ وقت کے لیے رونما نہیں ہوا۔ چونکہ روح اس کا وقوف نہیں رکھتی۔ اس لیے اس کے

[1] Lewis, David, *The Life of St. Teresa* (London: Burns,Oates, & Co.1881), 8.

وقت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے بہر حال میں یہی کہوں گی کہ یہ واردات زیادہ طویل دورانیے کی نہیں ہوتی۔ پھر کوئی نہ کوئی جسمانی حس بیدار ہو جاتی ہے۔ یہ ارادہ ہے جو خدا سے رابطہ قائم رکھتا ہے۔ لیکن پھر دوسری دو استعدادیں پھر سے التجا کرنے لگتی ہیں لیکن ارادہ بہر حال خاموش ہوتا ہے اس لیے وہ معلق ہو جاتی ہیں لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ پھر سے زندہ ہو جاتی ہیں۔

اس سب کچھ کے ساتھ، جو وقت عبادت میں گزرتا ہے۔ وہ کئی گھنٹوں پر ہی محیط ہو سکتا ہے۔ چونکہ دونوں قوتیں اور استعدادیں اس الوہی شراب کے نشے میں مخمور ہو کر خود کو کھونے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مسرت حاصل کر سکیں۔ اس لیے یہ ارادے کی رفاقت سے بند ہو جاتی ہیں تاکہ تینوں مل کر شادیاں ہو سکیں لیکن اس کیفیت میں، جس میں وہ مکمل طور پر گم ہو جاتی ہیں۔ متخیلہ کی قوت موجود نہیں ہوتی کہ وہ کسی چیز کا تخیل کر سکے۔ یہ مکمل گمشدگی کی کیفیت ہے اور مختصر عرصے کے لیے ہوتی ہے انسانی صلاحیتیں گھنٹوں تک بحال نہیں ہوتیں۔ بے نظمی کی کیفیت قائم رہتی ہے خدا مختلف اوقات میں جب وہ چاہتا ہے ان کو اپنی طرف بلا لیتا ہے۔

آیئے اب اس داخلی تجربے کی طرف آئیں جس سے روح اس صورت حال میں گزرتی ہے۔ اس تجربے کے بارے میں وہ بات کریں، جو جانتے ہیں کہ یہ کیا ہے کیونکہ اس کو سمجھا نہیں جا سکتا، اس کو بیان کرنا اور بھی مشکل ہے جب میں اس کے بارے میں لکھنے لگی، (جیسا کہ میں نے پہلے ہی بیان کیا ہے میں اس عبادت کے تجربے سے کئی بار گزر چکی ہوں، جس کے بارے میں لکھ رہی ہوں) میں سوچ رہی تھی کہ اس عرصے کے دوران روح کیا کام کر رہی تھی تو خداوند نے یہ لفظ مجھ سے کہے: بیٹی روح اپنی ذات میں فنا ہو جاتی ہے تاکہ وہ خود کو مجھ پر زیادہ سے زیادہ مرکوز کر سکے۔ وہ خود زندہ نہیں ہوتی، صرف میں ہی حی و قیوم ہوں۔ چونکہ وہ اس کو سمجھ نہیں پاتی، جس کا اسے افہام ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ وہ سمجھ ہے جو سمجھ نہیں سکتی۔ وہ شخص جسے اس کا تجربہ ہوا ہے، اس کی کچھ نہ کچھ آگہی رکھتا ہے۔ اسے زیادہ شفاف طریقے سے بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جو کچھ اس میں وقوع پذیر ہوتا ہے وہ بہت زیادہ مبہم ہوتا ہے میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس کیفیت میں روح خود کو خدا کے قریب محسوس کرتی ہے۔ اس کے وقوع پذیر ہونے میں اس قدر یقین ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ جس کا وقوف ہمیں ہو رہا ہوتا ہے۔ انسان کے تمام قوتیں اور استعدادیں اس صورت حال میں اس حد تک ناکام اور معلق ہو جاتی ہیں کہ ان کے متحرک ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر روح کسی موضوع پر غور کر رہی ہوتی ہے۔ تو اس واردات کے دوران وہ موضوع ایسے غائب ہو جاتا ہے جیسے وہ سوچ کے دائرے میں کبھی آیا ہی نہیں تھا۔

اگر فرد کسی چیز کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے تو اس پر توجہ مرکوز کر نہیں سکتا۔ نہ ہی ایسے کوئی چیز یاد رہتی ہے کہ کیا پڑھا تھا اور کیا نہیں پڑھا۔ یہی بات عبادت کے حوالے سے سچ ہے۔ اس حالت میں اس اصرار آمیز تتلی کے پر جلنے لگتے ہیں، جسے حافظ کہتے ہیں۔ وہ اپنے پر پھیلانے سے قاصر ہوتی ہے ارادہ محبت میں لگا ہوتا ہے لیکن وہ سمجھ نہیں سکتا کہ وہ کیسے محبت کر رہا ہے۔ فہم اگر افہام کرتا ہے تو اس چیز کا افہام نہیں کر سکتا کہ وہ کیسے افہام کر رہا ہے یا کم از کم اسے سمجھ نہیں سکتا، جس کا وہ افہام کر رہا ہوتا ہے میں اسے افہام نہیں کہتی کیونکہ یہ خود سمجھ نہیں سکتا نہ ہی میں اس کو سمجھ سکتی ہوں [1]۔

سینٹ جان آف دی کراس [2] (Saint John of the Cross)

جان آف کراس 1542ء میں پیدا ہوا۔ اور 1591ء میں وفات ہوئے۔ سینٹ ٹریسا اور جان آف کراس کا نام عام طور پر ایک ساتھ آتا ہے۔ دونوں کا تعلق اسپین کے علاقے ایویلا سے تھا۔ دونوں تقریباً ایک ہی عہد میں زندہ تھے۔ دونوں کارمیلائٹ فرقے کے ماننے والے راہب تھے، جو اس زمانے میں انحطاط کا شکار تھا۔ جان آف کراس سینٹ ٹریسا سے ستائیس سال چھوٹا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اسے اپنا روحانی رہنما تسلیم کرتی تھی۔ اس فرقے کی بہتری اور بقا کے لیے دونوں ایک دوسرے سے بہت سے معاملات میں تعاون بھی کیا۔ جان آف کراس کو اس سلسلے میں اس قدر دشمنی کا سامنا کرنا پڑا کہ اسے مخالفین نے اغوا کر کے ٹولیڈو کی ایک قلعہ نما عمارت میں قید کر دیا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ سینٹ ٹریسا کے مقابلے میں وہ اپنے خیالات و تجربات کو زیادہ ترتیب اور شفافیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کی تحریروں میں گہری نفسیاتی بصیرت اور اعلیٰ تجزیاتی استعداد پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کو اس کی تحریریں پڑھتے ہوئے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہو گا کہ اسکی تحریر پڑھتے ہوئے خوشگواری کا احساس ہوتا ہے [3]۔

John of the Cross کو ہسپانوی (Spanish) زبان کے صف اول کے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کی نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے دو، Spiritual Canticle اور Dark Night of the Soul، کو بڑے پیمانے پر ہسپانوی شاعری کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے، دونوں ہی اپنے رسمی انداز اور ان کی بھرپور علامت کی منظر کشی کرتا ہے۔

---

[1] Allison, E., Peers, *The complete works of Saint Teresa*, 108.

[2] سینٹ جان آف دی کراس، ایک ہسپانوی کیتھولک پادری، صوفیانہ تھا۔ وہ سپین میں انسداد اصلاح کی ایک بڑی شخصیت ہیں، اور وہ کلیسیا کے سینتیس ڈاکٹروں میں سے ایک ہیں۔

[3] Peter Tyler, *St John of the Cross* , (New York: Continuum, 2000), 28.

روح کی شب تاریک (Dark Night of the Soul)

جان آف دی کراس اپنی اس کتاب میں لکھتا ہے کہ ''اللہ اور مخلوق میں رابطہ ضروری ہے۔''

اس کے مطابق اتحاد کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ خدا جوہری طور پر ہر روح میں موجود ہے، حتیٰ کہ اس گناہ گار کی روح میں بھی موجود ہوتا ہے جس کے گناہ قابل معافی ہیں۔ خدا اور اس کی مخلوقات میں اس قسم کا اتحاد ختم ہو جائے تو مخلوقات نیست و نابود ہو جائیں۔ جب ہم خدا اور روح کے اتحاد کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس طرح کا جوہری اتحاد نہیں ہوتا بلکہ ہم روح اور خدا سے اس اتحاد کی بات کر رہے ہیں، جس میں روح کی تکمیل اس طرح ہوتی ہے کہ وہ خدا میں منقلب ہو جاتی ہے یہ وہ اتحاد ہے جس میں روح محبت کی وجہ سے خدا کی تمثیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس اتحاد کو ہم جوہری اتحاد سے ممیز کرنے کے لیے ہم مثل ہونے کے اتحاد سے موسوم کرتے ہیں۔ پہلا اتحاد فطری ہے، جبکہ دوسرا اتحاد ماورائے فطرت ہے۔ ماورائے فطرت اتحاد اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب دو ارادے یعنی خدا کا ارادہ اور روح کا ارادہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ یعنی کچھ اس طرح کہ دونوں ارادوں میں کوئی دیوار حائل نہیں رہتی۔ جب روح ہر اس شے سے نجات پا لیتی ہے، جو الوہی ارادے سے ہم آہنگ نہیں تو وہ محبت کے ذریعے خدا میں منقلب ہو جاتی ہے[1]۔

یعنی خدا سے تعلق کے راستے میں نہ صرف اعمال حائل ہوتے ہیں بلکہ اس میں انسانی عادات کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ یعنی صرف ارادی اعمال ہی عدم استکمال کا باعث نہیں بنتے بلکہ وہ حاصل کردہ عادتیں بھی انسان کی راہ میں حائل ہوتی ہیں جو غیر ارادی طور پر ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔ چونکہ کوئی مخلوق اس کے اعمال اور اس کی صلاحیتیں اس قابل نہیں ہوتیں کہ خدائے عظمت کے مقابل آ سکیں اس لیے روح پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ان خلقی اطلاقات سے عاری ہو جائے نہ صرف ان اطلاقات سے بلکہ وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں سے بھی الگ ہو جائے۔ ان صلاحیتوں میں پسند، فہم اور احساس اہم ہیں۔ یوں جب ہر وہ چیز جو خدا سے ہم آہنگ نہیں یعنی خدا سے مختلف ہے روح سے خارج کر دی جاتی ہے تو روح اس حالت میں آتی ہے جسے خدا کا مثل ہونا قرار دیا جاتا ہے۔

ماورائے فطرت ہستی تک رسائی صرف محبت اور خدا کی رحمت سے حاصل ہوتی ہے۔ تمام روحیں محبت اور رحمت کی وصولی میں یکساں نہیں ہوتیں۔ جن کو یہ چیزیں ملتی ہیں ان میں بھی درجہ بندی ہوتی ہے۔ کچھ دوسروں کے

[1] John of the Cross، *Dark Night of the Soul*, (London: limovia.net, 2012), 32.

مقابلے میں محبت کے اعلیٰ درجے پر پہنچتے ہیں۔ خدا اسے رسائی کا موقع عنایت کرتا ہے جو محبت کی انتہا کو پالیتا ہے اور یوں اپنے ارادے کو خدا کے ارادے سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ پس وہ روح جو اپنے ارادے کو مکمل طور پر خدا کے ارادے کے تابع کر دیتی ہے اس سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، اسے اتحاد اور وصال کی نعمت حاصل ہوتی ہے وہ ماورائے فطرت انداز میں خدا کی ذات میں منقلب ہو جاتی ہے [1]۔

جان آف دی کراس کے مطابق انسان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اعمال و کردار سے اللہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔اس کے لیے عبد اور معبود کا رابطہ ضروری ہے۔ جتنا معبود سے رابطہ مستحکم ہو گا اتنا عند اس معبود کے قریب تر ہوتا جائے گا۔

کیتھاروں کا عرفانی مکتبِ فکر

خدا کے روحانی بُعد کے تعقل نے الحاد پسند کیتھار مکتب کے فکری ارتقاء میں معنی خیز کردار ادا کیا۔ یہ مکتب اپنی نوعیت میں ایک سریت پسند مکتب تھا اور کیتھار ایک مذہبی گروہ تھا، جو گیارہویں صدی میں جنوبی فرانس میں نمودار ہوا۔ بارھویں اور تیرھویں صدی میں اس کو فروغ ملا۔ چودھویں صدی میں اسے تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں ہم سہولت کی خاطر کتھار کا ترجمہ ظاہر کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ خود کو مسیحی کہتے تھے اور اس کو جو فی الحقیقت مسیحی تھا، قبول کرتے تھے۔ لیکن کیتھولک کلیسا کی تعلیمات کے منکر تھے۔ کیتھولک کلیسا نے ان کو ملحد قرار دیا۔ [2]

ان کا تصور جہاں بنیادی طور پر دوئیت پسند تھا۔ وہ دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرتے۔ روحانی اور مادی دنیائیں۔ وہ مادی دنیا کو جوہری طور پر برا کہتے تھے۔ جب کہ روحانی دنیا کو مکمل خیر قرار دیتے۔ چونکہ کیتھولک نظریہ دنیا کو خدا کی تخلیق سمجھتا ہے۔اس لیے دونوں فرقوں کے درمیان اختلاف بالکل واضح ہوتا چلا گیا۔ کیتھولک نظریہ کی توضیح میں مادہ بھی کسی سطح پر مقدس ہے۔اس کے برعکس کیتھار مادے کو اس کی کلیت میں برا کہتے ہیں۔

کیتھار مسیحیوں کی عارفانہ مشقوں کے قلب میں یہ عقیدہ تھا کہ مادی دنیا سے بتدریج قطع تعلق کر لینی چاہیے۔ مثالی قسم کی زندگی مکمل طہارت کی زندگی ہے۔ طہارت کی زندگی کے تقاضے یہ ہیں: گوشت نہ کھایا جائے۔ شراب پینے سے اجتناب کیا جائے، خود کو عبادت گزاری تک محدود کر لیا جائے۔ غور و فکر کیا جائے اور دوسروں کی خدمت اور

[1]K. F Reinhardt, *The dark Night of the soul*,(New York: Frederrick Ungar,1957), 65.
[2]Lambert M. *The Cathars* (Oxford : Blackwell 1998),76.

استعانت کی جائے۔ سب کیتھار یقیناً اس قسم کی زندگی نہیں گزارتے تھے۔ ایک نسبتاً چھوٹی سی اقلیت بقیہ جماعت کے لیے مثالی کردار ادا کرتی تھی۔ تصور کیا جاتا تھا کہ مثالی زندگی گزارنے کی مشق اگر دلجمعی سے کی جائے تو انسان خدا کی روح کے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ تمام لوگ محض ایک زندگی میں خدا سے اتحاد کی آرزو پوری نہیں کر سکتے۔ یوں ان کے یہاں بار بار جنم لینے کا نظریہ وجود میں کوئی امکان نہ رہا۔ پوپ انوسینٹ سوم نے 1209ء میں ان کے خلاف صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا۔ پوپ نے فرمان جاری کیا کہ جو لوگ اس جنگ میں پاپائے روم کی طرف سے شرکت کریں گے وہ جتنی زمین پر قبضہ کریں گے اس پر ان کے حق کو تسلیم کیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ شمالی فرانس کی اشرافیہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور جنوبی فرانس کی زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح مقدس صلیبی جنگ ملحدین کے استیصال سے زیادہ مال و دولت اور زمینوں پر قبضے کی مکروہ کوشش میں تبدیل ہو گئی۔[1]

اس جنگ کا نتیجہ کسی شک و شبے سے بالا تر تھا۔ اگرچہ جنوبی فرانس میں کیتھاروں کے پاس بڑے طاقتور قلعے تھے لیکن وہ کیتھولک اقوام کی یلغار سے زیادہ عرصہ محفوظ نہ رہ سکے۔ ایک صدی کی مسلسل فوجی یلغار اور بعد میں مذہبی عدالتوں کی سخت گیر باز پرس کے نتیجے میں کیتھار مذہب نیست و نابود ہو گیا۔ بہت سوں کو قتل کر دیا اور جو باقی بچ گئے۔ انھیں کیتھولک مذہب نے اپنے اندر جذب کر لیا۔ کیتھار مذہب کا تلوار کے زور پر صفحہ ہستی سے نابود کر دیا جانا یورپی تاریخ کا بہت بڑا سانحہ ہے۔ بد قسمتی سے یہ ایک حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی طے شدہ مذہبی عقائد سے ہٹ کر نظام عقائد تشکیل دینے کی کوشش کرتا ہے اسے دار و رسن کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

انفرادی طور پر بھی بہت سے عارفوں اور صوفیوں کو اپنے افکار و عقائد کی وجہ سے بہت زیادہ تشدد اور ظلم کا سامنا کرنا پڑا۔ ہسپانوی عارف جان آف دی کراس ایسے ہی لوگوں میں شامل ہے اس کی کتاب Dark Night of the Soul مسیحی عرفان کلاسیکی متون میں سے ایک ہے۔ اس میں اس روح خدا سے وصال و اتحاد کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ سینٹ جان آف دی کراس کو اس کے افکار کی وجہ سے سخت عتاب و عذاب کا نشانہ بنایا گیا۔

---

[1] Mark, Joshua J, *Encyclopedia of World History*, (New York :Facts on File, Inc,2008), 210. https://www.worldhistory.org/Cathars/Accessed 09, Feb, 2022)

تصوف ہندومت کے تناظر میں

ہندومت میں ہندو دھرم کی مقدس کتابوں میں سے وید کو بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مذہب کی بنیادیں ویدوں کی تعلیمات پر ہی استوار ہیں۔ ہر وید کو ہندو دھرم کے بڑے گیانیوں، پنڈتوں اور اچاریوں نے بنیادی طور پر تین خانوں میں بانٹا ہے۔ جس کا سب سے آخری حصہ 'اپنشد' کہلاتا ہے۔ اپنشد کو ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام کا ایک بڑا ماخذ بھی تصور کیا جاتا ہے، لہذا اس کی تعلیمات سے کوئی وہ شخص صرف نظر نہیں کر سکتا جو قدیم ہندوستانی تاریخ کے مطالعے کا ذوق رکھتا ہو۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اپنشدوں میں تصوف کی تعلیمات بھری پڑی ہیں اور اپنشد جس عہد میں ہندوستان میں رقم کئے گئے اس زمانے میں یہاں مذہبی تعلیمات کا بڑا زور تھا اور تصوف چونکہ رواداری اور انکساری کے ساتھ فروغ دین کا کام انجام دیتا ہے اس لیے اس طریقہ کو گیانیوں، پنڈتوں اور ناتھ پنتھیوں نے ہمیشہ سے بہت اہمیت دی ہے۔ اپنشدوں میں ویسے تو بہت سی اور مختلف انوع تعلیمات تصوف ملتی ہیں، لیکن سب سے زیادہ جس قسم کی تعلیمات کا زور اس میں نظر آتا ہے وہ بے ثباتی دہر کی تعلیم ہے دنیا اور آخرت کی تعلیم کا بہت واضح تصور اس میں پیش کیا گیا ہے اور تصوف کی خاص اصطلاحات کے ذریعہ عوام الناس میں تصور 'تارک الدنیا' کو عام کیا گیا ہے۔ تارک الدنیا ہونے سے اپنشد نے جو مراد لیا ہے کہ '' دنیا ایسے کماؤ کہ ہاتھ تک آئے دل تک نہ پہنچے''۔ لہذا اس کی تعلیمات اس حوالے اور زیادہ قابل قبول گردانی گئی ہیں۔ اپنشدوں کو مسلم صوفیہ نے بھی بہت قدر و منزل کی نگاہ سے دیکھا، اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ اورنگ زیب کے بڑے بھائی دارا شکوہ جنھوں نے مغل دور حکومت کے عہد عروج میں تصوف کے کارہائے نمایاں انجام دئے اور سیر الاولیا جیسی تصوف کی معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی، انھوں نے 56 اپنشدوں کا اس عہد میں فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کی تعلیمات کا اثبات کرتے ہوئے اس کی ہر حوالے سے تشہیر کی۔ بہر کیف یہاں میں اپنشدوں کی انہی تعلیمات تصوف میں سے چند ایک کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے، جس سے اپنشدوں کی تعلیمات کے صوفیانہ مزاج کا علم ہوتا ہے۔

اپنشدوں کی صوفیانہ تعلیمات:

اپنشد کے لغوی معنی ہیں ہمہ تن گوش ہو کر کسی کے نزدیک بیٹھنا۔[1] اور اس کے لفظی معنی ہیں تدریسی نشست یا تصوف اور خاص پر اسرار علوم کے سکھانے والے استادوں کے قدموں میں بیٹھنا[2] ہندوؤں کے نزدیک ویدوں کے بعد

---

[1] ترپاٹھی، رماشنکر، **قدیم ہندوستان کی تاریخ**، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)، ص: ۵۴

[2] عبدالحق، مہر، **ہندو صنمیات** (ملتان: بیکن بکس، 2002)، ص: 535

دوسرے درجے کی کتابیں اپنشد ہیں بلکہ بعض ہندوؤں کے نزدیک اس کا درجہ ویدوں سے بھی زیادہ ہے۔اپنشد کی مجموعی تعلیم کو ویدانت کہا جاتا ہے۔[1]

یہاں اپنشد کی چند اہم تعلیمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

1۔ دنیا میں رہو مگر اس سے دل مت لگاو۔ ویراگ (تبتل یا انقطاع عن ماسوی اللہ) بہترین طرز حیات ہے۔

2۔ دنیا کی نعمتوں سے تمتع جائز ہے۔ مگر انھیں مقصود حیات بنانا جائز نہیں ہے، کیوں کہ جو شخص فانی چیزوں سے دل لگاتا ہے وہ خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔

3۔ انسان کے حقیقی دشمن باہر نہیں ہیں، بلکہ اندر ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:۔

- کام (شہوت)
- کرودھ (غضب)
- موہ (حرص)
- لوبھ (طمع)
- اہنکار (عجب)

4۔ جب تک ان دشمنوں (اور نفس امارہ انھیں کے مجموعے کا نام ہے) کو مغلوب نہیں کروگے۔ عرفان (برہم گیان) حاصل نہیں ہو سکتا۔

5۔ جب انسان عارف ہو جاتا ہے تو اس میں یہ چار صفات پیدا ہو جاتی ہے:۔

- اطمینان
- ہمت
- طاعت
- خدمت خلق

پھر وہ دسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے جیتا ہے۔

6۔ ایشور صرف انھیں کو درشن دیتا ہے جو اس کے دیدار کے لیے بیتاب ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے سراپا جستجو ہوں۔ اس کو پانے کی شرائط حسب ذیل ہیں:

---

[1] الطاف جاوید، **غیر سامی مذاہب کے بانی**، (لاہور: اپنا ادارہ پرانی انارکلی، 2003)، ص: 42

- دم(ضبط نفس)
- دان(ایثار)
- دیا(شفقت)
- جاپ(ذکر)
- تپ(مجاہدہ)
- دھیان(مراقبہ)

7۔ فانی سے دل لگانا سب سے بڑی نادانی ہے۔

8۔ حق تعالی متحرک بھی ہے، غیر متحرک بھی ہے۔ چلتا بھی ہے، ساکن بھی ہے، دور بھی ہے، قریب بھی ہے۔ اندر بھی ہے باہر بھی ہے۔[1]

اپنشدوں کی تعلیمات کے درج بالا خلاصے کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص اس نتیجے پر پہنچے گا کہ:

1۔ پہلی صدی عیسوی سے لے کر آج تک تمام صوفیاء کے بنیادی تصورات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

2۔ اپنشدوں کی روح، وحدۃ الوجود کا عقیدہ ہے اور مختلف صوفیاء، حکماء اور شعراء اس کے قائل رہے ہیں۔

اپنشدوں کی مانند ہندو دھرم میں شری مد بھگوت گیتا کو بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب بھگوان کرشن کے ان احکامات پر مبنی ہے جو انھوں نے ارجن کو دیئے تھے۔ اس میں کل اٹھارہ ادھیائے ہیں اور ان اٹھارہ ادھیاؤں میں بھگوان کرشن نے ارجن کو حق و باطل کی جو تعلم دی ہے اس سے تصوف کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ حالاں کہ گیتا ہندو دھرم کی آسمانی کتاب کبھی تصور نہیں گئی اور ویدوں کی طرح ہندو دھرم کے اعلی تعلیم یافتہ طبقے میں اسے وہ مقام نہیں حاصل جو اپنشدوں کا حاصل ہے، پر یہ کتاب ویدوں سے کہیں زیادہ عوام و خواص میں مقبول رہی ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ البیرونی نے آج سے ایک ہزار برس پہلے جب ہندوستان کا سفر کیا تھا اور اس سفر کی داستان کتاب الہند کے نام سے لکھی تھی تو اس میں انھوں نے گیتا کے حوالے سے یہ جملے رقم کیے تھے کہ:

''یہاں کے باشندے ایک کتاب کو بہت زیادہ اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو ان کی مذہبی مقدس کتب میں شمار ہوتی ہے اور اس کتاب کا نام گیتا ہے''[2]۔

---

[1] ممبی والا، محی الدین، **تصوف اور ہندوستانی معاشرہ**، (نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاوس، 1998ء)، ص:39

[2] البیرونی، **کتاب الہند**، (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، 2005)، ص:29

گیتا میری ناقص رائے میں تصوف کی بہت اہم کتاب تصور کی جاسکتی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس میں زندگی کو جس طرح جینے اور اس کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا سبق دیا گیا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ کرشن ایک مرشد کامل کی مانند اپنے مرید کو راہ سلوک کی منازل طے کرنے کا طریقہ سکھا رہے ہیں۔ اس میں اتنا زیادہ تصوف ہے کہ اس کے کسی ایک ادھیائے کے ایک اقتباس پیش کرنے سے اس کی مکمل عکاسی ممکن نہیں، بہر کیف میں یہاں اس کے ایک دو اقتباس پیش کر رہا ہوں تا کہ ان تعلیمات کی ایک جھلک نظر آجائے۔

بھگوت گیتا میں تصوف:

بھگوت گیتا دنیا کی قدیم ترین روحانی کتابوں میں سے ہے جسے ہندو دھرم میں بڑی مقبولیت حاصل ہے اسے انجیل کرشن کہا جاتا ہے۔ بھگوت گیتا مہابھارت کا ایک حصہ ہے۔ یہ بارہ کتابوں میں منقسم ہے جس میں دسویں کتاب سب سے زیادہ اہم ہے۔ جس میں کرشن مہاراج کے کارنامے اور ان کی محبت کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ بھگوت گیتا میں تقریباً سات سو اشعار ہیں، جو کرشن اور ارجن کے مابین مکالمہ کی صورت میں ہیں۔ جس میں فلسفہ، مذاہب اور اخلاقی دنیا کے زریں اصول بیان ہوئے ہیں، یہ ہندوؤں میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے [1]۔ بھگوت گیتا جو کہ برہم ودیا یعنی فلسفہ بھی ہے اور یوگ شاستر یونی تصوف بھی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ انسان اس تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ خدا تک پہنچے کے راستے بتائے ہیں [2]۔

بھگوت گیتا کی تعلیمات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔ گیان یوگ، بھگتی یوگ اور کرم یوگ۔ [3]

گیان یوگ:

گیتا کے ابتدائی چھ ابواب آتما سے متعلق ہیں اس میں بتایا گیا ہے کہ آتما کس طرح اپنے خالق سے متحد ہو سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں فنافی اللہ کا مقام کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔ گیتا میں لکھا ہے:

''جو شخص خواہشات پر قابو پالے اور ان سے آزاد ہو کر انھیں ترک کرے جیسے یہ میں ہوں یا یہ میرا ہے تک کا خیال کبھی نہ آئے اس شخص کو نفسِ مطمئنہ حاصل ہو گا''[4]۔

---

[1] لال، رائے روشن، **بھگوت گیتا**، (لاہور: فکشن ہاوس، 2013ء)، ص:85

[2] محی الدین، **تصوف اور ہندوستانی معاشرہ**، ص:47

[3] احمد، حسن الدین **شریمد بھگوت گیتا** (نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، 1975)، ص:87

[4] حقی، شان الحق، **بھگود گیتا**، (نئی دلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۴ء)، ص:16

بھگتی یوگ:

یہ گیتا کی تعلیم کا دوسرا حصہ ہے۔ بھگتی عشق و عرفان کا وہ مقام ہے جہاں عابد و معبود، عاشق و معشوق میں غیریت نہیں رہتی۔ گیتا کے باب سات سے گیارہ میں اسی موضوع سے متعلق بحث ہے۔ جہاں خدائی صفات کے مثبت پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور جس کی معراج باب گیارہ میں یوں بیان ہوئی ہے:

''جب میری اطاعت اور عبادت خالص محبت کا نتیجہ ہو تو عابد مجھے میری اصل صورت میں دیکھ سکتا ہے۔ اور دیکھ بھی لیتا ہے اور یوں میرا عشق گویا مجھ میں سما جاتا ہے''[1]۔

کرم یوگ:

یہ گیتا کی تعلیم کا آخری باب ہے۔ اس کا نچوڑ بلکہ اس کے وجود میں آنے کا اصلی سبب ہے۔ گیتا کا آغاز ارجن کے اس سوال پر ہوا تھا کہ میں دنیوی شان و شوکت اور جاہ و جلال کی خاطر جنگ کرنے اور اپنے قریبی عزیزوں اور بزرگوں کو قتل کرنے پر تیار نہیں۔ اس شری کرشن نے اسے بتایا کہ دوسرے لفظوں میں تم عمل سے گریز اور اپنا فرض ادا کرنے سے فرار کی راہ اختیار کر رہے ہو۔ اور یہ کسی طرح جائز نہیں۔ گیتا کا یہ آخری حصہ اسی اصول کے جواز اور بے عملی کے خلاف تعلیم پر مبنی ہے[2]۔

گیتا کی اصلی تعلیم یہی ہے۔ بے غرض عمل ہی زندگی کی غرض وغایت اور اس کی وجہ جواز ہے۔ ہمیں اسی دنیا میں رہنا اور اپنے عمل سے دنیا کی خدمت کرنا اور اسے گمراہی سے بچانا اور بدی سے پاک کرنا ہے۔ یہی ہمارا فرض ہے۔

گیتا میں ویدانتی تصوف کے تمام اسرار و رموز بالوضاحت بیان کر دیئے گئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

- خدا کو اپنا مقصود بناؤ۔
- اس سے محبت کرو تاکہ اسے حاصل کر سکو۔
- خدا اپنے عاشقوں کے دلوں میں رہتا ہے۔
- جو اسے چاہتا ہے وہ اسے ضرور درشن دیتا ہے۔
- ساری زندگی اس کے لیے بسر کرو۔
- نیک اعمال بجالاؤ، مگر نیت یہ ہو کہ خدا مجھ سے خوش ہو۔

---

[1] **بھگوت گیتا**، ص:16

[2] **بھگوت گیتا**، ص:20

- سب انسانوں سے محبت کرو۔
- یہ دنیا خدا کی جلوہ گاہ ہے۔ ہر چیز مظہرِ خدا ہے۔

یہی تصوف کی روح اور یہی گیتا کا اپدیش ہے [1]۔

ہندو مذہب میں عبادت اور ریاضت کے طریقوں میں بعض ایسے ہیں جن کی عملی ہیت کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عملی تصوف میں جو معمولات کئی عرصے سے شامل ہیں وہ قریب قریب عملاً ہندومت کے اندر بھی موجود ہیں اور اب بھی وہ لوگ یعنی ہندو مذہب کے ماننے والے ان کو بطور اصلاح دین اور عملی دین کے طور پر لاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مماثلت اور تقابل کو دیکھتے ہوئے بعض مغربی مفکرین اور دیگر مشرقی محققین کی آراء تصوف کے حوالے سے مختلف ہوئیں۔ مغربی مفکرین کے ایک گروہ جن میں ''فان کریمر''، گولڈ زیہر، ڈوزی اور مشرقی محققین میں سے ابو ریحان البیرونی شامل ہیں۔ ان کے رائے کے مطابق تصوف کے بیشتر نظریات ایسے ہیں جو ہندومت سے لیے گئے ہیں۔ مثلا تصوف کا مشہور نظریہ '' وحدت الوجود'' کافی حد تک اپنی عملی شکل کے اعتبار سے ویدانت کے زیر اثر وجود میں آیا۔ ایسے ہی ریاضت و نفس کشی کی روایت ہندی اپانشد کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ [2]

بعض دوسرے محققین کی آراء اس حوالے سے کچھ مختلف ہیں وہ اس بات کے قائل ہیں کہ تصوف جہاں پر ہندومت سے عملی طور پر متاثر ہوا وہی فکری طور پر بھی صوفیاء نے تصوف میں ہندومت کے تاثر سے کافی حد تک تصوف کی ہیت کو بدل دیا اسی حوالے سے ڈاکٹر ظہیر احمد لکھتے ہیں:

تصوف پر ہندومت نے دو طرح سے اثرات ڈالے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ طریقہ اشراق بذریعہ ریاضت

2۔ مختلف رسومات کی عملا مقارنت کی وجہ سے [3]۔

اپنشد اور بھگوت گیتا کی تعلیمات کے مطابق استغراق یا دھیان گیان کا طریقہ یہ ہے کہ ایک گوشہ تنہائی میں دوزانو بیٹھ کر منہ، ناک، کان اور آنکھوں کو بند کر کے آہستہ آہستہ سانس لیا جائے۔ اگرچہ ابتداء میں صوفیاء عبادت و ریاضت میں مشغولیت بہت رکھتے تھے لیکن اس وقت یہ ریاضت زیادہ تر فرائض و نوافل کے ادا کرنے تک محدود تھی جیسا کہ کہا جاتا ہے

---

[1] مہاتما گاندھی، **مذہب اور دھرم**، (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، 1987ء)، ص: 13

[2] ندوی، محمد اشفاق عالم، **ہندومت ایک مطالعہ**، (نئی دہلی: انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، 2017ء)، ص: 33

[3] صدیقی، ظہیر احمد، **تصوف اور تصورات صوفیاء**، (لاہور: گنج شکر پرنٹرز، 2016ء)، ص: 9

رابعہ بصری ساری رات نمازیں پڑھتی تھیں اور دوسرے صوفیاء بھی قائم اللیل اور صائم النھار ہوتے تھے اور کھانے پینے میں نہایت سادگی رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں ان میں فرائض و نوافل کے علاوہ ریاضت اور نفس کشی بھی رائج ہو گئی تھی۔

"چنانچہ سلسلہ مولویہ [1] میں مرید کرنے سے پہلے طالب ارادت کو یہ حکم دیتے تھے کہ چالیس روز تک جانوروں کی خدمت کرے، چالیس روز فقراء کا خیال کرے، چالیس روز ان کے لیے پانی بھرے، چالیس روز ان کے لیے چارپائیاں بچھائے، چالیس روز ان کے لیے لکڑیاں کاٹ کر لائے وغیرہ تب کہیں جا کر اس کے اندر مرید بننے کی صلاحیت آجاتی ہے۔ان تمام اقدامات کے بعد اس حلقہ ارادت میں داخل کرنے کی تیاری کرتا ہے کہ اسے غسل دیا جاتا ہے اور غسل کے بعد اس توبہ واستغفار کروائی جاتی ہے۔اس حوالے سے ابو الحسن خرقانی کا موعظہ حسنہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اعضاء کا سچا ہونا ضروری ہے۔اعضاء بدنی کے سچا ہونے کے لیے اسے مجاہدہ کرنا ضروری ہے۔زبان ،ہاتھ اور دل ان میں سے ہر ایک کے لیے دس دس سال مجاہدہ ضروری ہے تب جا کر یہ تمام اعضاء سچے ہو جائے گا"[2]۔

اپنشد اور بھگوت گیتا کی تصوفانہ عبارتیں پڑھ کر غیر جانبدار آدمی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ویدانت توحیدی عقیدہ پر قائم ہے۔ جس طرح دوسرے پیغمبروں نے توحید و رسالت کا پرچار کیا ہے۔اسی طرح ان دونوں کتابوں میں بھی واضح طور پر توحید کا پیغام موجود ہے۔ کرشن جی نے جو کچھ بتایا اس کا مفہوم بھی یہ ہے کہ زمین پر سے شر اور فساد کو ختم کیا جائے اور خیر کو پھیلا دیا جائے۔

روح سے دوری شر اور فساد کو جنم دیتی ہے۔اور روح سے قربت انسان کی قوت میں ایسے اضافے کرتی ہے جس سے انسان عالم بالا کی سیر کرتا ہے اور ریاضت و مشقت کے نتیجہ میں خالق ارض و سماء سے متعارف ہو جاتا ہے۔ ہر انسان کم و بیش جسمانی صلاحیتوں سے واقف ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ انسانی صلاحیت روح کے تابع ہے۔ جب تک کوئی انسان روح کی فضیلت سے واقف نہیں ہوتا اس وقت تک وہ فانی اور سڑاند کے جسم میں مقید رہتا ہے۔

ان تمام نکات سے یہ بات سامنے آئی کہ ہندومت میں بھی تصوف کی بڑی اہمیت ہے۔ تصوف کے حوالے سے ہندومت میں بہت سی تعلیمات ملتی ہے جو کہ درج بالا تفصیلا تحریر کیا گیا۔ لیکن دوسرے مذاہب کی طرح ہندو مذہب کے دانشوروں نے بھی اپنی اپنی مصلحتوں کے تحت مذہب کی تشریح کی اور مذہب میں ایسی رسومات داخل کر دیں۔ جن کا تعلق روحانی وظائف سے نہیں ہے۔ان کی وجہ سے یہ مذہب بھی اپنے اصل ہدف دور ہو گیا۔

---

[1] مولانا جلال الدین رومی کے سلسلہ کے لوگوں کو سلسلہ مولویہ کہا جاتا ہے۔

[2] عطار، فرید الدین، **تذکرۃ الاولیاء**، ص:204/2

فصل سوم: تصوف میں غیر اسلامی افکار کی آمیزش

ابتداء میں جو تصوف تزکیہ نفس اور احسان سے جانا جاتا تھا اس وقت اس تصوف سے لوگ اپنی اصلاح کیا کرتے تھے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا تصوف میں مختلف تبدیلیاں آتی گئیں یہاں تک کہ اس کی اصل شکل بگڑ گئی اور اس میں غیر اسلامی افکار شامل ہو گئے۔ جن میں سے چند اہم عناصر ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

مرشد کے مقام و مرتبہ میں حد سے تجاوز کرنا:

مرشد کا لفظ ماخوذ ہے لفظِ رشد سے اور اس کا مطلب ہدایت ہے اور یہ غیّ کی ضد ہے [1]۔

تصوف میں مرشد کا مقام بہت بلند ہوتا ہے اور مرشد دراصل ایک رہنما اور ایک استاد کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو سیدھا راستہ کی طرف رہنمائی کرے۔ تصوف کے ماہرین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ اس راہ کو اپنانے کے لیے کسی رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ تصوف کے راستے بھی عام راستوں کی طرح چور اور ڈاکو شیطانی وسوسوں اور خواہشاتِ نفسانی کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ تو یہاں اس راہ میں ایسے رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو ان راستوں سے اپنے مریدوں کو آسانی سے گزارے۔ تصوف میں مرشد کو خاص مرتبہ حاصل ہے جیسا کہ امام قشیری فرماتے ہیں: کہ جب بھی وہ اپنے مرشد ابو علی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو روزہ رکھ کر اور جانے سے پہلے غسل کر کے جاتے تھے اور ان کے ساتھ بہت اچھے تعلقات قائم ہو جانے اور ان کی مجلس میں کثرت سے آمد و رفت کے باوجود ان کے دل پر کبھی یہ خیال تک نہیں گزرا کہ وہ استاد اس پر کوئی اعتراض کریں حتیٰ کہ مرشد اس دنیا سے رخصت ہو گئے [2]۔

تصوف میں مرشد کا مقام بہت اعلیٰ ہے۔ مرید بار بار اپنے شیخ کی زیارت کے لیے جایا کرتے ہیں اور ان کی خدمت کو اپنے لیے بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔ لیکن چودھویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں تصوف کی شکل کافی بگڑ چکی تھی۔ اس میں غیر مروج رسمیں اور گمراہ کن عناصر شامل ہو گئے تھے، ان رسموں اور غلط عناصر کو پھیلانے میں ایسے لوگوں کا کردار شامل رہا ہے جنھوں نے تصوف کا لبادہ اوڑھ کر صوفیائے کرام کے نام پر یہ سارے غیر اسلامی افکار کو تصوف میں شامل کیا گیا۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو صوفی سے ملقب کیا جبکہ ان کے قول، فعل اور عمل کے لحاظ سے یہ لوگ صوفیاء سے

---

[1] اصفہانی، راغب، **المفردات فی غریب القرآن**، (بیروت: مکتبۃ نزار مصطفیٰ الباز، 2009) ص: 167

[2] القشیری، **رسالۃ قشیریہ**، ص: 11

کوسوں دور تھا۔ کیونکہ انھوں نے تصوف کے اندر موجود چیزوں کو حد سے زیادہ حیثیت دی اور مرشد کے مقام میں مبالغہ آرائی سے کام لیا اس کی وجہ سے لوگ تصوف سے دور ہونے لگے۔

مامور من اللہ:

مستصوف یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں اسی وجہ سے لوگ انھیں اللہ تعالیٰ اور رسول کا نمائندہ خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ کوئی شخص یہ دعویٰ لے کر اٹھے تو اس کا یہ دعویٰ ہر گز درست نہیں ہو کیونکہ یہ حق صرف پیغمبروں کو حاصل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرے [1]۔

اس حوالے سے اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾[2]۔

ترجمہ : ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اُس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ "اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو" اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔

یہاں مستصوف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ تصوف کے گدی نشین ہیں اور انھیں خلافت کی پگڑی دی گئی ہے اس لیے ان کی بیعت ہر مسلمان پر فرض ہے، جبکہ یہ تصور اور عقیدہ اسلامی نقطہ نگاہ سے غلط عقیدہ ہے۔ اسلام صرف اللہ اور اس کے اوصیاء کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنے کی تاکید کرتا ہے اس کے علاوہ کسی اور کی بیعت اس انداز میں کرے تو وہ حد سے تجاوز ہو گا اس کی اسلامی تعلیمات میں مذمت کی گئی ہے۔

تصوف میں تصورِ شیخ:

مامور من اللہ کے بعد مرشد کے مقام میں دوسرا بڑا مبالغہ آرائی یا غلو شیخ کا تصور ہے۔ سلوک کی منازل طے کروانے کے لیے سالک کے تین درجے مقرر کیے گئے ہیں جن میں سے پہلا فنافی الشیخ، دوسرا فنافی لرسول اور تیسرا فنافی اللہ

---

[1] مہوش حیات، **اسلامی تصوف میں غیر اسلامی تصورات**: 127

[2] النحل: 36/16

ہے۔ان میں سے پہلے درجے فنافی الشیخ کی ابتداء تصور شیخ سے ہی کروائی جاتی ہے۔اس سے مستصوف یہ مراد لیتے ہیں کہ پیرومرشد کی غیر مشروط اطاعت کی جائے۔جبکہ یہ اسلامی تعلیمات کے بر خلاف ہے۔

جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ تَوَلَّى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا﴾[1]۔

ترجمہ: جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا، تو بہر حال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔

تصوف میں مبالغہ آرائی کی یہ حالت ہے کہ پیرومرشد کی غیر مشروط اطاعت کرے اور ساتھ ہی ساتھ سالک کو یہ بات بھی باور کروائی جاتی ہے کہ اس کا مرشد ہر وقت اس کے حالات سے باخبر رہتا ہے اور اس کی ضرورت کے وقت اس کی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔اس طرح سالک کو اس عقیدے پر اتنا زور دیتا ہے کہ سالک ہر وقت مرشد کی صورت کو اپنے ذہن ودماغ میں بٹھالیتا ہے اور بعض اوقات سالک کو یہ سب کچھ حقیقت کی طرح دکھائی دینے لگتی ہے۔

فنافی الشیخ کا تصور:

اسلامی تعلیمات سے ہٹ کر یہ ایک الگ تعلیم ہے کہ اس میں سالک کو اس طرح تربیت دی جاتی ہے کہ سالک شیخ کو حاضر، ناظر اور افعال وگفتار کو اسے دیکھنے والا اور سننے والا سمجھا جانے والا لگتا ہے۔حالانکہ ایسا تصور اسلامی تعلیمات میں کہیں نہیں ملتی اور اس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔یہ یہود ونصاریٰ کی طرح تعظیم ومحبت میں غلو ہے اور یہ شرک کے زمرے میں آتا ہے۔کیونکہ اس منزل پر مرید کو اللہ اور رسول سے بیگانہ کرکے شیخ کا غلام بنادیا جاتا ہے[2]۔

اس حوالے سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾[3]۔

ترجمہ: اے نبیؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ، "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔

---

[1] النساء:80/4

[2] صدیقی، ظہیر احمد، **تصوف اور تصوراتِ صوفیاء**، ص:63

[3] آل عمران:31/3

علم غیب:

مستصوف لوگوں کو جنات کے ذریعے سے خبریں لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔جو کبھی سچی اور کبھی جھوٹی ہوتی ہیں۔جس سے ضعیف الاعتقاد لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کو ہر بات کا علم ہوتا ہے گویا یہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ﴾[1]۔

ترجمہ: اے محمدؐ! ان سے کہو، "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے" پھر ان سے پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟

ان لوگوں کی بات تو ایک طرف ہے جن اولیاء کو اللہ کشف نصیب فرماتے ہیں ان پر بھی ہر بات کا بھید نہیں کھلتا اللہ جب چاہتا ہے ان کے سامنے سے پردے ہٹا دیتا ہے اور یہاں یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ کشف بھی ہمیشہ درست نہیں ہوتے ان میں بھی غلطی کا امکان موجود ہوتا ہے۔

غیر اللہ کے نام نذر و نیاز:

امام راغب نذر کے لغوی معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ 'کسی حادثے کی وجہ سے غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینا'۔[2] شریعت میں نذر و نیاز خالصتاً اللہ کے لیے ہوتی ہے غیر اللہ کی خوشنودی کے لیے دی گئی نذر و نیاز اسلام میں حرام ہے۔اسلام کی رو سے نذر کا حقیقی مقصد قربِ الٰہی حاصل کرنا ہے۔

اس حوالے سے قرآن میں ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾[3]

ترجمہ: اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان اگر تو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہو گا۔

---

[1] الانعام:50/6

[2] اصفہانی، **مفردات فی غریب القرآن**، ص:1038/2

[3] یونس:106/10

کامل شیخ نذر کو اللہ تعالیٰ کا مال سمجھ کر غرباء میں تقسیم کر دیتے ہیں اور معمولی وظیفے کے طور پر صبح و شام کا کھانا لنگر سے لیتے ہیں۔ لیکن مستصوف نذر و نیاز اور تحائف سب چیزوں کو اپنا ذریعہ آمدنی سمجھ لیتے ہیں ایسے لوگ اپنے مریدوں کی نذر نیاز پر گزارا کرتے ہیں اور خود کچھ نہیں کماتے ایسے لوگوں کی دیکھا دیکھی لوگ سمجھتے ہیں کہ خود کی کمانا ضروری نہیں ہے بلکہ عقیدت مندوں کی نذر پر بھی گزارا کیا جاسکتا ہے ان لوگوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے خدا کے لیے زندگی گزارنے والے دوسروں پر امید نہیں باندھتے وہ خود اللہ کا فضل تلاش کرتے ہیں۔

غیر اللہ کو سجدہ کرنا :

کچھ لوگ سجدے کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں سجدہ تحریمی اور سجدہ تعظیمی۔ سجدہ تعظیمی کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ اللہ نے خود فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کروایا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا تھا۔ لیکن آج کل وہ لوگ جو اپنے آپ کو اہل تصوف کہتے ہیں وہ لوگ اپنے مرشد کے لیے سجدہ کرتے ہیں یہ امتِ محمدیہ میں جائز نہیں کیونکہ سجدہ صرف اور صرف اللہ کے لیے مختص ہے۔

جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾[1]

-

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو، اور نیک کام کرو، شاید کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔

سجدہ تعظیمی کا بزرگوں میں رواج رہا ہے اور یہ رواج اب تک جاری و ساری ہے۔ انھیں بزرگوں میں سے مجدد الف ثانیؒ نے اس کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ ایک دفعہ مجدد الف ثانی کو لوگوں نے بتایا کہ آپ کے بعض خلفاء کو ان کے مرید سجدہ کرتے ہیں اور زمین بوسی پر بھی کفایت نہیں کرتے تو آپ نے کہا کہ اس کی برائی آفتاب سے بھی زیادہ ظاہر ہے۔ یہ شرک ہے۔ انھیں تاکید کریں کہ اس قسم کے افعال سے بچنا ہر آدمی کے لیے ضروری ہے خاص کر خلق کے پیشوا کے لیے۔ کیونکہ ان کے پیرو بھی ایسے افعال میں ان کی اقتداء کریں گے تو مصیبت میں گرفتار ہوں گے[2]۔

---

[1] الحج:77

[2] نقشبندی، محمد روح اللہ، **جواہر مجددیۃ**، (کراچی: دار اشاعت،)، ص:206

توان باتوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سجدہ محض اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنا شرک کے زمرے میں آتا ہے۔ آج کے دور میں دیکھا جائے تو پیر مریدی کا رسم روز بروز بڑھتے نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں مرشد کا حد سے زیادہ احترام کیا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک سادہ لوح شخص ایسا احترام دیکھ کر ایسی شخصیت کو اپنا سب کچھ ماننے کو تیار ہو جاتا ہے۔

جانشینی میں غیر انصاف:

بعض لوگوں میں جانشینی کا معیار تقوی و پرہیز گاری کی بجائے نسل پر ہوتا ہے۔ حالانکہ ولی کا بیٹا ولی اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک وہ پاکیزگی اور طہارت کی زندگی گزار کر ولایت کے مقام حاصل نہ کر لے لیکن لوگوں میں اس کا معیار شجرہ نسب پر ہوتا ہے۔ ایسے ہی روحانیت سے ناواقف کچھ لوگ تصوف کو بدنام کرنے کا سبب بنتے ہیں کہ پیر و مرشد کے بعد اس کا بیٹا جیسا بھی ہو اس کو جانشینی دینا ضروری ہے۔ جبرا اس کے بعد اس کے بیٹے کو اس کے مسند پر بیٹھایا جاتا ہے۔ جبکہ قرآن اس حوالے سے ہماری رہنمائی اس انداز میں کرتا ہے۔

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾[1]۔

ترجمہ: پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی، پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔

اسلام کے مختلف شعبے ہیں ان شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ روحانیت کا شعبہ ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ روحانیت حاصل کرنے کے لیے اولیائے عظام اور صوفیائے کرام کے ہاں رجوع کرتے تھے ان سے روحانیت کا فیض حاصل کیا کرتے تھے۔ مگر زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس شعبہ روحانیت خصوصاً تصوف کی تعلیمات میں نت نئے عناصر شامل ہو گئے، طرح طرح کے لوگ اپنے آپ کو صوفی بنا کر اس اہم شعبہ روحانیت کی اصل شکل میں بگاڑ پیدا کر دی ہے۔ اس طرح لوگ اس اہم شعبے سے دور ہونے لگے ہیں۔ اہل تصوف اور ان کے بزرگوں کو اس طرف نگاہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اسلام کا یہ روحانی شعبہ پھر سے پہلے کی طرح فعال ہو جائے اور لوگ اس سے فیضاب ہو سکے۔ اس کے لیے صوفیائے کرام کو چاہیے کہ اپنے مریدوں کو صحیح معنوں میں تربیت کرتے ہوئے اصل صوفی تعلیمات سے ان کو روشناس کرائے۔

---

[1] مریم: 59/19

اسی طرح لوگوں نے عبادات اور دین کے دوسرے معاملات میں نت نئی چیزوں کا اضافہ کیا اور کچھ نے ان معاملات میں غلو اختیار کیا۔ جبکہ قرآن اس بارے میں یوں تاکید سے منع کرتا ہے:

﴿يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ﴾[1]۔

ترجمہ: اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔

اسلامی تاریخ کا سب سے بہترین دور وہ شمار ہوتا ہے جس میں صرف قرآن وسنت پر عمل کیا جاتا تھا اور قرآن وسنت پر عمل کی وجہ سے لوگ اصل دین اسلام سے قریب تھے۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ غیر صوفیوں نے صوفیوں کے حلقوں میں مشہور ہونے کے لیے خود کو صوفی ظاہر کر کے صوفیوں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے غیر اسلامی تصوف کی بنیاد رکھی اس طرح مسلمانوں میں غیر اللہ کو دستگیر، حاجت روا ماننے کا دستور رواج پا گیا۔ اس طرح بہت سارے چیزیں مسلمانوں میں عام ہو گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ مسلمان فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ دنیا پرست لوگوں نے ان چیزوں کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا اور عوام نے ان کی اندھا دھند تقلید کر کے ان غیر اسلامی عناصر کو دین کو جزو بنا دیا پھر مسلمان بادشاہوں نے ان بدعات کو سرکاری سرپرستی میں پھلنے پھولنے کا خوب موقع دیا۔ اس طرح لوگ اولیاء اللہ کے بارے میں حد درجہ عقیدت سے شرک کو جائز سمجھنے لگے۔ اس یلغار نے دین اسلام کی اصل صورت کو مسخ کر کے رکھ دیا[2]۔

رہبانیت:

صوفیائے کرام میں جب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عبادت میں غلو ہونے لگا تو ان میں رہبانیت رواج پا گئی۔ ان کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ دنیا اور انسان کا وجود ان کے لیے عذاب ہے خواہشاتِ نفسانی دراصل اسی عذاب کا حصہ ہیں۔ انسان کے لیے نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام آسائش سے قطع تعلق ہو کر لذاتِ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرے، دنیا کی محبتوں کو دل سے نکال دیا جائے پھر نفس اور جسم کو ریاضتوں سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اس کا غلبہ قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح ہلکی ہو جائے گی اور نجات کی بلندیاں حاصل کر لے گی۔ اس حوالے سے مولانا

---

[1] النساء، 171/3

[2] مہوش حیات، **اسلامی تصوف میں غیر اسلامی تصورات**، ص: 141

مودودیؒ فرماتے ہیں کہ ایسا نظریہ رکھنا بالکل غیر تمدنی ہے مگر تمدن پر یہ متعدد طریقوں سے اثرانداز ہوتا ہے۔اور جہاں ان کے اثرات پہنچتے ہیں وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں[1]۔

اس کی ابتداء یہودیوں نے کی تھی پھر نصاریٰ نے بھی یہ روش اختیار کرلی یہ لوگ روحانیت کے راستے میں حائل مادی جسم کو کمزور بنانے کے لیے طرح طرح کے عذاب دیتے تھے۔اور خود اپنے جسم پر زخم کر لیتے تھے۔جب زخم میں کیڑے پڑ جاتے اور کوئی کیڑا نیچے گر جاتا تو اسے اٹھا کر جسم سے چمٹا دیتے اور کہتے کہ یہ تمہاری خوراک ہے۔لہذا یہ لوگ دنیا سے کٹ کر جنگل میں گیان دھیان میں مصروف ہو جاتے۔اسی گیان دھیان میں عورت کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے[2]۔

اسی صفات سے متشابہ ایک گروہ مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا۔انھوں نے راہبانہ زندگی اپنے لیے پسند کیا اور ایسے ایسے افعال انجام دینے لگے جن کا اسلام سے دور کا تعلق نہیں تھا۔جبکہ قرآنِ حکیم لوگوں کو ایسی زندگیاں گزارنے سے منع کرتا ہے۔اس حوالے سے قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾[3]۔

ترجمہ: اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کرلی، ہم نے اُسے اُن پر فرض نہیں کیا تھا، مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا اُن میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے اُن کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا، مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں[4]۔

مفتی محمد شفیع اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رہبانیت رہبان سے منسوب ہے راہب و رہبان کے معنی ڈرنے والا ہے۔اس کے تین درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ حلال یا مباح چیز کو عملاً یا اعتقاداً حرام کرے۔یہ رہبانیت قطعاً حرام ہے۔دوسرا

---

[1] مودودی، ابوالاعلی، **تجدید واحیائے الدین**، (لاہور اسلامک پبلیکیشنز،، 1989ء)، ص:23

[2] مہوش حیات، **اسلامی تصوف میں غیر اسلامی تصورات**، 142

[3] الحدید: 27/57

[4] نجفی، **الکوثر فی تفسیر القرآن**، ص:72/4

یہ ہے کہ مباح کے کرنے پر عملاًیا اعتقاداً حرام قرار نہیں دیتا مثلاً کسی دینی یا دنیوی ضرورت کی وجہ سے اس کو چھوڑنے کی پابندی کرتا ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ مباح کو حرام نہ سمجھے لیکن سنت کی طرح استعمال چھوڑ کر ثواب سمجھے۔ یہ غلو کی قسم ہے۔اسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے احادیث میں منع فرمایا ہے۔پہلی قسم بنی اسرائیل سے متعلق، دوسری اہل تقوی سے اور تیسری اہل کتاب کے غلو سے متعلق ہے"[1]۔

اور اس آیت کے حوالے سے تفسیر جلالین میں یوں تفسیر بیان ہوئی ہے:

عیسائی راہبوں کی رہبانیت بدعت لغوی تھی شرعی نہیں تھی۔چونکہ شریعت کے اہل حق اہل بدعت نہیں ہوتے۔ آیت میں اس بدعت کا نہیں اس کی رعایت نہ کرنے والوں پر ملامت کی گئی ہے۔[2]

تو اگر صوفیاء بھی اس طرز پر اپنی زندگیاں گزاریں تو اس حوالے سے یہی شبہ پیدا ہوگا کہ صوفیاء نے بھی دنیا سے قطع تعلق کرتے ہوئے رہبانیت اختیار کی ہے۔

ترکِ لذات میں غلو:

بعض لوگ حلال چیزوں کو اس طرح ترک کر دیتے ہیں جس طرح حرام چیزوں کو ترک کر دیتے ہیں مثلا: گائے کے گوشت یا مطلق گوشت سے مکمل پرہیز کرنا اور اسے اللہ سے قرب حاصل ہونے کا وسیلہ سمجھنا۔ مولانا اشرف تھانوی کے نزدیک یہ دین میں غلو اور بدعت سیئہ ہے۔اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے[3]۔

صوفیائے کرام کی ابتدائی زندگی کی طرف توجہ کرنے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام نے جو ترکِ لذات کیا تو اس کو انھوں نے تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر ترک کیا جاتا تھا نہ کہ اس کے ترک کرنے کو عبادت جانا جاتا تھا۔ لیکن اگر آج کے دور میں اگر کسی بزرگ یا کسی صوفی ان لذات کے ترک کو عبادت سمجھے تو یہ غلو شمار ہوگا۔اسلام میں ایسے افعال کی مذمت کی گئی ہے کیونکہ ان لذات کا ترک نہ سنت ہے اور نہ بدعت۔

ان تمام نکات کے بات یہ کہنا مناسب ہوگا کہ شریعت میں ایسے کاموں سے روکا جاتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے نزدیک ناپسند ہو۔ ہمیں امتِ وسط بنا کر پیدا کیا گیا ہے اسی لیے دین میں افراط و تفریط کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔یہ ایک معتدل دین ہے اس میں ہمیں مباح چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت بھی دی گئی لیکن اس کے

---

[1] مفتی، محمد شفیع، **معارف القرآن**، (کراچی: دار المعارف، 1983ء)، ص: 336/4

[2] سیوطی، **تفسیر جلالین**، ج: 7،6، ص: 363

[3] تھانوی، مولانا اشرف علی، **التکشف عن مہمات التصوف**، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2005ء)، ص: 398

لیے شرط یہی ہے کہ اس میں مشغولیت انسان کو دینی اور دنیاوی ضروریات سے غافل نہ کردے اور اگر کوئی چیز ایسا کرتی ہے تو شریعت ہمارے لیے اس چیز کو منع کرتی ہے۔ لہذا دین مبینِ اسلام کے اس عظیم روحانی شعبہ کو غیر اسلامی افکار سے پاک وصاف کرنا ہم سب کی ذمہ داری بنتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾[1]۔

ترجمہ: جو کچھ رسول ﷺ تمھیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔

اس آیت کریمہ میں صاف لفظوں میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شارع شریعت ہیں ان کی کہی ہوئی باتوں پر عمل پیرا ہونا اطاعتِ رسول کے زمرے میں آتا ہے اور رسول اکرم ﷺ جس چیز سے منع فرمائیں اس سے باز رہنا ضروری ہے۔ تو اہل تصوف میں سے بعض جائز لذت کو ترک کرنا بھی عبادت سمجھتے ہیں جبکہ یہ خلاف شریعت ہے۔

ان دلائل کی رو سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تصوف اپنی حقیقت و نصب العین میں فعّال، تکریم اِنسانی کا علمبردار، عالمگیر امن کا داعی، مکارمِ اخلاق، تزکیہ نفس، تصفیۂ قلب، خود گری، اخلاص فی العمل، حسنِ معاملہ اور معرفتِ ربّانی سے عبارت ہے جس کے مآخذ و مصادر قرآنِ کریم و سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ تصوف اور اسلام ایک دوسرے کا تکملہ ہیں کیونکہ تعلیماتِ تصوف کو سمجھے اور اپنائے بغیر کماحقہ فہمِ دین ممکن نہیں کیونکہ تصوف نہ صرف اسلامی تعلیمات، روایات، ثقافت اور تہذیب و تمدن کا ناگزیر حصہ ہے بلکہ اسے اسلام کا باطنی پہلو کی حیثیت بھی حاصل ہے۔

---

[1] الحشر: 7

باب دوم:

اسلامی تصوف اور مستشرقین

فصل اوّل: تحریک استشراق اور اس کے اغراض و مقاصد

فصل دوم: مستشرقین کا صوفی ازم سے تعلق

فصل سوم: اسلامی تصوف پر مستشرقین کے اعتراضات کے اسباب

باب دوم: اسلامی تصوف اور مستشرقین

اس باب میں تصوف کے حوالے سے مستشرقین کے مطالعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تصوف مادی دنیا میں گمراہی اور اخلاق رزائل سے بچنے اور اپنے اعمال وافعال میں اخلاص پیدا کرنے کا نام ہے۔ تصوف اگر تزکیہ نفس اور باطنی قوت کے طور پر دیکھا جائے تو انسان تصوف کے ذریعے کمال تک پہنچ سکتا ہے، لیکن اگر تصوف کی اصلی شکل میں بگاڑ پیدا کرے تو تصوف انسان کو زوال کی طرف لے جاسکتا ہے۔ موجودہ تصوف ہر طرف سے تنقید کا شکار اسی لیے ہے کہ اس کی اصلی تعلیمات تک رسائی مشکل ہوگئی ہے۔ اس لیے تصوف پر باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ مستشرقین نے اس کے مختلف پہلوؤں پر مطالعہ کیا ہے۔

مستشرقین نے اسلامی علوم اور اسلامی تعلیمات پر خصوصی مطالعہ کیا، اسی طرح انھوں نے اسلامی تصوف کا بھی بہت باریک بینی سے مطالعہ کیا، ان کا علمی تعاقب اصحابِ قلم اور اصحابِ قلوب نے خوب کیا ہے اور ان مخلصانہ کاوشوں کی بدولت اسلامی علوم و فنون کی اصل شکل آج تک موجود ہے۔ ان کے مطالعات کے نتیجے میں لوگوں نے تصوف کی دو تعبیریں کرنے لگے؛ ایک اثبات اور دوسرے نفی۔ اثباتی پہلو میں بدعات ورسومات سے مکمل اجتناب پایا جاتا ہے اور اس میں قرآن و حدیث کی تعلیمات سے مکمل وابستگی نمایاں ہوتی ہے اور دوسرا پہلو نفی کا ہے جس میں بدعات اور خرافات مشرکانہ کردار نمایاں ہوتے ہیں۔ تعبیرِ دوم کی ابتدا مستشرقین نے کی ہے، سادہ لوح مسلمان تعبیرِ دوم سے متاثر ہو کر تصوف کی تمام تعلیمات کے یک سر انکار بلکہ مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

مستشرقین نے تصوف کا مختلف حوالوں سے مطالعہ کیا۔ ان کے مطالعات اور تحقیقات سے بعض اذہان پراگندہ ہوا اور تصوف کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات ان کے دلوں میں پیدا ہوئے۔ آج دیکھا جائے تو ان غیر مسلموں کی تحقیقات کی بناء پر تصوف کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ایسے سوالات کیے جاتے ہیں جو آج کے دور میں تصوف کی تعلیمات کو پڑھنے اور سمجھنے والوں کے ذہنوں کو مسموم کر دیتے ہیں۔ یہاں اس باب میں تصوف کے حوالے سے مستشرقین کے مطالعات کو شاملِ بحث کیا گیا ہے اور مستشرقین کے اغراض و مقاصد اور تصوف و صوفی ازم سے ان مستشرقین کا کیا تعلق ہے اور ان کی طرف سے تصوف پر جو اشکالات اور اعتراضات ہیں ان کے اسباب کو تفصیلا بیان کیا گیا ہے۔ اس سے تصوف پر پڑی ہوئی تشکیک وارتیاب دور ہو جائے اور ان کو مختلف طریقوں سے چھان بین کر کے اس کے اصل چہرے واضح ہو جائے۔

فصل اوّل: تحریک استشراق اور اس کے اغراض و مقاصد

استشراق کی تحریک کو اٹھارویں صدی ہی سے کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔اس شہرت کی وجہ تحقیقی مطالعات تھے جو اسلام کے دو بنیادی سرچشموں (قرآن و حدیث)اور شارحِ قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے بارے میں مختلف کتابوں، رسالوں اور انسائیکلوپیڈیا میں ان مغربی فضلاء نے پیش کیے تھے۔ استشراق کی تحریک پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے خود استشراق کے مفاہیم کی طرف مختصر انداز میں تحقیق پیش کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو یہ موضوع سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جائے۔

لفظِ استشراق عربی زبان کا لفظ ہے، اس کا سہ حرفی مادہ '' ش-ر-ق'' ہے جس کے معنی ''روشن'' اور ''دمک'' کے آتے ہیں۔اس لفظ کو مجازی معنوں میں سورج کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔اسی طرح شرق اور مشرق، سورج طلوع ہونے کی جگہ کو بھی کہا جاتا ہے[1]۔

استشراق یہ ایک نیا لفظ ہے جو قدیم لغات میں موجود نہیں ہے۔انگریزی زبان میں لفظ شرق کے لیے Orientاور لفظِ استشراق کے لیے اورینٹلیزم اور لفظ مستشرق کے لیے اورینٹیلسٹ جیسے الفاظ استعمال کیے جاتا ہیں۔

> ''استشراق موجودہ مفہوم میں بھی عربوں میں کبھی اس کا استعمال نہیں رہا، بلکہ یہ لفظ غیر مسلم مفکرین کا وضع کردہ ہے جس کے لیے عربی میں 'استشراق' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ "Orient" بمعنی مشرق اور "Orientalism" کا معنی شرق شناسی یا مشرقی علوم وفنون اور ادب میں مہارت حاصل کرنے کے ہیں۔ مستشرق (استشرق کے فعل سے اسمِ فاعل) سے مراد ایک ایسا شخص ہے جو بتکلف مشرقی بنتا ہو''[2]۔

اس طرح جدید اصطلاح '' مستشرق'' کے حوالے سے محمد یوسف رامپوری اپنی کتاب ''تحریکِ استشراق'' میں لکھتے ہیں:

> ''مستشرق ایک ایسے غیر مشرقی عالم کو کہتے ہیں جو مشرقی علوم، ادب اور معاشرت وغیرہ میں دلچسپی رکھتا ہو، تاہم 'زلفو مدینہ' کے دیے گئے معانی اور لفظ کے عام استعمال کی روشنی میں مستشرق کے مفہوم کی مزید تحدید بھی ہو سکتی ہے جس کے پیشِ نظر مستشرق مغرب کے ایک ایسے عالم کو کہا جاتا ہے جو اسلام، اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت اور اسلامی زبانوں میں دلچسپی رکھتا ہو''[3]۔

---

[1] قاسمی، وحید زمان، **القاموس الوحید**، (لاہور: ادارہ اسلامیات،، 2021،)، ص: 859/1

[2] اصلاحی، شرف الدین، **مستشرقین، استشراق اور اسلام**، (اعظم گڑھ: معارف دار المصنفین، ۱۹۸۶ء)، ص ۴۸۔ ۵۰

[3] رامپوری، محمد یوسف، **تحریک استشراق**، (مجلہ دار العلوم دیوبند، مارچ ۱۹۸۸ء)، جلد 12، شمارہ 2، ص: ۳۴۔ ۳۵،

ایڈورڈ سعید (Edward Said) نے استشراق کو یورپین تہذیب و ثقافت کا جزوِ لاینفک قرار دیا ہے جو اس کے افراد کے تخیلات، نظریات اور دیگر تمام پہلوؤں پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے نزدیک استشراق کی تعریف میں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔ وہ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے:

> "Anyone who teaches, writes about, or researches the orient--and this applies weather the person is an anthropologist, sociologist, historian or philologist--either in its specific or its general aspects, is an orientalist, and what he or she says or does is orientalism"[1]-

یعنی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے کسی بھی شعبہ سے متعلق تحقیق کرنے والے کو مستشرق کہا جائے گا۔ ڈاکٹر احمد عبدالحمید غراب نے اپنی کتاب "رؤیۃ اسلامیۃ للاستشراق" میں استشراق کی متعدد تعریفات ذکر کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مغربی ممالک کے استعماری فکر کے حامل سکالرز، اپنی نسلی برتری کے نظریہ کی بنیاد پر مشرق پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اس کی تاریخ، تہذیب، ادیان، زبانوں، سیاسی اور اجتماعی نظاموں، ذخائرِ دولت اور امکانات کا جو تحقیقی مطالعہ غیر جانبدارانہ تحقیق کے عنوان سے کرتے ہیں اسے استشراق کہا جاتا ہے[2]۔

استشراق کی ذکر کردہ تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ مغربی اہلِ کتاب، مسیحی مغرب کی 'اسلامی مشرق' پر نسلی اور ثقافتی برتری کے زعم کی بنیاد پر مسلمانوں پر اہلِ مغرب کا تسلط قائم کرنے اور مسلمانوں کو اسلام کے بارے میں گمراہی اور شک میں مبتلا کرنے اور اسلام کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے عقیدہ، ثقافت، شریعت، تاریخ، نظام اور وسائل و امکانات کا جو مطالعہ غیر جانبدارانہ تحقیق کے دعوی کے ساتھ کرتے ہیں، اسے استشراق کہا جاتا ہے[3]۔

"استشراق" کی تمام تعریفوں میں مشرقی علوم کا ادراک حاصل کرنے کی قید لگائی گئی ہے لیکن راقم کے خیال میں تحریکِ استشراق اور مستشرقین کی تحدید جغرافیائی اعتبار سے نہیں ہو سکتی کیونکہ مستشرقین کا اصل ہدف اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں، خواہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ اسی مفہوم کو دورِ جدید کے اکثر محققین اور علماء نے اختیار کیا ہے۔
چنانچہ ڈاکٹر ابراہیم الفیومی لکھتے ہیں:

---

[1] Said، Edward *Orientalism*, (New York: Vintage,books 1979)1

[2] غراب، احمد عبدالحمید، **رویۃ اسلامیۃ للاستشراق** (الریاض: دارالاصالۃ للثقافۃ والنشر والاعلام، ۱۹۸۸ء)، ص: ۷۔۸

[3] ایضاً: ص ۹

''مشرق سے مراد جغرافیائی مفہوم نہیں بلکہ اس سے مراد زمین کے وہ خطے ہیں جن پر اسلام کو فروغ حاصل ہوا، خواہ وہ بلادِ مشرق سے خارج ہوں''[1]۔

البتہ دیگر تعریفات اس لحاظ سے درست قرار دی جاسکتی ہیں کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کا اصل مرکز مشرق ہی ہے اور یہیں سے اسلامی تہذیب و ثقافت نے جنم لیا۔

تحریکِ استشراق کے آغاز کی تاریخ، درحقیقت دینِ اسلام کے وجود کے ساتھ ہی وقوع پذیر ہو گئی تھی تاہم "Orientalism" کی اصطلاح یورپین زبانوں میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں رائج ہوئی۔ تحریک استشراق کے آغاز کے متعلق ہمیں متعدد آرا ملتی ہیں۔ بعض محققین کی رائے میں اس کا آغاز نویں صدی عیسوی میں ہوا جب 'اہلِ مالقہ' نے اسلامی ثقافت کو داغ دار کرنے کے لیے کلام، ادب اور احکامی کتب کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اس سلسلہ میں اچھا خاصا زرِ نقد صرف کیا[2]۔

دوسری رائے کے مطابق اس تحریک کی ابتدا دسویں صدی میں اس وقت ہوئی جب ایک فرانسیسی 'جریردی' اور 'الیاک' (1003-940) 'اشبیلیہ' اور 'قرطبہ' کی جامعات میں علومِ اسلامیہ پر دسترس حاصل کرنے کے بعد 999ء سے 1003ء تک پاپائے روم کے عہدہ پر متعین رہا[3]۔

بعض محققین کے نزدیک تحریکِ استشراق کا باقاعدہ آغاز تیرہویں صدی عیسوی میں ہوا جب الفونس دہم[4] نے 1269ء میں 'مریسلیا' میں تقابلِ ادیان کے حوالے سے ایک ادارہ ابو بکر رقوطی کے زیرِ نگرانی قائم کیا۔ اسی ادارے میں قرآن کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ کیا گیا، اسی عہد میں فریڈرک دوم (شاہِ سسلی) نے بھی اسلامی موضوعات پر مشتمل کتب کے تراجم کرائے اور ان کو یورپ کے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں بھیجا[5]۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاصر یہود و نصاریٰ کی مخالفت کے بعد سب سے پہلے جس نے اسلام کے خلاف اس تحریک کا آغاز کیا، وہ ساتویں صدی عیسوی کا ایک پادری جان (John) تھا جس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں طرح طرح کی جھوٹی باتیں گھڑیں اور لوگوں میں مشہور کر دیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

---

[1] الفیومی، محمد ابراہیم، **الاستشراق رسالۃ الاستعمار**، (قاہرہ: دار الفکر العربی، ۱۹۹۳ء)، ص: ۱۴۴

[2] دیاب، محمد احمد، **اضواء علی الاستشراق والمستشرقین**، (قاہرۃ: دار المنار، ۱۹۹۹ء)، ص: ۱۳

[3] ایضاً، ص: 13

[4] الفونس دہم (Alfonso X of Castile) 30 مئی 1252ء سے لے کر 1284ء میں اپنی موت تک مملکت لیون اور مملکت گالیسیا کا بادشاہ تھا۔

[5] ایضاً، ص: ۱۴

سیرت و شخصیت ایک دیومالائی کردار سے زیادہ دکھائی نہ دے۔' جان آف دمشق[1]' کی یہی خرافات مستقبل کے استشراقی علماء کا ماخذ و مصدر بن گئیں۔ اس نے حضرت زینب بنت جحشؓ اور زید بن حارثہ ؓ کے واقعہ کو ایک افسانہ بنا دیا[2]، یہی افسانے یورپ میں کلاسیکل موضوعات بن گئے اور آج تک مستشرقین کے محبوب موضوعات ہیں۔ جان آف دمشق کے بعد عیسائی دنیا کے بیسیوں عیسائی اور یہودی علما نے قرآنِ کریم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو کئی سو سال تک موضوع بنائے رکھا اور ایسے ایسے حیرت انگیز افسانے تراشے جن کا حقیقت کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان ادوار میں زیادہ زور اس بات پر صرف کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمی نہیں بلکہ بہت پڑھے لکھے شخص تھے، تورات اور انجیل سے اکتساب کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآنی عبارتیں تیار کیں۔ بہت بڑے جادوگر ہونے کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (العیاذ باللہ) حد درجہ ظالم، سفاک اور جنسی طور پر پراگندہ شخصیت کے حامل تھے۔ فرانسیسی مستشرق کاراڈی فوکس (Carra de Vaux) نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے بارے میں لکھا ہے کہ ''محمد ایک لمبے عرصے کے لیے بلادِ مغرب میں نہایت بری شہرت کے حامل رہے اور شاید ہی کوئی اخلاقی برائی اور خرافات ایسی ہو جو آپ کی جانب منسوب نہ کی گئی ہو''۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اسلام کی آمد سے کم و بیش سات آٹھ سو سال بعد تک مغربی ممالک میں اسلام کے خلاف نفرت ادھوری معلومات کی بنیاد پر ہی ہوتی رہی۔ مثال کے طور پر گیارہویں صدی عیسوی کے آواخر میں Song of Roland جو پہلی صلیبی جنگوں کے دوران ہی وضع کیا گیا اور بہت مشہور ہوا، اسی طرح کی بیہودہ باتوں پر مشتمل تھا[3]۔

مستشرقین کے علمی مصادر، اس تحریک کے آغاز اور اہداف و مقاصد کے متعلق قطعاً خاموش ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح مستشرقین اپنے مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کی حکمتِ عملی پر کاربند ہیں اسی طرح وہ اپنے نام کی بھی تشہیر نہیں چاہتے۔ یہ تحریک صدیوں مصروفِ عمل رہی لیکن اس تحریک کا کوئی باضابطہ نام نہ تھا۔ آربری کہتا ہے کہ Orientalist'' کا لفظ پہلی مرتبہ 1630ء میں مشرقی یا یونانی کلیسا کے ایک پادری کے لیے استعمال ہوا''۔ روڈنسن کہتا ہے کہ Orientalism ''یعنی استشراق کا لفظ انگریزی زبان میں 1779ء میں داخل ہوا اور فرانس کے کلاسیکی

---

[1] جان آف دمشق یا جان دماسکین (675-749) دمشق میں پیدا ہوئے یہ ایک عیسائی راہب اور پادری تھے۔

[2] رازی، فخر الدین، **تفسیر کبیر**، (بیروت، :دار احیاء التراث العربی، 1415ھ)، ص 5/ 425

[3] چوہدری، محمد اکرم، **استشراق**، (لاہور: اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، 1988ء)، ص: 567

لغت میں اس کا اندراج 1838ء میں ہوا حالانکہ عملی طور پر تحریکِ استشراق اس سے کئی صدیاں پہلے وجود میں آچکی تھی اور پورے زور وشور سے مصروفِ عمل تھی''[1]۔

جیسا کہ لفظِ Oreintalism کے حوالے سے آرٹیکل "Sufism in the Light of Orientalism" میں یوں بیان کیا ہے۔

> "The term "Orientalism" itself first appeared in the third decade of the 19th century in France and usually it referred to the European attitudes towards the Middle Eastern cultures. By extension, it covers the range of attitudes to all traditional and philosophical ideas of Asian countries. While used in many different senses, the word Orientalism" as a neutral descriptive term may simply mean the scholarly studies of the languages and texts of the Orient"[2] .

> ''اصطلاح "اورینٹلزم" خود پہلی بار انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ظاہر ہوئی۔فرانس اور عموماً اس نے مشرق وسطیٰ کے حوالے سے یورپی رویوں کا حوالہ دیا۔ثقافتیں توسیع کے ذریعہ، یہ تمام روایتی اور رویوں کی حد کا احاطہ کرتا ہے۔ایشیائی ممالک کے فلسفیانہ نظریات۔جبکہ بہت سے مختلف معنوں میں استعمال ہونے والا لفظ ایک غیر جانبدار وضاحتی اصطلاح کے طور پر "مشرقیت" کا مطلب محض علمی مطالعہ ہو سکتا ہے''۔

استشراق کی تحریک کو اٹھارہویں صدی عیسوی ہی سے کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔اس شہرت کی وجہ وہ تحقیقی مطالعات تھے جو اسلام کے دو بنیادی سرچشموں ''قرآن وحدیث'' اور خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مختلف کتابوں، رسالوں اور انسائکلوپیڈیا میں ان مغربی فضلاء نے پیش کیے تھے۔بعض اسباب کی بناء پر مستشرقین کی اس تحقیقات نے مسلم مفکرین کی توجہ کو بھی مبذول کیا۔چونکہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ تہذیبی پس منظر اور فکری رجحانات کے لحاظ سے یکساں نہ تھا اس لیے ان تحقیقات کے بارے میں تحسین و قدردانی اور ناپسندیدگی و بے احتیاطی دونوں طرح کے رد عمل پائے گئے۔

تحریکِ استشراق کے معرضِ وجود میں آنے کا سب سے بنیادی محرک دینی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور اقتصادی محرکات بھی کسی نہ کسی طریقہ سے شامل رہے ہیں۔

---

[1] الازہری، پیر کرم شاہ، **ضیاء النبیؐ**، (لاہور: مکتبہ ضیاء الاسلام، س۔ن)، ص: ۱۲۰،۶

[2] Uždavinys, Algis .Sufism in the Light of Orientalism , *Acta Orientalia Vilnensia* 6 , no.2 (2005):115-125.

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس کے چار محرکات کا تذکرہ کیا ہے:

ا۔استشراق کا سب سے بڑا مقصد مذہبِ عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو اور نئی نسل کیلیے مسیحیت میں کشش پیدا ہو۔

۲۔دینی محرک کے علاوہ سیاسی عنصر بھی قابلِ غور ہے جس کا مرکزی نقطہ مشرق میں مغربی حکومتوں اور اقتدار کے ہراول دستہ (Pioneer) کی موجودگی اور مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہنچانا ہے۔نیز ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم ورواج ،طبیعت ومزاج، طریقِ ماندوبود اور زبان وادب بلکہ جذبات ونفسیات کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات باہم پہنچانا ہے[1]۔

۳۔استشراق کا اہم محرک اقتصادی طور پر مضبوط ہونا ہے۔متعدد مغربی لوگ اس فکر کی ترویج میں اپنا کردار ادا کرکے مشرقیات اور اسلامیات کی کتابیں تحریر کرتے ہیں جن کی یورپ اور ایشیا میں بہت بڑی منڈی ہے۔اس ذریعہ سے وہ ناشرین سے ایک پیشہ وَر مستشرق کی حیثیت سے بہت سے مالی فوائد حاصل کرتے ہیں۔[2]

۴۔ان مقاصد کے علاوہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض فضلا مشرقیات واسلامیات کو اپنے علمی ذوق وشغف کے ماتحت بھی اختیار کرتے ہیں اور اس کے لیے دیدہ ریزی،دماغ سوزی اور جفاکشی سے کام لیتے ہیں جس کی داد نہ دینا ایک اخلاقی کوتاہی اور علمی ناانصافی ہے۔ان کی مساعی سے بہت سے مشرقی واسلامی علمی جواہرات ونوادر پردۂ خفا سے نکل کر منصہ شہود پر آئے۔متعدد اعلیٰ اسلامی مآخذ اور تاریخی وثائق ان کی محنت وہمت سے پہلی مرتبہ شائع ہوئے۔اس علمی اعتراف کے باوجود مستشرقین عمومی طور پر اہلِ علم کا وہ بدقسمت اور بے توفیق گروہ ہے جس نے قرآن وحدیث ، سیرتِ نبوی، فقہِ اسلامی اور اخلاق وتصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے اور بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آیا بلکہ اس کا عناد، اسلام سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ اور بڑھ گیا۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں[3]۔

مستشرقین اسلامی علوم میں تحقیق کے دوران اپنے اساسی مقاصد کو قطعاً نظرانداز نہیں کرتے ،وہ اسلامی ثقافت وتاریخ کو اس کے مقامِ رفیع سے گرانے، عیب دار کرنے اور اس کی اصل صورت اور حقیقت کو دھندلا کرنے میں اپنے تمام تروسائل بروئے کار لاتے ہیں تاکہ یورپ میں عیسائی معاشرہ اسلامی تعلیمات سے متاثر نہ ہونے پائے۔مستشرقین کے پیش

---

[1] ندوی، مولانا سلمان، **اسلام اور مستشرقین**، ص:42

[2] کھگہ، فیروزالدین شاہ، **مطالعہ اسلام اور استشراقی تنقیدات**، (لاہور: عکس پبلیکشنز، 2019)، ص:19

[3] ایضا: ص: ۱۴

نظر جہاں یورپ میں دخولِ اسلام کی شرح میں اضافہ اور مسیحی معاشرے کے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس کو قبول کرنے کے متعلق خوف وہراس اور خدشات کے بادل سایہ فگن ہیں، وہاں چند اہم اور مرکزی اہداف بھی ہیں جن کو سمجھنے کے بعد ہم یہ رائے قائم کرنے میں بالکل حق بجانب ہوں گے کہ مستشرقین اس نام نہاد تحقیق کے پردہ میں اسلام اور اہلِ اسلام میں فتنہ وفساد اور فکری وذہنی انتشار پیدا کرنے کے درپے ہیں۔ ساتھ ہی ہم پر اہلِ استشراق کے قرآن اور اس کی قراءات کے متعلق کیے گئے اعتراضات کی حقیقت بھی واضح ہو گی جن کا علمی زاویوں سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مستشرقین اسلام میں طعن اور عیوب تلاش کرنے اور اس کے حقائق کی تحریف کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں تاکہ وہ مسیحی دنیا کو یقین دلا سکیں کہ اسلام ایک منتشر، متنازعہ اور جامد دین ہے۔[1] اس میں لچک (Flexibility) نہیں اور نہ ہی یہ تہذیبِ حاضر اور تقاضوں کا ساتھ دے سکتا ہے۔ انہی عنوانات سے وہ مسلمانوں کے قلوب وعقائد پر بھی دستک دیتے ہیں اور متعدد شکوک وشبہات پیدا کر کے ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کی فوقیت اور دیگر پہلوؤں سے اپنے مذہبی، مشنری اور سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے فضا کو سازگار کرتے ہیں۔ غرض مستشرقین اسلام کی تعلیمات اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں دشمنی کی روح پیدا کر کے تجربات کرتے ہیں اور اسلام کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ ایک ایسا جامد دین ہے جو زمانہ کے ارتقائی مدارج کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔[2]

اسلام کے متعلق اوہام اور تشکیک پیدا کرنا مستشرقین کے اہم مقاصد میں سے ہے اور وہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مختلف اقدامات کرتے ہیں۔ متعدد مستشرقین کی ابحاث اسی نظریہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس حوالہ سے ان کے چند نکات عام طور پر مروج ومشہور ہیں۔ مثلاً اسلامی تعلیمات میں وقت کے تقاضوں کے مطابق اصلاح اور جدت کی ضرورت ہے اور روایت پسندی، رجعت پسندی اور دقیانوسیت پر مبنی تعلیمات کو ترک کرنا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں وہ مغرب کے علمی اور سائنٹیفک انداز کو اپنانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مستشرقین اسلام میں ایک ایسے اجتہاد کا تصور دیتے ہیں جو کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے بالکل بے نیاز ہے۔ حدیث اور سنت کو عقلی دلائل کے ذریعہ غیر ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس صورتِ حال میں ظاہر ہے کہ دین کا جو نقشہ سنت کو خارج کر کے معرضِ وجود میں آئے گا، اس میں قرآن کو ذاتی اغراض کی خاطر من مانے معانی پہنائے جا سکیں گے۔[3]

---

[1] الخربوطلی، علی حسنی، **المستشرقون**، (بیروت: مکتبۃ العصریۃ صیداء، ط۴، ۱۳۹۰ھ) ص: ۸۳

[2] کھگہ، فیروز الدین شاہ، **مطالعہ اسلام اور استشراقی تنقیدات**، ص:32

[3] ندوی، مولانا سلمان، **اسلام اور مستشرقین**، ص: ۲۲

مولانا شمس الحق افغانی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''اب مستشرقین نے اسی نصب العین (تشکیک) کی تکمیل کے لیے حربی اور سیاسی میدانوں کو ناکافی سمجھ کر علمی میدان میں قدم رکھا اور استشراق کے اسلحہ سے مسلح ہو کر مسلمانوں کے یقین کو کمزور کرنے اور تشکیک کا زہر پھیلانے کے لیے اسلامی تحقیق کے نام سے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کر کے تصانیف لکھنی شروع کیں تاکہ اپنے مقصد میں اس راہ سے کامیاب ہو سکیں''[1]۔

اسلامی شریعت کے قوانین کو بھی مستشرقین نے بڑی غیر واقعی نظر سے دیکھا ہے۔اس سلسلہ میں وہ آئمہ مجتہدین پر نقد کی غرض سے جدید دور کے مغرب پرست اور مغرب سے مرعوب افراد کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ مسلمانوں کو دین اسلام کے قوانین میں سختی اور غیر معقول زاویوں کی نشان دہی کرواتے ہیں اور اس پس منظر میں وہ یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ اسلام کے ان وضعی قوانین کو تبدیل کیا جائے جن میں دراصل امت کے لیے خیر اور بھلائی پوشیدہ ہے[2]۔

سنتِ نبویہ کی صورت کو دھندلا کرنے کی کوشش میں بھی کئی وسائل استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں گولڈزیہر اور 'شاخت' اس قبیلہ کے زعما میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے سنت کے حوالے سے شبہات اٹھائے اور ان کے بعد متعدد مستشرقین نے اس کو اپنا موضوعِ بحث بنایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سب انہی کے خوشہ چین تھے۔احادیث پر شبہات کے ضمن میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ گولڈزیہر اور شاخت نے مصادرِ اسلامیہ کو سامنے رکھنے کی بجائے 'کتاب الاغانی'، کتاب الحیوان اور قصے کہانیوں کی کتب کو احادیث کا مصدر مقرر کیا ہے اور شاید یہود و نصاریٰ اس سے بڑھ کر کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ مقام ان شبہات کے بیان کرنے کا نہیں البتہ یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس ضمن میں ان کا ہدف صرف مسلمانوں کے ذہنوں میں جھوٹے اقوال و خیالات سے انتشار پیدا کرنا ہے، وگرنہ یہ اعتراضات حقائق و دلائل اور براہین سے بالکلیہ عاری ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت بھی ہمیشہ سے ہی کفار اور اعداءِ اسلام کی تنقید کا ہدف رہی ہے۔ان کے بقول اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیرہ راہب سے جب ملے تو کچھ عرصہ ان سے دینی تعلیمات سیکھتے

---

[1] افغانی، مولانا شمس الحق، **علوم القرآن**، (لاہور: مکتبہ اشرفیہ)، ص: ۱۲۰

[2] محمد حسین، **الاتجاہات الوطنیۃ فی الادب المعاصر**، (بیروت: موسسۃ الرسالۃ، س۔ن)، ص: ۱/۵۹

رہے۔ دوسرا بنیادی اعتراض آپ کی شخصیت کے حوالے سے تعدد ازدواج کا ہے۔ اس قضیہ کو بھی وہ آپ کی شخصیت میں طعن کا ذریعہ بناتے ہیں اور دین میں تشکیک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں [1]۔

اسلامی تاریخ کی تحریف میں بھی مستشرقین نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے اور جس سطح تک اس کی ثقافت اور بنیادوں کو حقیقی انداز سے بدل کر پیش کر سکتے تھے، اس میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تاریخِ اسلامی کی مبادیات اور اس کے متعلق غلط معلومات کو پھیلا کر وہ دراصل یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ انسانی تہذیب کی تاریخ میں اسلام کا کوئی کردار نہیں [2]۔

حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین کافی عرصہ سے اس مقصد کے حصول کے لیے تگ ودو کر رہے ہیں اور اسلام کے روشن زاویوں کو دھندلا کرنے کے درپے ہیں تاکہ وہ بنیاد جو جمہور مسلمان علما نے قائم کی ہے، اس کو گرا دیا جائے اور اسلامی تاریخ کی ایک نئی بے معنی شکل پیدا کی جائے [3]۔

ان تمام نکات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی شواہد کے اعتبار سے یہ کہنا بجا ہو گا کہ کچھ مغربی مسافر جب ملک اندلس ترقی کے اعلیٰ منازل طے کر رہا تھا اس وقت ان راہوں نے اندلس کا سفر کیا اور ان کے دینی تعلیمی اداروں میں مختلف علوم کی تعلیم حاصل کرنے لگ گئے۔ انھوں نے مختلف علوم و فنون خصوصاً فلسفہ، طب اور ریاضی کی تعلیم علمائے اسلام سے حاصل کی اور قرآن کریم اور دیگر عربی کتابوں کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا اس طرح استشراق کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے پس منظر کو مختصر طور پر بیان کیا جائے تو اس حوالے سے اس پس منظر کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ استشراق کا پس منظر، دینی، سامراجی، تجارتی سیاسی اور علمی پس منظر دکھائی دیتا ہے جن کو درج بالا میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے اور اگر ان کے مقاصد کی طرف ذرا نظر کی جائے تو اس حوالے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مقاصد میں پُر فریب علمی مقصد، دینی و سیاسی اغراض و مقاصد اور خالص علمی اغراض و مقاصد شامل ہیں جن کی طرف اشارہ کی گیا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ امتِ مسلمہ عموماً اور علمائے دین خصوصاً، مستشرقین اور ملحدین و متجددین کے ساتھ اس علمی محاربہ میں اپنے زاویۂ نگاہ کو وسعت دیتے ہوئے خالص علمی و تحقیقی رسوخ حاصل کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس ضمن

---

[1] حکیم، محمد طاہر، **السنۃ فی مواجہۃ الاباطیل**، (مکہ: منشورات دعوۃ الحق، رابطۃ العالم الاسلامی، ۱۴۰۲ھ)، ص: ۳۸۔ ۳۹۰

[2] فتح اللہ، عبدالستار، **الغزو الفکری والتیارات المعادیۃ للاسلام**، (الریاض: مکتبۃ المعارف، ط ۲، ۱۳۹۹ھ)، ص: ۲۶

[3] غزالی، محمد، **دفاع عن العقیدۃ والشریعۃ**، (مصر: دار الکتب الحدیثۃ، ط ۳، ۱۳۸۴ھ)، ص: ۱۳۔ ۱۴

میں سب سے بنیادی ذمہ داری محققین کی ہے کہ وہ اداروں میں بنیادی اسلامی مصادر کے تعارف کے ساتھ ساتھ ''تحریکِ استشراق'' کا تفصیلی مطالعہ اور جدید اصولِ تحقیق و تصنیف بھی شاملِ نصاب کریں کیونکہ کالج، یونیورسٹی کے طلبہ میں علومِ دینیہ کی تربیت کرنے سے یہ لوگ علومِ دینی سے قریب ہوں گے اور اس سے، تحریکِ استشراق کا مضبوط سدِ باب کرنے کی بہتر صلاحیت ہو گی۔ ہمیں اس حقیقت کے اعتراف میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ علوم دینیہ کے طلبہ، تمام تر صلاحیتوں کے باوجود، مغرب سے اٹھنے والی کسی قسم کی شورش و تحریک کا جواب دینا تو کجا، اس کے تعارف سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں، اولاً اداروں میں علومِ دینیہ کا نصاب تشکیل دینے والے ذی قدر محققین اور ثانیاً اساتذہ کو اس اہم حقیقت پر فوراً عمل درآمد کرتے ہوئے کم از کم ایک سمسٹر کے لیے ''الاستشراق'' کورس کو لازمی قرار دینا چاہئے تاکہ یہ قومی ادارے اسلامی اقدار کے حقیقی محافظ ثابت ہو سکیں۔

فصل دوم: مستشرقین کا صوفی ازم سے تعلق

ایرانی شاعری چونکہ مستشرقین کی دلچسپی کا مرکز تھی جب کہ ایرانی شاعری کا ایک بڑا حصہ صوفیانہ افکار پر مشتمل ہے، لہذا اس سے مستشرقین کا صوفی ازم سے تعلق قائم ہوا۔اس کے ساتھ ساتھ صوفی ازم یا تصوف کی تاریخ لکھنے میں ان مغربی سیاحوں کا کردار بھی ہے جو مشرق کی سیر وسیاحت کے لیے نکلتے تھے۔اس عرصے میں ان مغربی سیاحوں کے لیے صفوی سلطنت کا دو سو سالہ دور دلچسپی کا مرکز رہا۔ان سیاحوں نے ایران اور دیگر مشرقی ممالک کی سیر و سیاحت کے بعد سفر نامے لکھے، جن میں انھوں نے اس سفر کے دوران اپنے مشاہدات وتاثرات کو بیان کیا اور ان جزوی معلومات کا ذکر بھی کیا، جو انھیں مختلف خانقاہوں اور تہذیبی و ثقافتی مراکز کو دیکھنے اور معائنہ کرنے کے دوران حاصل ہوئیں۔انھیں جو معلومات ملیں وہ لکھتے گئے اور اپنے سفر نامے میں روداد کے طور پر شائع کرتے رہے۔یہ مواد بعد میں مستشرقین کے لیے ابتدائی لٹریچر کے طور پر کام آیا۔ان مغربی سیاحوں میں تاجر اور سفارت کار بھی شامل تھے، جو سفر کے اختتام پر اپنے مشاہدات پر مشتمل ایک رپورٹ یا سفر نامہ لکھتے تھے۔

مغرب کے ان سیاحوں اور تہذیب و ثقافت کے سفیروں میں انتھونی جیکسن Anthony Jackson(1562)، تھامس الیک Thomas Eleck(1564)، رچرڈ چیمی Richard(1564)، جان نیو بری John Newbery (1580)، اس طرح کے اور کچھ لوگ سر فہرست ہیں۔ان کے سفر نامے مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔

مستشرق سیاحوں، تاجروں اور سفارتکاروں نے جہاں جہاں سیاحت اور قیام کے دوران جو معلومات اکٹھی کیں وہ سب یورپ کی مختلف زبانوں میں شائع کرنے کا موقع ملا اور یہ تمام سفر نامے یورپ کے مختلف زبانوں میں شائع ہو کے ان کے دسترس میں آگئے جو بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے خصوصاً ان محققین لیے جو پڑھنے لکھنے کا شغف رکھتے ہیں ان محققین اور دانشوروں کے لیے یہ مواد اور سفر نامے بنیادی منبع قرار پایا۔جس کے نتیجے میں بہت سی کتابیں اور لٹریچر شائع ہوئیں۔ان تصانیف اور لٹریچر جو ان سفر ناموں سے منظر عام پر آئے وہ تصانیف باقی دنیا میں تاثر پھیلانے میں کامیاب ہوئے کہ تصوف سرزمینِ ایران سے جنم لیا ہے۔اس طرح مستشرقین سے یہ تاریخی غلطی سرزد ہوئی کہ تصوف کا منبع ایران کی تہذیب و ثقافت اور ان کے شاعری کے اندر جو صوفیانہ افکار ہے اس کا نتیجہ ہے۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ یورپ اور عالم اسلام کے درمیان کافی عرصہ جنگ وجدل کا سماں رہا۔ان میں صلیبی جنگیں وغیرہ شامل ہے کہ صلیبی جنگیں تقریباً دو صدیوں پر محیط رہیں۔ان جنگوں کے دوران یعنی دو سو سال یورپ اور اسلام میں رابطہ منقطع رہا۔ صلیبی جنگوں کے خاتمے کے بعد سولہویں صدی عیسوی میں یورپ اور عالم اسلام کا منقطع رابطہ بحال ہوا۔ لیکن ان کے تعلقات عرب ممالک کی بجائے ایران سے بحال ہونے لگے۔ رابطہ بحال ہونے کے بعد اہل یورپ کا ایران کے ساتھ لین دین اور ایک دوسرے کی طرف آنے جانے کا سلسلہ جاری ہوا۔ تو اہل یورپ کے لوگ ایران آکر وہاں کی زبان فارسی سیکھنی شروع کر دی۔ فارسی زبان سیکھنے کے بعد ان کی رسائی ایرانی علمی کتب، شخصیات اور دیگر افراد خاص کر شعراء حضرات تک ہوئی۔ وہ ایرانی فلاسفہ اور شعراء کی مدد سے ایرانی ثقافت سے آشنا ہوئے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی ایرانی صوفیاء سے بھی آشنائی ہوئی۔ایرانی ثقافت سے آگہی حاصل کرنے کے لیے مختلف مقامات کی طرف گئے۔ ان مقامات میں سے ایک مقام وہاں کی خانقاہیں تھیں انہوں نے ان خانقاہوں کو دیکھ کر اور ان کے نظام کو سمجھنے کی کوشش کی ۔اس عرصے میں ان کے علمی اور تحقیقی وسائل و مآخذ صرف ایرانی مصادر تک محدود رہے۔

ان کی معلومات کا ذریعہ فارسی کتابیں، ایرانی اہل فکر و دانش، ادبی و علمی شخصیات، فلاسفہ، شعراء اور ایران کے صوفیاء تھے۔ حصولِ علم کا کوئی بھی غیر ایرانی ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا۔ بعض عرب شعراء اور فلاسفہ کے علاوہ ان کا ارتکازِ توجہ ایرانی فلاسفہ اور ایرانی شاعری ہی رہی۔ علم کے دوسرے ذرائع تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے انھیں تصوف کا سرچشمہ بھی ایرانی فلسفے میں ہی نظر آیا۔

اس حوالے سے این میری شِمل لکھتی ہے:

> "Most of information about oriental spirituality,however was derived from the translations of Persian classical poetry saadi's Gulistan has been one of the favorite books of European intellectuals since Adam Olearius produced its complete translation into German in 1651."[1]
>
> مشرقی روحانیت کے بارے میں زیادہ تر معلومات- فارسی کلاسیکی شاعری سعدی کے گلستان یورپی دانشوروں کی پسندیدہ کتابوں میں سے ایک ہے- کے تراجم سے حاصل کی گئی ہیں۔جب سے ایڈم اولاریئس نے 1651 میں جرمن زبان میں اس کا مکمل ترجمہ تیار کیا تھا۔

[1]Schimmel Annemarie, *Islam an Introduction*,(USA: State University of New York.1992), 32.

ان مستشرقین نے تصوف کی تاریخ، ارتقاء اور اس کے نظریات و تعلیمات بھی ایرانی صوفیاء، علماء، کتب، کلچر، خانقاہوں اور ان خانقاہوں کو آباد کرنے والوں کے معمولات سے اخذ کیے، چنانچہ ان معاملات کو ایرانی نظر سے دیکھا اور حاصل ہونے والی معلومات کو یکجا کر کے اپنی کتب میں تحریر کر دیا۔ ان کتب سے جو معلومات کم یا زیادہ دستیاب ہوئیں، مد مقابل درست معلومات نہ ہونے کی وجہ سے انھیں قبولِ عام مل گیا۔ ان معلومات کے قبول کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وقت تحقیق اور ریسرچ کا نہیں تھا یا اگر تحقیق تھی بھی تو اسے زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے کے لیے درکار وسائل کم تھے۔ لہٰذا لوگ کم علم اور سہل پسند ہونے کی بناء پر انہی معلومات پر اکتفا کرتے تھے اور غیر مستند کو مستند مان لیتے تھے۔ یورپی مفکرین نے ایران کے سفر کے بعد دوسرے سفر نامے مرتب کیے اور کتابیں لکھیں جو چھپ بھی گئیں لیکن مسلمانوں کے پاس صحیح معلومات جاننے کے لیے کوئی دوسرا ماخذ موجود نہیں تھا جس سے شواہد ملتے اور حقائق کی تصدیق کی جاسکتی۔ پروفیسر آربری نے 1942 میں اسلامی تصوف پر اپنے لیکچرز میں اشارہ کیا تھا کہ اس وقت اسلامی تصوف کے مصادر اصلیہ دستیاب نہیں ہے، جس کی وجہ سے تصوف پر صحیح رائے قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس طرح مستشرقین کا صوفی ازم سے تعلق ہوا۔

جب یورپ کا ایران کے ساتھ رابطہ قائم ہوا تو اس وقت ایران میں صفوی حکومت تھی، جس کے بانی صفی الدین تھے۔ ایران میں اسلامی فتوحات کے بعد جو سب سے بڑی حکومت قائم ہوئی وہ 1501ء سے 1722ء تک قائم رہنے والی صفوی سلطنت (Safavid Empire) تھی۔ جس نے تیموریوں کے بعد ایران میں عروج حاصل کیا۔ اس حکومت کا بانی شاہ اسماعیل ایک بزرگ شیخ اسحاق صفی الدین (متوفی 1334ء) کی اولاد میں سے تھا چنانچہ انہی بزرگ کی نسبت سے یہ خاندان صفوی کہلاتا ہے[1]۔

بہت سے مستشرقین جو اس زمانے میں ایران آئے، انھوں نے لکھا ہے کہ صفوی دراصل نظامِ تصوف کی توسیع ہے اور در حقیقت یہ ایک صوفی سلطنت ہے۔ صفوی ایک صوفی طریقہ ہے جو غلبہ پا کر اقتدار، حکومت اور سلطنت میں بدل گیا ہے۔ اس طرح یہ پورا دور صوفی سلطنت کا دور تھا۔ چونکہ مستشرقین یورپ سے سیاح کے طور پر آئے تھے اور انھیں تصوف کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا، لہٰذا انھیں اپنی سیاحت کے دوران جو کچھ سمجھ آئے اسے اپنے مشاہدات و تاثرات

[1] https://www.britannica.com/ 1234/Safavid Empire (Accessed 14-03-2022)

کے طور پر سفر ناموں میں تحریر کرتے جو بعد ازاں یورپ میں لکھنے والوں کے لیے اس موضوع پر بنیادی لٹریچر بن رہا تھا۔اس طرح تصوف کو سمجھنے میں مستشرقین نے صفوی سلطنت سے کافی مدد لیا[1]۔

مستشرقین کا تصوف سے تعلق صفوی حکومت کے توسط سے ہوا کیونکہ مستشرقین اور خود اہل ایران کی تحقیق کے مطابق صفوی سلطنت کا بانی صفی الدین بہت بڑا صوفی تھا۔جب صفی الدین حکمران بن گیا تو اس سے وابستہ اور منسلک لوگ صفوی کہلانے لگے۔اس طرح ان کا طریقہ، تصوف میں صفوی طریقہ کہلانے لگا۔صفوی دورِ حکومت تقریباً دو صدیوں پر محیط تھا۔صفی الدین کے بعد اس سلسلے کے متعدد بادشاہ آئے، جو صفوی طریقے میں صوفی تصور کیے جانے لگے، جن میں چند نام مشہور تھے۔جیسے 1501ء میں شاہ اسماعیل جس کا زمانہ 1524 تک رہا۔دوسرا نام شاہ عباس اول کا تھا،اس کا دور خاندان صفویہ کا عہد زریں ہے۔محمد خدابندہ کے بعد جب وہ ایران کے تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر صرف 17 سال تھی۔ ایران کے شمال مغربی حصوں پر عثمانی ترک قابض تھے اور مشرق میں خراسان ازبکوں کے قبضے میں تھا یا ان کی تخت وتاج کا ہدف بنا ہوا تھا۔اندرون ملک بھی بے امنی تھی اور صوبوں کے امراء سرکشی اختیار کیے ہوئے تھے۔عباس نے اس صورت حال کا بڑے تدبر اور ہوشیاری سے مقابلہ کیا۔اس نے سب سے پہلے ترکوں سے معاہدہ کر لیا اور آذربائیجان، گرجستان اور لورستان کا ایک حصہ اُن کے حوالے کر دیا۔اس طرح عثمانی ترکوں کو ایک حد تک مطمئن کر دیا۔مغربی سرحد سے مطمئن ہونے کے بعد شاہ عباس نے خراسان کی طرف توجہ کی۔ازبکوں کا طاقتور حکمران عبداللہ خان 1598ء میں مر چکا تھا۔ اس لیے شاہ عباس نے اسی سال آسانی سے ازبکوں کو خراسان سے نکال دیا اور صفوی سلطنت کی حدود ہرات اور مرو تک وسیع کر دی۔جس کا دور سلطنت 1588 سے 1629ء تک پھیلا ہوا تھا[2]۔

ان تمام حکمرانوں میں سب سے بڑا نام خود صفی الدین کا تھا۔مستشرقین نے ان بادشاہوں کے نام اپنے سفر ناموں میں صوفیائے عظام یا اجل صوفی کے طور پر لکھے ہیں۔مستشرقین کے لٹریچر میں یہ تاثر ہر جگہ نظر آتا ہے۔صفوی دورِ حکومت چونکہ دو صدیوں پر محیط تھا اس لیے جب مستشرقین نے صفی الدین اور دیگر چند بڑے بادشاہوں کو اجل صوفی کا لقب دیا تو بعد میں آنے والے محققین کے لیے دلچسپی بڑھ گئی اور وہ سمجھے کہ تصوف کی ابتداء ہی صفی الدین سے ہوئی ہے اور صفوی حکومت کا پورا دور صوفی ازم کا دور ہے۔

---

[1] قادری، محمد طاہر، **تصوف اور مستشرقین**، (لاہور: منہاج القرآن پبلشرز، 2019ء)، ص:43

[2] https://mimirbook.com/ur/Safiyud din/saltanat (Accessed 14-03-2022)

چنانچہ وہ صفوی سلطنت کا اس زاویے سے مطالعہ کرتے اور اس دور کی خانقاہوں، ثقافت اور طریقے کو تصوف کے تناظر میں دیکھتے ہیں اس طرح تصوف کے بارے میں ان کی یہ رائے بننا شروع ہو گئی کہ تصوف کیسے وجود میں آیا؟ صفوی سلطنت کے بادشاہوں کو اجل صوفی کا لقب دینا اتنا مشہور ہوا کہ بہت بعد تک برطانوی فکر و دانش پر اس کا اثر رہا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اجل صوفی Grand Sufi کے اس تصور کو ولیم شکسپئر Waliam Shakespear نے اپنے مشہور ڈرامے Twelfth Night میں بھی اس کو بیان کیا[1]۔

ان تمام نکات کی روشنی میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ تصوف کے ساتھ مستشرقین کا کیا اور کیسے تعلق رہا ہے۔ اگرچہ صفوی سلطنت صوفیاء کی حکومت سمجھی جاتی تھی، مگر بنیادی طور پر یہ سلطنت تصوف کی فکر کی آئینہ دار نہیں تھی۔ بادشاہوں اور شہنشاہوں کو اکثر اپنی رعایا سے خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں وہ منظم ہو کر ان کی سلطنت کے لیے خطرہ نہ بن جائے، صفوی حکومت کے بادشاہوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ لوگوں نے بادشاہوں کو یہ احساس دلایا کہ چونکہ آپ کے دور حکومت میں صوفیاء کو آزادی حاصل ہے، لہٰذا وہ ان کی حکومت کے لیے خطرہ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح پوری سلطنت کو صوفیاء کے خلاف کر دیا، یہاں تک کہ صوفی ذہن کے لوگ آہستہ آہستہ کم ہو گئے۔

چند یورپی تحقیقات جو بعد میں مغربی محققین کے لیے تصوف کی بنیاد بنیں۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں جب سے یورپ اور ایران کے تعلقات بحال ہوئے تب سے مختلف اوقات میں مختلف مغربی اسکالرز، تاجر اور سیاح یہاں آتے رہے اور یہاں کے تہذیب و ثقافت کو پڑھ کر اس پر کتابیں لکھتے رہے جو بعد میں اہل یورپ کے لیے مآخذ بنیں۔ ان میں سے چند اہم شخصیات اور ان کی تحقیقات کو ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

اروش بیگ (Uruch Beg)

یہ حقیقت ہے کہ جب سے انسان وجود میں آیا ہے، تب سے انسانیت کے کچھ اہم حقائق تمام اقوام، تہذیبوں، ثقافتوں اور ممالک میں مشترک ہیں۔ ان مشترکات کی بناء پر ایک تہذیب دوسری تہذیب میں گھل مل جاتی ہے۔ جیسا کہ اروش بیگ ایک ایرانی تھا بعد میں یورپ منتقل ہونے کے بعد اس نے کچھ تصانیف تحریر کی اور یہی تصانیف بعد میں اہل یورپ کے لیے تصوف کی بنیاد بنی۔

---

[1]Shakespeare, William,*Twelfth Night* (USA:D.C.Heath and Company,1916),187.

"Uruch Beg (also spelled Oruch), later known by his baptized name of Don Juan (1560–1604) was a late 16th and early 17th century Iranian figure in Iran and Spain. He is also known as Faisal Nazary. A native of Iran, and from the Bayat Qizilbash clan"[1].

"اورش بیگ (اورچ بھی تلفظ کیا جاتا ہے)، جسے بعد میں ڈان جوان (1560-1604) سے جانا جاتا تھا، ایران اور اسپین میں 16ویں صدی کے آخر اور 17ویں صدی کے اوائل میں ایک ایرانی شخصیت کے طور پر ابھری۔ انہیں فیصل نظری کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جسکا تعلق ایران اور قزلباش قبیلہ سے تھا۔"

"He later moved westward, settled in Spain, and became a Roman Catholic. There he wrote an account of Iran, his involvement there with Shah Abbas I, and his journey to Spain in the Persian embassy to Europe (1599-1602). He was killed in 1604 during a street fight.Don Juan was the son of Sultan Ali Beg, who was the brother of the Iranian ambassador Husain Ali Beg"[2].

اروش بیگ بنیادی طور پر ایرانی مسلمان تھا۔ 1560ء میں صفوی حکومت نے اسے اپنا سیکریٹری بنا کر یورپ بھیجا۔ اروش بیگ ان چار سیکرٹریوں میں سے تھا، جنھیں صفوی حکومت نے یورپ کی طرف سیکریٹری بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے 1602ء اور 1603ء کے درمیانی عرصے میں سپین میں قیام کے دوران اسلام چھوڑ کر رومن کیتھولک مسیحی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ مذہب تبدیل کرنے کے بعد یورپی لٹریچر میں اس کا نام اروش بیگ کا نام ڈان جوئین ملتا ہے ، ڈان جوئین نے بھی اسلام، اس کی ثقافت، تصوف اور صوفیاء کے بارے میں Relaciones de Don juan de Persia کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس نے یورپ کو اسلام اور اس کی ثقافت پر بنیادی مواد مہیا کیا۔ اس طرح مستشرقین نے اس کتاب کو پڑھا اور تصوف کے بارے میں اپنے خیالات کو قلم بند کیا۔

تھامس ہربرٹ (Thomas Herbert)

تھامس ہربرٹ ایک برطانوی سفیر کے طور پر کچھ عرصہ ایران اور دوسرے ملکوں میں سفر کرتا رہا۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے ایک سفر نامہ لکھا جو مختلف ادوار میں شائع ہوتا رہا، اس طرح یہی سفر نامہ یورپ کے لیے بنیاد بنی۔

"Herbert was born to a Yorkshire family Several of Herbert's ancestors were aldermen and merchants in that area such as his grandfather and benefactor, Alderman Herbert (d. 1614) and they traced a connection with the Earls of Pembroke. After attending Tonbridge School, he is said to have studied at Trinity College, Cambridge, and Jesus College, Oxford (1621), but

[1] Fisher, et al. *The Cambridge History of Iran*,(London:Cambridge University Press.1960),387.
[2] W. E. D. Allen,*Bulletin of the School of Oriental Studies*,(London: University of London ,1930),179-186.

afterwards removed to Cambridge, through the influence of his Uncle Dr Ambrose Akroyd"[1].

ترجمہ: ہر برٹ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا جن کے آباؤاجداد اس علاقے میں اور تاجر تھے جیسے کہ اس کے دادا اور خیر خواہ، ایلڈرمین ہر برٹ (متوفی 1614) اور انہوں نے ارلز آف پیمبروک سے تعلق قائم کیا۔ ٹونبرج اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد، کہا جاتا ہے کہ اس نے ٹرنیٹی کالج، کیمبرج، اور جیسس کالج، آکسفورڈ (1621) میں تعلیم حاصل کی، لیکن اس کے بعد اپنے چچا ڈاکٹر ایمبروز کے اثر ورسوخ سے کیمبرج چلے گئے۔

ابتداء ہی سے تھامس ہر برٹ کو تحقیق کا شوق تھا اس وجہ سے وہ کسی ایک جگہ نہیں رہتا تھا بلکہ مختلف ملکوں اور جگہوں پر تحقیق کے حوالے سے سفر کیا جاتا تھا اور مختلف ملکوں میں اچھے اچھے پوسٹ پر بھی اس کا تعیینات ہوئے۔ 1629 تک اسے برطانوی حکومت کی طرف سے ایران میں بحیثیت سفیر کام کرنے کا بھی اسے موقع ملا۔

In 1627 William Herbert, 3rd Earl of Pembroke, procured his appointment in the suite of Sir Dodmore Cotton, then starting as ambassador for Persia with Sir Robert Shirley. Sailing in March they visited the Cape, Madagascar, Goa and Surat; landing at Gambrun on the Persian coast (10 January 1628), they travelled inland to Ashraf and thence to Qazvin, where both Cotton and Shirley died, and whence Herbert made extensive travels in the Persian hinterland, visiting Kashan, Baghdad and Amol. On his return voyage Herbert touched at Ceylon, the Coromandel Coast, Mauritius and St Helena. He reached England in 1629, travelled in Europe in 1630–1631, married in 1632 and retired from court in 1634 (his prospects perhaps blighted by Pembroke's death in 1630); after this he resided on his Tintern estate and elsewhere until the English Civil War, when he sided with Parliament.He later published an account of his travels[2].

تھامس ہر برٹ (1606۔1682) 1627ء میں ایران پہنچا اور 1629ء تک بطور برطانوی سفیر ایران میں قیام پذیر رہا۔ اس کے بعد بھی یہ ایران میں آتا جاتا رہا، مگر 1634ء میں وہ دوبارہ لندن ہی میں مقیم ہو گیا۔ 1627 سے 1629 تک دو سال قیام کے علاوہ وہ 1629 سے 1634 کے درمیانی عرصہ میں بھی ایران آتا جاتا رہا اور اس دوران اس نے Travels in Persia کے نام سے اڑھائی سو صفحات پر مشتمل ایک سفر نامہ لکھا، جو مختلف اوقات میں شائع ہوتا رہا ہے۔ بعد میں سر ولیم فاسٹر نے اس سفر نامہ کا دیباچہ لکھا اور اسے ایک اہم کتاب کا درجہ ملا۔ اس نے بڑی باریک بینی سے ایرانی ثقافت کا مشاہدہ کیا، لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور مشاہدات سے جو کچھ حاصل

[1] Chisholm, Hugh. "Herbert, Sir Thomas". *Encyclopædia Britannica*, (LondonCambridge University Press,1911), Vol. 13 (11th ed.), 340.
[2] ibid.,

کیااسے اپنے سفر نامے میں جمع کیا۔اس طرح مستشرقین نے ان سفر ناموں کو پڑھااور تصوف اور اسلامی ثقافت کے بارے میں آشنائی حاصل کیا۔

ڈاکٹر جان فرائر(Dr John Fryer)

مختلف مغربی اسکالرز،تاجر اور سیاح جب سفر کرتے تھے تو وہاں کے تہذیب و ثقافت کو پڑھ کر اس پر کتابیں لکھتے تھے جو بعد میں اہل یورپ کے لیے مآخذ بنیں۔ان چند اہم شخصیات میں سے ایک ڈاکٹر جان فرائر ہے:

"Fryer was the oldest son of William Fryer of London. On 13 July 1664, he matriculated at Trinity College, Cambridge, from which he graduated as a Bachelor of Medicine in 1671, then becoming a Fellow-Commoner at Pembroke College, Cambridge on 23 July the same year. In 1672 he was appointed as a surgeon for the British East India Company, to be paid "50s. per month to commence at his arriveall", and on 9 December 1672 sailed from Gravesend on the Unity. While en route, at Johanna (Nzwani) in the Comoro Islands, he made important observations concerning the antiscorbutic qualities of oranges and limes. He arrived on 26 June 1673 at Masulipatnam (now Machilipatnam), the earliest English settlement on the Coromandel Coast, and sailing onwards from there to Madras, ultimately arrived at Bombay one year after leaving England[1]".

ترجمہ:Dr John Fryerلندن کے William Fryer کاسب سے بڑابیٹا تھا۔13 جولائی 1664 کو، اس نے ٹرینٹی کالج، کیمبرج سے میٹرک کیا، اور 1671میں بیچلر آف میڈیسن کیا، 1672میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی میں بحیثیت سرجن کام کرنے کا موقع ملااور1672میں اس نے مختلف ملکوں میں سفر کاادارہ کیا۔ راستے میں چونے کی اینٹوں کی خصوصیات کے بارے میں اہم مشاہدات کیے۔وہ26جون1673کو ماسولیپٹم (انڈیا کے کسی شہر کا نام ہے جو کرشنا میں ہے)پہنچا، جو Coromandel پر انگریز کی سب سے قدیم بستی تھی، اور وہاں سے مدراس کی طرف سفر کرتے ہوئے، بالآخر انگلینڈ چھوڑنے کے ایک سال بعد بمبئی پہنچا۔

"Fryer remained in the east for eight years, returning to England in August 1682, where he married and had at least one daughter, Anna Maria Sanderson. In 1697 he was elected Fellow of the Royal Society, and in 1698 his "Abstract with Some Reflections on a New Account of East-India and Persia" was published in the Society's transactions, the same year as his magnum opus, A new account of East-India and Persia. Fryer died on 31 March 1733 at his Bread Street home in All Hallows parish, London"[2].

---

[1] Sidney lee, *Dictionary of National Biography*, (London: Smith, Elder & Co, 1901),215–217.
[2] Herbert, Sir Thomas, *Encyclopædia Britannica***,** (USA: Horace Everett Hooper.1911),211.

ترجمہ: Fryer آٹھ سال تک مشرق میں رہا، اگست 1682 میں انگلینڈ واپس آیا، جہاں اس کی شادی ہوئی اور اس ایک بیٹی اینا ماریا سینڈرسن تھی۔ ڈاکٹر جان فرائر (1733۔1650) کیمرج یونیورسٹی کا گریجویٹ اور 1697 میں وہ رائل سوسائٹی کے فیلو منتخب ہوئے۔ یہ بھی ایک انگریز سیاح تھا، جس نے صفوی دورِ حکومت میں ایران کا سفر کیا اور نو سالوں کی روداد لکھی، جو چار جلدوں پر مشتمل بڑا ذخیرہ ثابت ہوئی۔

Fryer's books provide contemporary accounts of Mughal India, southern India, and Persia, where he visited Isfahan and the southern parts of the country, with accurate observations in geology, meteorology, and natural history"[1].

فریئر ایک مشہور تاریخ دان بھی تھے مغل ہندوستان، جنوبی ہندوستان اور فارس کے حوالے سے ان کی تصنفات ملتی ہے

A New Account of East India and Persia beging Nine years travels (1672-1681)

ولیم کروک نے بعد میں 1672 سے 1681 تک کے مختلف سفر ناموں کو جمع کر کے اس کتاب کو مرتب اور شائع کیا، جسے لندن سوسائٹی نے 1909 اور 1915 میں شائع کیا۔

ان سفر ناموں سے مستشرقین نے تصوف کے حوالے سے معلومات لی، لیکن ان کے معلومات لینے کے لیے کوئی معیار نہیں دیکھا بلکہ چیزوں کو ذاتی حوالے سے دیکھا، کوئی رقص کرتا درویش ملا یا قہوہ خانے میں گفتگو کرتا کوئی درویش نظر آیا تو اسے تصوف سمجھا۔ معرفت پر کسی سے بھی کوئی گفتگو سنی تو بغیر تحقیق اور اصول کے تصوف سمجھ کر اس کی تعلیمات میں لکھ دیا۔ گویا جو تصورات و مشاہدات ایک اجنبی سیاح، تاجر کے ہوتے ہیں وہی لکھتا چلا گیا۔ اس طرح مغرب میں تصوف کے کافی لٹریچر وجود میں آیا انہی کو لوگوں نے تصوف کا اصل سمجھ کر تصوف کی تعلیمات کہہ کر پھیلانے لگے۔ جو کچھ ان کے مطالعے اور مشاہدے میں آیا اس کو حقیقت سمجھ کر اپنی کتب میں بیان کر دیا، جو کچھ انھوں نے لکھا پھر اس کا ترجمہ ہونا شروع ہو گیا، اس طرح صدیوں میں سینکڑوں کتابیں بن گئیں، اب پڑھنے والا جو بھی زبان پڑھے گا معلومات وہی ہوں گی۔ جس نے جس طرح دیکھا اس نے اسی طرح بیان کر دیا۔ کچھ ہی عرصے میں پوری دنیا میں اس قسم کا تصوف پھیل گیا۔ اس وقت مسلمان محققین کی کتب دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے مستشرقین کا محاسبہ ہو سکا نہ ان کی فراہم کردہ معلومات کی چھان بین کی جا سکی۔ اس طرح اسلامی تصوف کو کسی نے عقیدہ بنا دیا تو کسی نے علم الکلام، کسی نے مابعد الطبیعات بنایا تو کسی نے اسے شاعری سے اخذ کرتے ہوئے مایوسی اور دور زوال کی پیداوار اقرار دیا۔ جب تصوف پر عرب صوفیاء کی لکھی ہوئی کتابیں منظر عام پر آ گئیں، تب بھی مستشرقین نے اپنا نظریہ تبدیل نہ کیا۔ لہٰذا مستشرقین کے فراہم کردہ معلومات پر

[1] https://www.Bartanica.org/ John_Fryer/(Accessed 16-02-2022)

مبنی تعلیمات کو اسلامی تصوف نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی ان کی روشنی میں تصوف پر کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ان کی فراہم کردہ معلومات غیر مستند اور بے بنیاد ہیں۔

ان نکات سے صوفی ازم سے مستشرقین کا تعلق واضح ہوا کہ ان کے کچھ لوگ مختلف اہداف یعنی تجارت، سیاحت وغیرہ کے پیش نظر مختلف ملکوں میں سفر پر گئے، تو انھوں نے وہاں کے مختلف لوگوں سے ملاقات کی۔ ان ملاقات میں مختلف افکار کے حامی لوگوں سے معلومات ملی اس طرح ان کے پاس تصوف کے حوالے سے بہت سے مواد اکٹھا ہوا۔ جب یہ لوگ واپس گئے تو انھوں نے ان تمام روداد کو سفر نامے کی شکل میں مرتب کیا اس طرح اہل مغرب ان سفر ناموں کے توسط سے تصوف کے غیر مستند مواد سے آشنا ہوئے۔ پھر یہ سفر ناموں کے مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئے اور ان کے ذریعے تصوف یورپ میں متعارف ہوا۔

فصل سوم: اسلامی تصوف پر مستشرقین کے اعتراضات کے اسباب

اس فصل میں مستشرقین کی جانب سے وارد کیے گئے اعتراضات کے اسباب بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ جن کی وجہ سے آج مسلم نوجوانوں کے ذہن کو دینِ اسلام کی روح یعنی زہد، ورع، سلوک، عرفان اور احسان جس کا دوسرا نام تصوف ہے، اس کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیا ہے۔ سچ اور جھوٹ، غلط اور صحیح میں فرق وامتیاز کرنے کے لیے ان اسباب سے آشنائی بے حد ضروری ہے۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلاشبہ اگر یہی مستشرقین مغربی علوم وفنون کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو نسبتاً زیادہ مالی یا معاشرتی فوائد اور شہرت حاصل کر سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو مشرقی علوم وفنون کے لیے وقف کر دیا۔ اور ان علوم پر مختلف اعتراضات کیے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اس فصل کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں مغربی مفکرین کی طرف سے تصوف پر وارد کیے جانے والے اعتراضات پر مسلمان اہل علم نے اس کے کچھ اسباب بیان کیے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:۔

اصل اسلامی مآخذ تک عدم رسائی:

ان اعتراضات کا ایک اہم سبب غیر مسلم محققین کا اسلامی مآخذ کے اصل تک عدم رسائی ہے۔ اس کی وجہ سے تصوف پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ تصوف نے غیر اسلامی تصورات سے جنم لیا ہے اور اس کی نشوونما مختلف افکار کے ذریعے ہوئی ہے یعنی اس کی نشوونما ایرانی وہندی اور یونانی نظریات اور افکار سے ہوئی ہے۔ بنیادی طور پر اس کی وجہ بنیادی کتبِ تصوف کا مطبوعہ شکل میں نہ ہونا اس غلط فہمی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ تصوف کے غیر اسلامی ہونے کی سوچ غیر اسلامی محققین کے خیالات سے داخل ہوئی۔ سولہویں صدی عیسوی سے بیسوی صدی کے نصف اول تک لاطینی، جرمن، فرانسیسی زبان میں لکھی جانے والی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو گیا۔ اس طرح یہ فکر پورے یورپ میں پھیل گئی۔ بیسویں صدی کے نصف اول تک جتنے بھی مسلمان مفکرین، محققین، علماء، زعماء، اہل علم اور سکالز ہوئے، ان کے پاس تصوف پر موجود لٹریچر صرف اور صرف وہی تھا جو مستشرقین نے تحریر کیا تھا[1]۔

اسلامی تصوف کی مستند تعلیمات اور اس کی صحیح تشریح وتعبیر پر کوئی مستند کتاب موجود ہی نہیں تھی۔ جہاں تک تصوف کا تعلق ہے تو آج بھی اس طرح کی کتاب کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ پچھلی تین چار صدیوں میں تصوف، اس کی ترویج اور ارتقاء پر موجود تمام لٹریچر مغربی مصنفین کا تحریر کردہ تھا۔ دوسری زبانوں میں لکھا ہوا لٹریچر بھی انگریزی میں

---

[1] طاہر قادری، **تصوف اور مستشرقین**، ص:24

ترجمہ ہو چکا تھا۔ تقسیمِ ہند سے قبل برصغیر میں برطانوی راج تھا۔ برطانوی قانون رائج ہونے کی وجہ سے مستشرقین کا یہاں مسلسل آنا جانا رہتا تھا۔ان کی کتابیں چھپتی تھیں۔ علی گڑھ، کلکتہ اور مدارس میں ان کے لیکچرز ہوتے تھے۔

پروفیسر نکلسن ہوں یا اے جے آربری،ان جیسے اور بھی بہت سے مستشرق مفکرین تھے جنھوں نے تصوف پر لکھا اور وہ اس موضوع پر اتھارٹی سمجھے جانے لگے۔ کیونکہ پچھلے چار سو سالہ لٹریچر اس غلط فہمی کا سبب بنا رہا اور مغربی چینل سے اسلام کا مطالعہ کرنے والے اہل علم و فکر نے تصوف کے بارے میں یہ گمان کر لیا کہ تصوف عجمی پیداوار ہے اور اس نے غیر اسلامی تصورات سے جنم لیا ہے۔تاہم اب یہ فکر پرانی، باطل اور مردود ہو چکی ہے کیونکہ امہات الکتب کے منظر عام پر آنے کی وجہ سے حقیقت اور ناقابل تردید شواہد پر مبنی صحیح نظریہ سامنے آچکا ہے۔

حقیقت کے واضح ہو کر سامنے آجانے کے بعد بھی پرانے نظریے پر اصرار کرنا خود رجعت پسندی اور قدامت پسندی کی دلیل ہے جو کہ جدت اور حقیقت پسندی کے خلاف ہے۔ جس کے ہاں بھی اس طرح کی رائے قائم ہوئی، آج حقائق سے غلط ثابت ہو چکی ہے۔اس رائے کے غلط ہونے کی نشاندہی خود مستشرق آربری نے خود ہی کر دی ہے۔ مستشرقین کی کیا ذمہ داری ہے اور انھیں کیا کردار ادا کرنا ہے اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> "For we orientalists in this generation are sill in many respect on the position of the classical scholars of the Renaisssance.it devolves upon u for our times to make the greatest possible provision for the requirements of our successors"[1].

ہمارے دور کے مستشرقین کی پوزیشن کئی طرح سے تحریکِ احیائے علوم کے سکالرز کی سی ہے۔اپنے عصری تقاضوں کے پیش نظر ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے جانشینوں کی کامیابی کے تقاضوں کے لیے زیادہ سے زیادہ ممکنہ انتظامات کریں۔

یورپی محققین کا قدیم ایرانی مآخذ پر انحصار:

صلیبی جنگوں کے خاتمے کے بعد سولہویں صدی عیسوی میں یورپ اور عالم اسلام کا منقطع رابطہ بحال ہوا۔ لیکن ان کے تعلقات عرب ممالک کی بجائے ایران سے بحال ہونے لگے۔ رابطہ بحال ہونے کے بعد اہل یورپ کا ایران کے ساتھ لین دین اور ایک دوسرے کی طرف آنے جانے کا سلسلہ جاری ہوا۔ تو اہل یورپ کے لوگ ایران آکر وہاں کی زبان فارسی سیکھنا شروع کر دی۔ فارسی زبان سیکھنے کے بعد ان کی رسائی ایرانی علمی کتب، شخصیات اور دیگر افراد خاص کر شعراء حضرات تک ہوئی۔ وہ ایرانی فلاسفہ اور شعراء کی مدد سے ایرانی ثقافت سے آشنا ہوئے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی ایرانی صوفیاء سے

[1] Arberry, *An Introduction to the Hitory of Sufism*, 5

بھی آشنائی ہوئی۔ایرانی ثقافت سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مختلف مقامات کی طرف گئے۔ان مقامات میں سے ایک مقام وہاں کے خانقاہیں تھیں۔خانقاہیں دیکھیں اور ان کے نظام کو سمجھنے کی کوشش کی۔اس عرصے میں ان کے علمی اور تحقیقی وسائل و مآخذ صرف ایرانی مصادر تک محدود رہے۔

ان کی معلومات کا ذریعہ فارسی کتابیں، ایرانی اہل فکر و دانش، ادبی و علمی شخصیات، فلاسفہ، شعراءاور ایران کے صوفیاء تھے۔ حصولِ علم کا کوئی بھی غیر ایرانی ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا۔ بعض عرب شعراءاور فلاسفہ کے علاوہ ان کا ارتکازِ توجہ ایرانی فلاسفہ اور ایرانی شاعری ہی رہی۔ علم کے دوسرے ذرائع تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے انھیں تصوف کا سرچشمہ بھی ایرانی فلسفے میں ہی نظر آیا۔

ان مستشرقین نے تصوف کی تاریخ، ارتقاء اور اس کے نظریات و تعلیمات بھی ایرانی صوفیاء، علماء، کتب، کلچر، خانقاہوں اور ان خانقاہوں کو آباد کرنے والوں کے معمولات سے اخذ کیے، چنانچہ ان معاملات کو ایرانی نظر سے دیکھا اور حاصل ہونے والی معلومات کو یک جا کر کے اپنی کتب میں تحریر کر دیا۔ان کتب سے جو معلومات کم یا زیادہ دستیاب ہوئیں، مد مقابل درست معلومات نہ ہونے کی وجہ سے انھیں قبولِ عام مل گیا۔ان معلومات کے قبول کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وقت تحقیق اور ریسرچ کا نہیں تھا یا اگر تحقیق تھی بھی تو اسے زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے کے لیے درکار وسائل کم تھے۔ لہٰذا لوگ کم علم اور سہل پسند ہونے کی بناء پر انہی معلومات پر اکتفا کرتے تھے اور غیر مستند کو مستند مان لیتے تھے۔ یورپی مفکرین نے ایران کے سفر کے بعد سفر نامے مرتب کیے اور کتابیں لکھیں جو چھپ بھی گئیں لیکن مسلمانوں کے پاس صحیح معلومات جاننے کے لیے کوئی دوسرا ماخذ موجود نہیں تھا جس سے شواہد ملتے اور حقائق کی تصدیق کی جاسکتی۔پروفیسر آربری نے 1942 میں اسلامی تصوف پر اپنے لیکچرز میں اشارہ کر دیا تھا کہ اس وقت اسلامی تصوف کے مصادر اصلیہ دستیاب نہیں ہے، جس کی وجہ سے تصوف پر صحیح رائے قائم کرنا ممکن نہیں ہے[1]۔

جن معلومات پر مبنی تصوف کی تعلیمات اس وقت تک پیش کی جاتی رہی، وہ صرف ایک ہی تہذیب کے مصادر سے ہی لی گئی تھی جسے خود آربری نے ناقابلِ اعتماد کہا اور اس کی وجہ یہ بیان کیا کہ تصوف کی اصل تعلیمات جو مکہ و مدینہ سے شروع ہوئی اور قرنِ اولیٰ میں بھی جاری و ساری رہی وہ جملہ معلومات عربی مخطوطات کی صورت میں مختلف لائبریریز میں

[1] قادری، محمد طاہر، **تصوف اور مستشرقین**، ص:28

موجود ہیں۔ان مخطوطات پر وسائل کی کمی کی وجہ سے مزید کام نہیں کر سکا۔لہٰذا عربی مصادر میسر نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بھی تصوف کا مکی و مدنی رخ نہ دیکھ سکا۔ یہ فطری بات ہے کہ اگر وسائل اور مصادر و مآخذ میسر نہ ہوتے تو حقیقی تصوف پر انہی کی بنیاد پر رائے قائم ہونا تھی۔لہذا جب مصادر اور مواد اصلی نہیں اور صرف ایک ہی تہذیب کے مصادر ہو تو اس پر حقیقی و مستند رائے قائم ہونا مشکل ہو جاتی ہے۔ان غیر مستند مصادر پر مبنی رائے نے بر صغیر پاک و ہند کے محققین کو متاثر بھی کیااور ان کی رائے بھی بدلی۔

صلیبی جنگوں کے اثرات:

مستشرقین کی طرف سے تصوف پر جو اعتراضات وارد کیے ہیں ان کے اہم اسباب میں سے ایک سبب مغربی محققین کے ذہنوں پر صلیبی جنگوں کے اثرات ہے۔

یورپ اور عالم اسلام کے درمیان صلیبی جنگیں دو صدیوں تک جاری رہی۔ان جنگوں کے نتیجے میں یورپ اور عالمِ اسلام کے درمیان ذہنی و فکری دشمنی اور نفرتیں وجود میں آچکی تھیں۔ذہن ایک دوسرے کے خلاف عداوت اور دشمنی سے بُری طرح پراگندہ تھے۔یورپ اسلام کے خلاف انتہائی نفرت انگیز نقطہ نظر رکھتا تھااور اسلام کے ایک ایک پہلو کے بارے میں غلط تصور سے ان کا ذہن بھرا ہوا تھا۔ صلیبی جنگوں کے دو سو سال میں یورپ اور اسلام میں رابطہ منقطع رہااور ایک دوسرے کے خلاف نفرت امیز رویہ پروان چڑھتا رہا۔دوسرے لفظوں میں اس دور میں اسلام دشمنی کار فرما تھی۔ اگرچہ حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس غلط فہمی کے پیچھے یہی ایک سبب تھا بلکہ اور نقطہ ہائے نظر بھی تھے، لیکن سب سے اہم سبب یہی تھا کہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے ان کے آپس کے تعلقات کافی خراب ہو گئے تھے۔جنگ و جدل کی وجہ سے جن مفکرین نے تعصب کی بناء پر تحقیق کی وہ فکری محاذ پر بھی مسلمانوں کو شکست دینا چاہتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے مسلمانوں کے بنیادی عقائد کے بارے میں مسلمانوں کے ذہنوں میں مختلف شکوک و شبہات پیدا کرنا شروع کیا۔اور انھوں نے اسلامی تعلیمات خصوصاً اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف وسیع پیمانے پر پراپیگنڈا کیا۔اس طرح اسلامی علوم اور تصوف پر ان کے طرح طرح کے اعتراضات ملتے ہیں۔ان تمام اعتراضات کے پیچھے اصل سبب دیکھا جائے تو بہت سے اسباب نظر آتے ہیں جن میں سے ایک اہم سبب مغربی مفکرین کے ذہنوں میں صلیبی جنگوں کے اثرات تھے جس کو اس فصل میں تفصیل سے تحریر کیا گیا ہے۔

عربی زبان پر عدم دسترس:

تصوف میں مستشرقین کی طرف سے وقتاً فوقتاً بہت سے اعتراضات کیے گئے ان کے اسباب و علل میں سے ایک سبب برصغیر کے نوجوان نسل کی عربی زبان پر دسترس نہ ہونے کے باعث صرف انگریزی مصادر تک رسائی حاصل ہونا ہے۔ آج کے نوجوان نسل کا المیہ یہ ہے کہ وہ ان مغربی مفکرین کی کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتے ہیں۔ اہل فکر و دانش اور آج کے نوجوان مستشرقین کو پڑھنا روشن خیالی، جدت پسندی اور وسعتِ نظری خیال کرتے ہیں۔ یہ ایک مستحسن اور قابل تحسین عمل ہے، مگر آج کی نوجوان نسل کے لیے ضروری بات یہ ہے کہ کسی شعبہ کو پڑھنے کے لیے اس شعبے کے اصل اصول و قانون سے واقفیت انتہائی ضروری ہے ورنہ اس شعبے کو سمجھنے کی بجائے اس شعبہ کے بارے میں غلط نظریات جنم لیں گے۔ لہذا مستشرقین کو پڑھنے سے پہلے ان کے اعتقادات اور ان کے اہداف کا علم بہت ضروری ہے۔ جب ان کے بارے میں علمی و نظریاتی طور پر پختگی آجائے تب ان شعبوں کے بارے میں پڑھنے سے فائدہ حاصل ہوگا۔ کیونکہ جب کوئی اس شعبہ کے حوالے سے دلیل دے رہا ہو تو آپ کو پتہ ہو کہ دلیل کہاں سے دے رہا ہے، غلط ہے یا درست، آپ اصل کتابوں سے رجوع کر سکیں اور حق و باطل میں امتیاز قائم کر سکیں، اس وقت ایسی کتابوں کو پڑھنا نقصان دہ نہیں ہوگا۔ اگر ایسی کتابوں کو پڑھے جن کے بارے میں علم نہ ہو تو اس سے آپ کا ذہن انتشار، ابہام اور التباس سے بھر جائے گا۔ اس عمر میں اگر فکری الجھاؤ اور واضحیت کا فقدان پیدا ہو جائے اور انھیں دور کرنے کے لیے مطلوبہ علم نہ ہو تو اس سے عقیدہ بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بنیادی علوم کی بنیادی زبانوں سے آشنائی ضروری ہے۔ تاکہ ان علوم کے اصل مصادر اور بنیاد تک رسائی ممکن ہو۔ امہاتِ کتب کے مطالعے کے بغیر اگر ثانوی ذرائع سے علم لیں گے تو یقیناً مشکلات ہوں گی۔[1]

جیسا کہ مختلف لوگوں کی مغربی مفکرین کو پڑھ کر تصوف کے بارے میں رائے قائم ہوئی ہے۔ ان لوگوں کی رسائی امہات کتب تک نہیں تھی اس لیے انھوں نے مختلف طریقوں سے تصوف اور اسلامی تعلیمات پر اپنی مرضی کے مطابق بے بنیاد اعتراضات کیے جن سے مسلمانوں کے ذہنوں میں اس شعبہ کے حوالے سے طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔

مشہور مغربی سکالر محقق پروفیسر نکلسن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ اسلامی تصوف عیسائیوں سے لیا گیا ہے۔ اپنے اس دعوے پر دلیل کے طور پر حضرت ابراہیم بن ادھم کا ایک واقعہ پیش کرتا ہے، کہتا ہے کہ ابراہیم بن ادھم شام کے صحرا میں گھوم رہے تھے کہ انھیں ایک شخص ملا جس سے انھوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملنے کا طریقہ پوچھا، اس نے لکھا

---

[1] طاہر قادری، **تصوف اور مستشرقین**، ص:32

ہے کہ ابراہیم بن ادھم کو شام کے صحرا میں ملنے والا شخص عیسائی راہب تھا، لہذا ابراہیم بن ادہم نے عیسائی راہب سے تعلیمات لے کر اسلامی تصوف میں داخل کیں[1]۔

اب نتیجہ یہ ہوگا کہ جو شخص عربی نہیں جانتا اور اصل کتابوں تک اس کی رسائی نہیں۔ وہ جب پروفیسر نکلسن کے ان جملوں کو پڑھے گا تو ضرور یقین کرے گا، کیونکہ اس کے نزدیک یہ واقعہ ایک مشہور و معروف سکالر کا لکھا ہوا ہے۔ در حقیقت یہ پورا واقعہ الرسالۃ القشیریۃ میں بیان ہوا[2]۔اب جس نے صرف نکلسن کو پڑھا اور اصل عربی متن کو نہ پڑھ سکا تو وہ ضرور متاثر ہوں گے اور تقابلی مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے غلط اور صحیح میں تمیز نہیں کر سکیں گے۔

اسلامی تعلیمات کی وقعت واہمیت کو کم کرنا:

تصوف اور اسلامی تعلیمات پر مستشرقین نے مختلف حوالوں سے اعتراضات کیے ۔ان اعتراضات کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ مستشرقین اسلامی تعلیمات کی وقعت کو کم کرنا چاہتے ہیں۔اس لیے مسلمانوں کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم، قرآن، شریعت اسلامیہ اور فقہ اسلامی کی تحقیق کے نام پر شکوک و شبہات کے ایسے شوشے چھوڑنا؛ جو مسلمانوں کی اپنی علمی اور ایمانی میراث کی خود اعتمادی کو مجروح کریں۔اس حوالے سے کتاب '' اسلام اور مستشرقین'' میں صاحبِ کتاب مستشرق روڈی کے بیان کو تحریر کرتا ہے کہ

جرمن مستشرق روڈولف روڈی پارٹ Rudolf Rudi Paret(۱۹۰۱۔۱۹۸۳ء) کا کہنا ہے کہ معاصر استشراقی جدوجہد کا مقصود دین اسلام کو باطل دین ثابت کرنا اور مسلمانوں کو دین مسیحیت کی طرف راغب کرنا ہے[3]۔

روڈی پارٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ(Middle Ages) میں عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد علوم اسلامیہ کی طرف اس لیے متوجہ ہوئی کہ دین اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مسخ کر سکے، کیونکہ ان کا یہ ذہن بن چکا ہوا تھا کہ جو دین بھی مسیحیت کے خلاف ہے، اس میں کوئی خیر نہیں ہو سکتی[4]۔

اس طرح مستشرقین اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کے تہذیبی سرمایہ کی اقدار و روایات کے متعلق شک ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ مستشرقین اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلامی تہذیب و تمدن؛ رومانی تہذیب و ثقافت

---

[1] Nicholson, The Mystic of Islam,p.67

[2] القشیری ،الرسالۃ القشیریۃ:7

[3] إدریس، محمد جلاء، **الاستشراق الإسرائیلی فی المصادر العربیۃ**،(القاھرۃ:العربی للنشر والتوزیع،۱۹۹۵)،ص:۱۹

[4] إسماعیل، محمد بن علی،**الاستشراق بین الحقیقۃ والتضلیل**،(مصر:الکلمۃ للنشر والتوزیع،الطبعۃ الثالثۃ،۲۰۰۰ء)،ص:۹-۱۰

سے منقول ہے اہل عرب نے رومانی تہذیب و تمدن ،اس کے فلسفہ اور اس کے اثار و علامات کو نقل کیا ہے۔اس طرح مستشرقین ہر جگہ اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں کو غلط رنگ دے کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلاموفوبیا[1] (Islamophobia)

تصوف اور اسلامی تعلیمات پر مستشرقین نے مختلف حوالوں سے اعتراضات کیے ہیں ان اعتراضات کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ مستشرقین کو یہ خوف ہے کہ کہیں دینِ اسلام پوری دنیا میں غلبہ حاصل نہ کرلے۔اس لیے وہ اسلامی تعلیمات پر شکوک وشبہات پیدا کر کے اس کو داغ دار بنانا چاہتے ہیں۔

مغرب میں اسلام کے پھیلاؤ کو روکنا اور عیسائی دنیا کو مسلمان ہونے سے بچانا بھی مستشرقین کے اہداف میں شامل ہے۔اس مقصد کے تحت مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے اپنی تحقیقات کے ذریعے مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں اہل یورپ کے دلوں میں نفرت، بغض اور تعصب کو جنم دیا۔ سابقہ برطانوی وزیراعظم اور سیاسی رہنما ولیم گلاڈسٹن(William Ewart Gladstone 1809-1898)نے1882 میں کہا تھا کہ جب تک قرآن موجود ہے،یورپ کے لیے مشرق کو مغلوب کرنا ممکن نہیں ہے،بلکہ قرآن کی موجودگی میں یورپ کے لیے اپنے آپ کو حالت امن میں محسوس کرنا بھی درست نہیں ہے[2]۔

الجزائر میں متعین فرانسیسی گورنر کا کہنا یہ تھا کہ ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم ان کے وجود سے قرآن مجید کو کھرچ ڈالیں اور ان کی زبانوں سے عربی زبان کو اکھیڑ دیں تو اسی صورت میں ہم صحیح معنوں میں ان سے بدلہ لے سکتے ہیں۔ معاصر امریکی مستشرق برنارڈ لویس کو امریکی سیاست کا وفادار مستشرق مانا جاتا ہے۔ یہ صاحب عالم اسلام کو اس وقت مغرب اور مغربی تہذیب کے لیے ایک بڑا خطرہ قرار دیتے ہیں[3]۔

---

[1] اسلاموفوبیا(اسلام ہراسی) لفظ 'اسلام' اور یونانی لفظ "فوبیا" (یعنی ڈر جانا) کا مجموعہ ہے۔اس سے غیر مسلم ' اسلامی تہذیب سے ڈرنا' اور ' نسلیت مسلم گروہ سے ڈرنا ' مطلب لیتے ہیں۔اکثر غیر مسلموں کو اسلام کے خلاف بڑھکایا جاتا ہے اور اسلامی تعلیمات کے خلاف زہر افشانی کر کے ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرتیں پیدا کی جاتیں ہیں۔جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں اسلام کا خوف داخل ہوتا ہے اس کو اسلاموفوبیا کہا جاتا ہے۔

[2] ایضا،ص:58

https://shamilaurdu.com/book/islam-aur-mustashriqeen/accessed:12-02-2022)

[3] اسماعیل،**الاستشراق بین الحقیقۃ والتضلیل**،ص:59

مسلمانوں میں مسیحیت کی تبلیغ:

تصوف پر مستشرقین نے مختلف حوالوں سے اعتراضات کیے ان اعتراضات کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ مستشرقین دین اسلام کی تعلیمات کی اہمیت کو کم کر کے مسلمانوں میں عیسائیت کی ترویج کرنا چاہتا ہے۔اس لیے اسلام کا اہم شعبے روحانیت کو اپنے اعتراض کا نشانہ بنایا۔ جیسا کہ کتاب ''اسلام اور مستشرقین'' میں بیان ہوا ہے کہ :

مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے ان کے دین وعقائد میں تشکیک پیدا کرنا بھی تحریک استشراق کا ایک اہم مقصد ہے۔استاذ عبدالرحمن میدانی کا کہنا ہے کہ یورپ کی اکثر یونیورسٹیوں میں علومِ اسلامیہ اور علومِ عربیہ کا تعلیمی نصاب، منہج اور طریق تدریس طے کرنے والے متعصب مستشرقین یا تنصیری(Evangelist)ہیں[1]۔

جرمن مستشرق یوہن فنک Johann Funck(1894-1974) نے لکھا ہے کہ استشراق محض کوئی علمی تحریک نہیں ہے بلکہ اس کا مقصود اسلام کا رد اور مسلمانوں میں عیسائیت کی ترویج ہے[2]۔

ان نکات سے یہ بات واضح ہوئی کی مستشرقین نے اسلامی تعلیمات اور خصوصاً اسلامی تصوف پر مختلف حوالوں سے اعتراضات وارد کیے ہیں ان کے پیچھے جو اسباب کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔اس بات پر بھی توجہ ضروی ہے کہ یہ تمام اسباب تمام مستشرقین نے اپنائے ہوں یہ ضروری نہیں کیونکہ جہاں کچھ لوگ غلط نظریات کی بنیاد پر کام کرتے ہیں وہاں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا علوم اسلامیہ کے مطالعے کا مقصد صرف علم حاصل کرنا اور حقیقت تک پہنچ جانا ہوتا ہے۔ مستشرقین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے عالمی قوتوں کی تہذیب و تمدن سے واقفیت ، ان کے ادیان اور مذاہب اور زبان و ثقافت سے دلچسپی کی بناء پر انہی موضوعات پر تحقیق کی اور اس کی طرف قدم اٹھایا لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہمت اور فراخ دلی سے تحقیق کی اور تصوف کو سمجھنے میں بہت کم لغزشوں کے مرتکب ہوئے کیونکہ ان کا بنیادی مقصد تحریف و تبدل نہیں تھا ان کا مقصد علمی تحقیقات کرنا اور حقائق سے آگاہ ہونا ہے۔ لہذا تحقیق کرنے والے جس کا تعلق اسلام سے ہو یا غیر اسلام سے سب کا ہدف اور مقصد مختلف ہوتا ہے۔ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر کوئی اپنے انداز سے کام کرتا ہے۔ مستشرقین کی زیادہ تعداد ایسے لوگوں پر مشتمل ہیں جنھوں نے

---

[1] زبیر، محمد، **اسلام اور مستشرقین** ،(لاہور: مکتبہ رحمۃ للعالمین،2014)،ص:15

[2] اسماعیل، **الاستشراق بین الحقیقۃ والتضلیل**،ص:35

اسلامی تعلیمات کو ہدفِ تنقید بنانے کی سوچ میں تحقیق پر قلم اٹھایا۔اس کے لیے انھوں نے مختلف ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اسلامی علوم پر تحقیق کرنا شروع کی۔

جب اسلام کی روشنی پوری دنیا میں تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی تو مستشرقین نے اس کو روکنے کے لیے اسلامی بنیادی تعلیمات میں ایسے ایسے اعتراضات اٹھائے گئے ہیں کہ سادہ لوح اور اصل مصادر سے ناواقف لوگ اس کو حقیقت سمجھ بیٹھیں جبکہ بعض نے اسلامی تعلیمات کی وقعت اور اہمیت کو دنیا کی نظروں سے گرانے کے لیے اسلامی باطنی علوم تصوف کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کیے اور پڑھنے والوں کو شکوک میں مبتلا ہونے کی کوشش کی۔اس طرح مستشرقین مختلف اسباب اور مقاصد کو سامنے رکھ کر اسلامی تعلیمات کو اپنے مطالعے میں شامل کرتے ہیں۔

باب سوم:

نکلسن، گولڈ زیہر اور اے جے آربری کے احوال و آثار اور ان کی استشراقی فکر

فصل اول: نکلسن اور اس کا مستشرقانہ رجحان

فصل دوم: گولڈ زیہر اور اس کا مستشرقانہ رجحان

فصل سوم: اے جے آربری اور اس کا مستشرقانہ رجحان

باب سوم:

نکلسن، گولڈ زیہر اور اے جے آربری کے احوال و آثار اور ان کی استشراقی فکر

مختلف تحقیقات اور قرائن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مستشرقین، مغربی دنیا کے فکری دھارے پر نہ صرف یہ کہ ماضی میں بلکہ اب تک اثرانداز ہو رہے ہیں۔ یہاں مستشرقین سے مراد وہ مغربی اہلِ قلم ہیں، جو اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب پر تحقیق و تالیف سے خود کو وابستہ کرتے ہیں۔ انھیں دو جماعتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ایک وہ جماعت جو زمانے کے اعتبار سے قدیم مستشرقین اور جدید مستشرقین پر مشتمل ہے اور دوسری جماعت ان مستشرقین کی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کی تحریروں کے عام انداز کے اعتبار سے ان میں سے ایک طبقہ اسلامی تہذیب کی مدح سرائی کرتا ہے اور دوسرے کا مقصد محض نکتہ چینی کرنا ہے۔

اس طرح یہ مستشرقین صدیوں سے اسلامی تعلیمات کے بارے میں اپنی تحقیقات میں مصروف ہیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کا تعلق کسی ایک ملک یا علاقے سے نہیں ہے، بلکہ یہ دنیا کے مختلف ممالک اور خطوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف ممالک میں مصروفِ عمل ہیں۔ آپس میں کسی رابطے اور تعلق کے بغیر بنیادی مقصد میں سب یکساں ہیں جو کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پھیلانا ہے۔ لیکن جس طرح سب انسان برابر نہیں اور سب ایک جیسے نہیں ہوتے اسی طرح مستشرقین کو ایک ہی درجے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ ان میں سے کچھ بہت متعصب اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں، جن کا مقصد اسلام کو بدنام کرنا ہوتا ہے اور کچھ انصاف پسند بھی ہیں جن کا مقصد تحقیق و جستجو کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس طرح مستشرقین کے بہت سے اقسام ہیں: متعصب، علم و تحقیق کے شائق اور انصاف پسند ہیں۔

مستشرقین کو ان کے رویہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر زمانے میں ان کا رویہ یکساں نہیں رہا۔ اس لحاظ سے ان کے فکر و فن اور تحقیق و تالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مستشرقین نے کئی مفید کام بھی کیے ہیں اور کچھ مستشرقین بنی نوع انسان کے لیے فکری بے اعتدالی اور نظریاتی بے راہ روی کا باعث بنے ہیں۔

لہٰذا یہاں اس باب میں مستشرق پروفیسر نکلسن، گولڈ زیہر اور اے۔ جے آربری کے احوال و آثار اور ان کے مستشرقانہ رجحان کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان میں سے کونسا مستشرق تعصب پر مبنی تحقیق کرتا ہے اور کونسا مستشرق علم و تحقیق کی خاطر اسلام کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان کی تحریر اور تصانیف سے ان کے مستشرقانہ رجحانات کا بھی اندازا ہو جائے گا۔

فصل اول: نکلسن اور اس کا مستشرقانہ رجحان

تاریخِ استشراق میں کچھ لوگ انتہائی معروف ہے ان میں سے ایک نامور مستشرق سکالر پروفیسر نکلسن ہیں پروفیسر نکلسن عقیدتاً مسیحی تھااور کالج میں رہنے کی وجہ سے ان کی مذہبی تعلقات اور علمی و فکری لحاظ سے وہ مضبوط شخصیت کا مالک تھا۔اس نے اپنی زندگی میں بہت سے علمی میدان خصوصا تصوف میں اپنانام روشن کرتے ہوئے بہت سا علمی میراث چھوڑ کر گئے۔اس فصل میں نکلسن اور اس کے مستشرقانہ رجحان پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

پروفیسر آر۔اے۔ نکلسن کا تعارف

آر اے نکلسن 18 اگست 1868 کو انگلینڈ میں پیدا ہوااور 27 اگست 1945 میں فوت ہوا۔وہ ایک ممتاز انگریز مستشرق تھا۔انھیں اسلامی ادب اور اسلامی تصوف میں ایک معروف عالم تصور کیا جاتا ہے۔اُس نے اسلامی مطالعات پر ایک دیرپا اثر چھوڑا ہے۔وہ تصوف پر لکھے ہوئے ضخیم ذخائر کو عربی، فارسی،اور ترکی سے انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے میں ماہر تھا۔

پروفیسر نکلسن استشراق کی تاریخ کے ایک نامور اسکالر ہیں۔وہ کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی زبان کے لیکچرر تھے جو بعد میں پروفیسر ہوگئے۔اس سے قبل ان کا پس منظر یہ تھا کہ وہ Trinity College کے فیلو تھے۔جہاں وہ خالصتاً عیسائی مذہب کی تعلیمات سیکھنے کے لیے گئے تھے۔اگرچہ بعد میں ان کا لجز میں وسعتِ نظری پیدا ہوگئی، مگر اس وقت وہاں مذہبیت غالب تھی۔آج بھی امریکہ، برطانیہ اور یورپ میں کئی Trinity Colleges ہیں،جو عیسائی تعلیمات سیکھانے کا اہتمام کرتے ہیں۔پروفیسر نکلسن کا عقیدہ مسیحی تو تھا مگر کالج میں رہنے سے ان کی مذہبی وابستگی اور علمی و فکری اعتبار سے پختگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے آج سے تقریباً سو سال قبل جب The Mystics of Islam لکھی تو اس وقت اسلام کے بارے میں ویسے بھی اتنی وسعتِ نظری نہیں پائی جاتی تھی۔اسلام کے بارے میں تعصب اور تنگ نظری زیادہ تھی۔ذہنوں میں عداوت اور انتہا پسند رویے جنم لے چکے تھے۔ایسے حالات میں اگر کوئی روحِ اسلام کے بارے میں بات کرے گا تو وہ یقیناً غیر جانبدار نہیں ہوگی۔اس کے ساتھ ساتھ بطور مستشرق پروفیسر نکلسن کی مہارت فارسی زبان میں تھی۔اس لیے ان کے مطالعہ کا بنیادی نقطہ اور محور و مرکز ایرانی شعراء تھے جن میں صوفی شعراء بھی شامل تھے۔

نکلسن کی تصنیفات:

پروفیسر نکلسن کو اسلامی ادب اور اسلامی تصوف میں ایک معروف عالم تصور کیا جاتا ہے۔اُس نے اسلامی مطالعات پر ایک دیرپا اثر چھوڑا ہے۔وہ تصوف پر لکھے ہوئے ضخیم ذخائر کو عربی، فارسی، اور عثمانی ترکی سے انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے میں ماہر تھا۔پروفیسر نکلسن کی تصنیفات جو آج تک شائع ہو چکی ہیں ان کی تعداد سترہ ہے اور ان میں تقریباً تمام کتابیں صوفی ادب کے متعلق ہیں۔ بعض ان کی مستقل تصنیفات ہیں، بعض مشہور کتابیں انھوں نے قدیم قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے مرتب کیں۔ان کا انگریزی ترجمہ قابلِ قدر ہے،ان کی شرحیں لکھی ہے اور ابتداء میں فاضلانہ مقدمہ کا اضافہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

1۔منتخبات دیوان شمس تبریز،1898ء میں چھپی۔

2۔تذکرۃ الاولیاء، یہ حضرت فرید الدین عطار کی کتاب ہے جو فارسی میں تھی، نکلسن نے تنقیدی شرح لکھی اور 1907ء میں لیڈن سے چھپی۔

3۔تاریخ ادب عربی ، 1929ء میں کیمبرج سے شائع ہوئی۔

4۔ابتدائی عربی حصہ اول،دوم،سوم مع شرح وفرہنگ مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی 1909ء۔

5۔مقدمہ و شرح '' رباعیات عمر خیام'' 1911ء۔

6۔''ترجمان الاشواق'' یہ محی الدین ابن عربی کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔اس کی زبان عربی ہے۔نکلسن نے تین قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے انگریزی میں عربی اشعار کا لفظی ترجمہ کیا اور 1911ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

7۔''کشف المحجوب'' تصوف اسلامیہ پر فارسی زبان میں ہجویریؒ کا ایک قدیم رسالہ ہے۔پروفیسر نکلسن نے اس کا ترجمہ کیا اور 1911ء میں لندن میں شائع ہوئی۔

8۔'' صوفیائے اسلام'' یہ کتاب انگریزی زبان میں نکلسن کی تصنیف ہے۔1914ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

9۔''کتاب اللمع فی التصوف'' ابو نصر سراج کی کتاب ہے۔نکلسن نے پہلی مرتبہ اصل کتاب عربی زبان سے مرتب کی۔ اس کی تنقیدی شرحیں لکھیں۔اسکا خلاصہ فرہنگ اور فہرست مضامین مرتب کیا۔اور 1914ء میں بمقام لیڈن چھپی۔

10۔ ''فارس نامہ'' ابن البلخی کی کتاب ہے جسے موصوف نے مرتب کیااور 1921 میں شائع کی۔

11۔ ''اسرارِ خودی'' یہ ہندوستان کے مشہور ادیب و فلسفی ڈاکٹر علامہ اقبال کی ایک فلسفیانہ نظم ہے۔ نکلسن نے فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کیااور اس پر شرح لکھی۔1930ء میں لندن سے شائع کیا۔

نکلسن نے اقبال کی پہلی فلسفیانہ فارسی شاعری کی کتاب اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ The Secrets of the Self کے عنوان سے کیا۔ نکلسن علامہ اقبال کے بی۔اے کے تحقیقی مقالہ کے ایک ممتحن تھے۔اقبال کے یورپ میں قیام کے زمانے میں نکلسن لیکچرار فارسی تھے .علامہ اقبال کی پہلی شعری تصنیف اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ بعنوان The Secrets of the Self بھی کیا جو 1930 میں لندن سے شائع ہوا تھا۔اس ترجمہ کی بدولت علامہ اقبال کی شہرت یورپ بھر میں پھیلی۔ پروفیسر نکلسن نے جب علامہ اقبال کے تصورِ خودی پر اعتراضات کیے تو علامہ نے اپنے ایک مکتوب بنام نکلسن مورخہ 24 جنوری 1921 کو تمام اعتراضات کے جوابات تحریر کیے اور یہ ثابت کیا کہ اُن کی فکر کا ماخذ قرآنِ حکیم ہے نہ کہ یورپی مفکرین کے افکار[1]۔

12۔ '' تصوفِ اسلامیہ کا مطالعہ'' کیمبرج یونیورسٹی پریس 1921ء

13۔ ''مثنوی جلال الدین رومی'' اس کتاب کا ترجمہ اور شرح

پروفیسر نکلسن کا شاہکار ، مثنوی مولانا روم پر ان کے کام تھا۔ یہ کتاب 1925ء سے 1940ء تک آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی۔ انھوں نے مثنوی کے پہلے اہم فارسی ایڈیشن کو ڈھونڈا، انگریزی میں جتنا بھی کام رومی پر ہوا تھا، اس میں سے، سب سے پہلے مکمل ترجمہ اور تشریح نکلسن نے کی۔ لہٰذا اس کا کام دنیا بھر میں رومی تعلیمات کے میدان میں سب سے زیادہ مؤثر رہا[2]

پروفیسر آر۔اے۔ نکلسن کا مستشرقانہ رجحان:

پروفیسر نکلسن کو مغربی دنیا میں ایک ماہر اسلامی علوم کہا جاتا ہے۔اسلامی تعلیمات پر اس کی کافی تحقیقات ہیں۔ ان تحقیقات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے حوالے سے کوئی اچھا سوچ رکھنے والا نہیں ہے۔اس کے بقول اسلامی تعلیمات کا زیادہ تر حصہ مختلف مذاہب اور تہذیبوں سے اخذ شدہ ہے۔

---

[1] زبیر، **اسلام اور مستشرقین**، 18

[2] https://ur.shops-net.com/org/istishraq/Mathnavi(Accessed 17-02-2022)

پروفیسر نکلسن سمیت بہت سے مستشرقین کا خیال ہے کہ قرآن مجید سے پورا عقیدہ توحید اور اس کی تفصیلات وجود میں نہیں آسکتیں۔ قرآن نے تصور توحید بغیر تفصیلات کے بڑے سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی صرف تائبین یعنی عبادت گزاروں کے لیے ہے، گنہگاروں کے لیے قرآن مجید میں کوئی تصور رحمت نہیں[1]۔

یہاں بھی انھیں قرآن کے کم مطالعے کی وجہ سے مغالطہ لاحق ہوا ہے۔ انھوں نے قرآن کی وہ آیات دیکھی ہیں جن میں عبادت گزاروں یا توبہ کرنے والوں کے لیے اللہ کی رحمت کا ذکر ہے۔ ان آیات کی طرف ان کی توجہ ہی نہیں گئی، جن میں گنہگاروں کے لیے رحمت کا ذکر ہے۔ مثال کے طور پر فرمانِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ يَاعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾[2]۔

ترجمہ: آپ فرما دیجیے: اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کر لی ہے، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ سارے گناہ معاف فرما دیتا ہے، وہ یقیناً بڑا بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔

اس آیت میں خطاب ہی گنہگاروں سے ہے۔ اگر صرف اس ایک آیت کو ہی پڑھ لیا ہوتا تو انھیں یہ مغالطہ کبھی لاحق نہ ہوتا۔ اللہ رب العزت نے اپنا پہلا تعارف ہی صفت رحمانیت و رحیمیت سے کرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر صفت کے لیے ایک ایک نام گنوایا مگر صفتِ رحمت کے لیے دو نام "الرحمان" اور "الرحیم" گنوائے ہیں[3]۔

مستشرقین کا اسلامی تعلیمات پر ایک یہ بھی اعتراض ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی گنہگاروں کا ذکر ہے وہاں ان کی سزا کا بھی تذکرہ ہے۔ گنہگاروں کو ان کے اعمال کے بدلے سزا ملے گی، ان کے لیے رحمت کا کوئی تصور نہیں ہے[4]۔ گویا قرآن صرف خوف والے خدا کا تصور دیتا ہے، رحمت اور محبت والے خدا کا نہیں۔ یہ بنیادی غلطی قرآن کے کم مطالعے کی وجہ سے ہو سکتی ہے یا متعصبانہ اور معاندانہ رویے کی وجہ سے۔ اسی لیے وہ قرآن کے تصور الٰہ کو بھی سمجھنے سے قاصر رہے۔

---

[1] Nicholson, *The Mystics of Islam*,21.

[2] الزمر: 53

[3] الفاتحہ: 2

[4] Kegan Paul *Studies in Islamic Mysticism*, (New York : Routledge,1976) ,25.

اسی تصور سے وہ غلط فہمی پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ اگر قرآن میں تصور رحمت و محبت ہے ہی نہیں تو پھر صوفیاء یہ دونوں تصورات کہاں سے لے آئے؟ لہٰذا وہ صوفیاء کی ان تعلیمات کا رشتہ قرآن وحدیث سے جوڑنے کے بجائے عیسائیت سے ملاتے ہیں۔اس طرح قرآن مجید کی غلط تعبیر کر کے غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔

پروفیسر نکلسن یونانی فلسفہ ، ہندومت ، بدھ مت اور جدید افلاطونیت جیسے فلسفے بیان کرنے کے بعد محبت، معرفت، رحمت اور فنا و فلسفہ ہدایت وغیرہ جیسی صفات پر براہِ راست صوفیاء کے اقوال بیان کرتے ہیں۔قرآن وحدیث کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔بہ الفاظ دیگر، وہ صوفی ازم کو براہِ راست یونانی فلسفے ، ہندومت ، بدھ مت اور عیسائیت کے مقابل لا کھڑا کرتے ہیں تاکہ عام قاری کا ذہن اس طرف جائے ہی نہیں کہ صوفیاء نے یہ تعلیمات قرآن وحدیث سے بھی لی ہوں گی۔اس طرح انھوں نے بڑے غیر محسوس طریقے سے قرآن و حدیث سے لوگوں کو دور کر کے ارکانِ اسلام اور تعلیماتِ اسلام کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی تصور معرفت پر پروفیسر نکلسن کا موقف

مستشرقین اور خصوصاً پروفیسر نکلسن اسلامی تصورِ معرفت کے حوالے سے اس بات کے قائل ہیں کہ اسلام میں جو معرفتِ الٰہی کا جو تصور ہے وہ خود اسلام کا وضع کردہ نہیں ہے بلکہ یہ اسلام میں خارجی پیداوار ہے۔اور اسلام معرفتِ الٰہی کے سلسلے میں جو طریقہ کار اپناتا ہے وہ ہو بہو دوسرے مذاہب کا وضع کردہ ہے اس کو اسلامی تعلیمات میں داخل کیا ہے۔جیسا کہ معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات اس بات پر زور دیتی ہے کہ ذکر و فکر اور پرہیزگاری ، قناعت پسند اور ایثار جیسی چیزوں کے ذریعے انسان معرفتِ الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔یہ تمام تعلیمات جو اسلامی تصوف میں پائی جاتی ہیں،ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا عکس ہے۔

پروفیسر نکلسن قلب، روح اور سر کے حوالے سے کہتا ہے کہ یہ سب معرفت کے ماخذ، منابع اور لطائف میں سے ہیں۔لہٰذا ان کو معرفت کے باب میں شمار کرتے ہوئے ان پر بحث کی ہے۔معرفت، محبت اور فنا پر بات کرتے ہوئے بطورِ حوالہ وہ مولانا روم، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، حافظ شیرازی اور ابن الفارض وغیرہ کو پیش کرتا ہے کہ انھوں نے تصورِ محبت، معرفت اور فنا کا بہت ذکر کیا ہے۔ان تینوں تصورات میں ایرانی صوفیاء کا تذکرہ کرنے کے بعد فوراً وہ ان تصورات کو مسیحیت کی طرف لے جاتے ہیں اور درمیان سے قرآن و حدیث اور آثار صحابہ کرام و تابعین اور تبع التابعین کو چھوڑ دیتے ہیں۔تصورِ معرفت کے ساتھ بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔پروفیسر نکلسن سمیت مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ معرفت کا تصور بھی

قرآن میں موجود نہیں بلکہ یہ تصور بھی اسلام اور صوفیاء نے مسیحیت سے اخذ کیا ہے یا یہ بدھ مت، ہندوازم اور یونانی فلسفے سے ماخوذ ہے۔اپنی ان باتوں کے ثبوت کے لیے دلیل کے طور پر کچھ مثالیں اور واقعات ذکر کرتے ہیں:۔

عیسائی راہبوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی پر سکون مقام پر جاکر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ مستشرقین کا عقیدہ ہے کہ اسلام میں حجرہ بناکر اس میں ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنے کا رواج بھی عیسائی طریقہ تصوف سے ہوا ہے[1]۔

معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے محبتِ الٰہی ضروری ہے۔جب تک انسان اپنے خالق سے محبت نہ کرے اس کی معرفت ممکن نہیں۔ مستشرقین اس حوالے سے کہتے ہیں کہ محبتِ الٰہی کی بنیاد بھی مسیحیت کو قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت عیسی علیہ السلام کی ایک مشہور روایت نقل کی جاتی ہے:

حضرت عیسی علیہ السلام ایک مرتبہ کہیں تشریف لے کر جارہے تھے، راستہ میں عابدوں کا ایک گروہ ملا۔انھوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: تم لوگ کون ہو؟اور تمھارا مشغلہ کیا ہے؟تو انھوں نے جواب میں کہا کہ ہم عابد اور زاہد ہیں اور ہم اللہ کی آگ سے ڈرتے اور اس سے بچنے اور چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ پر تمھارا حق ہے کہ جس آگ سے تم ڈرتے ہو اس سے وہ تمھیں امان میں رکھے۔

حضرت عیسی علیہ السلام پھر آگے بڑھے تو ایک اور گروہ سے ملا۔ان سے بھی انھوں نے فرمایا۔ کہ تم لوگ کون ہو، اور کیا کرتے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا ہم اللہ کے محب ہیں، ہم جہنم کے خوف سے اس کی عبادت نہیں کرتے اور نہ ہم جنت کی خواہش میں اس کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم صرف اس سے محبت کرتے ہیں، ہم صرف اس کی عظمت کے آگے سر جھکاتے ہیں۔

تو اس وقت حضرت عیسی علیہ السلام نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تم ہی خدا کے سچے دوست ہو۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ تمھارے ساتھ رہوں۔ پھر حضرت عیسی علیہ السلام ان ہی کے درمیان رہ پڑے اور مقیم ہو گئے[2]۔

نکلسن اپنی اس کتاب Islamic Mysticism میں تصوف کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''صوفی وہ ہے جو اپنی ذات میں فنا ہو جاتا ہے اور خدا میں زندہ رہتا ہے۔اس معنوں میں فنا ہو جانا دراصل خدا کے ساتھ متحد ہو جانا ہے۔خلاصہ یہ کہ مسلم صوفیہ کی آخری غایت خدا بن جانا اور الوہیت میں شریک ہو جانا

---

[1] جعفری، رئیس احمد، **تاریخ تصوف اسلام**، (لاہور: کتاب منزل، 1950)، ص: 91

[2] جعفری، **تاریخ تصوف اسلام**، ص: 92

(Deification) ہی ہے"[1]۔

حالانکہ حقیقی "اسلامی تصوف" کا مقصد اسرار و رموز کائنات کی معرفت یا ذات باری تعالیٰ میں ادغام یا وصل ہر گز نہیں ہے اور نہ ہی الوہیت یا صفات الٰہی میں انسان کی شرکت اس کی منتہا و مقصود ہے۔

اسلام اور صوفی کی خصوصیت کے حوالے سے این میری شِمل لکھتی ہے:

"Islam, a religion which in theory does not accept any mediator between man and God."[2].

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو نظرتی طور پر انسان اور خدا کے درمیان کسی ثالث کو قبول نہیں کرتا۔

صوفیاء کے ہاں جو تصورِ فنا ہے اس کے بارے میں بھی نکلسن کا یہی دعویٰ ہے کہ یہ تصور بھی صوفیاء نے عیسائیت، بدھ مت، ہندو مت اور جدید افلاطونیت سے لیا ہے۔ باقی تصورات کی طرح وہ تصورِ فنا کو بھی قرآن و حدیث کی طرف منسوب کرنے کی بجائے عیسائیت اور دوسرے مذاہب سے منسوب کرتے ہیں۔

جیسا کہ اس حوالے سے پروفیسر این میری شِمل لکھتی ہے:

"Renold A Nicholson pointed about Neoplatonism out in the famous introduction to his selection from jalaluddin Rumi's lyrical poetry in 1898 – the first book in the long list of his still unrivalled publications in the field of Sufism .Nicholson , However understood that the early ascetic movment can be explained without difficulties from its Islamic roots and that , therefore , the original from of Sufism is " a native product of Islam itself." Since Islam grew out of a soil in wich ancient oriental, Neoplatonic and Chiristain influences were strong , a number of secondary influences may have worked upon Islam even in its earliest phase"[3].

رینالڈ اے نکلسن نے جلال الدین رومی کے انتخاب کے تعارف میں نو پلاٹونزم کی طرف اشارہ کیا تھا۔ تصوف کے میدان میں ان کی اب تک کی بے مثال اشاعتوں کی طویل فہرست میں پہلی کتاب، نکلسن کی یہی کتاب ہے، تاہم انہوں نے یہ سمجھا کہ ابتدائی سنیاسی تحریک کو اس کی اسلامی جڑوں سے بغیر کسی مشکل کے بیان کیا جاسکتا ہے اور اس وجہ سے تصوف "خود اسلام کی مقامی پیداوار ہے۔" چونکہ اسلام قدیم سے پروان چڑھا تھا، نو پلاٹونک اور عیسائیت کے اثرات بھی اس وقت مضبوط تھے، اس لیے ابتدائی دور میں بھی اسلام پر بہت سے ثانوی اثرات نے کام کیا ہو گا۔

---

[1]Kegan, Paul , Islamic mysticism,149.

[2] Schimmel Annemarie , *Islam an Introduction*, (USA, State University of New York. 1992),121.

[3] Annemarie Schimmel, *Mystical Dimensions Of Islam*,10.

اینی میری شِمل، نکلسن کی اس بات کو رد کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ تصور فناء، کو اسلام سے ہٹ کر عیسائیت ہندومت اور بدھ مت کی طرف نسبت دینا درست نہیں ہے۔

"Some scholars like Nicholson and others tried to equate "Fana" with the Hindu or Buddhist concept of nirvana but this is incorrect."[1]

جبکہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے بندے کو متعارف کرایا اور اس کی حقیقت بیان کی تو اس میں فنا رکھ دی اور اپنی ذات کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اس میں بقا رکھ دی۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾[2]۔

ترجمہ: روئے زمین پر موجود ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔اور صرف آپ کے صاحب عزت و جلال رب کی ذات باقی رہنے والی ہے۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہ سے پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے اخلاق کیا تھے، تو جواب دی کہ کیا آپ نے قرآن پڑھا ہے؟((كان خلقه القرآن))[3]۔

یعنی آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کا اخلاق قرآن تھا۔ قرآن سے اخلاق کی طرف جو کمالات، اوصاف اور اخلاق اترتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ان کا عملی مرقع تھی۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بشری اوصاف الوہی اوصاف میں فنا ہو گئے تھے۔ آپ کی ذاتی صفات قرآن میں نازل کردہ صفات میں فنا ہو گئی تھیں۔

اس بات کی طرف مجدد الف ثانی یوں رہنمائی کرتے ہیں:

"فنا وبقا کے تجربہ کو الوہیت میں شریک تصور کرنا درست نہیں ہے؛ کیونکہ دوران مراقبہ صوفی جب خود کو فنا کر کے خدا کے ساتھ متحد ہو جانے کی کیفیت محسوس کرتا ہے تو یہ کیفیت بعینہ خواب کی طرح ہوتی ہے۔ یہ سب حقیقتاً نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر تم خواب میں دیکھو کہ بادشاہ بن گئے ہو تو اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہوتا کہ تم حقیقت میں بادشاہ ہو گئے ہو۔ اسی طرح جب سالک دیکھتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ متحد ہو کر خود بھی "خدا" بن گیا ہے تو وہ سچ مچ خدا نہیں بن جاتا" [4]

تصوف کے اس کیفیت کی وضاحت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے زیادہ واضح الفاظ میں یوں کی ہے۔

---

[1] Ibid,142

[2] الرحمٰن:26-27

[3] حنبل، احمد ابن محمد، **المسند**، (قاہرہ: دار المعارف، 1954)، ح:24645، ص:91/6

[4] سرہندی، شیخ احمد، **مکتوبات**، ص:۵۸۹

''ان کے خیال کے مطابق ''سالک عشق الٰہی میں ہمہ تن غرق اور اپنی ہستی کو فنا کرکے بزعم خود اللہ تعالیٰ کی ذات میں اس طرح جذب ہوجاتاہے جس طرح لوہے کا ٹکڑا آگ میں تپ کر آگ ہی کی طرح سرخ اور شدید گرم ہوجاتا ہے، گویا وہ بھی آگ ہے؛ حالانکہ حقیقت میں وہ آگ نہیں؛ بلکہ لوہا ہی ہے۔ٹھیک اسی طرح عشق الٰہی کی آگ میں تپ کر سالک بھی خود کو ذاتِ خدا وندی سے ہم آہنگ محسوس کرنے لگتا ہے۔بہر نوع! یہ سب محض تصوراتی اور ''خیالی فلسفہ'' ہے، حقیقت میں نفس الامری نہیں ہے''[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تصور معرفت کی اصل کے متعلق مستشرقین کے نظریات تمام و کمال صحیح اور نہ ہی اسلامی تصور معرفت عیسائی تصوف کا نتیجہ ہے، بلکہ خود اسلام ہی اس کی اصل منبع اور ماخذ ہے اور اس کی روح خود اسلام میں ابتداء ہی سے موجود تھی۔

معرفتِ الٰہی کے لیے حبِ الٰہی کی ضرورت ہے اور حبِ الٰہی کا نظریہ اسلامی تصوف میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔اس کی ابتداء خود اسلام سے ہوئی ہے۔یہ کہیں خارج سے برآمد شدہ نظریہ نہیں ہے۔خود قرآن مجید اور احادیث سے ان کا ثبوت ملتا ہے۔جیسا کہ قرآن مجید میں اس حوالے سے مختلف جگہوں میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾[2]۔

ترجمہ:جولوگ ایمان لائے وہ اللہ سے سخت محبت رکھتے ہیں۔

اسی طرح حدیثِ مبارکہ میں حبِ الٰہی کے حوالے سے ملتا ہے۔جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ارشاد ہے:

((لایوٴمن احدکم حتٰی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین))[3] ۔

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا ،یہاں تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اولاد اور تمام لوگوں سے محبوب ہوجاؤں۔

خدااور رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی یہی وہ محبت تھی، جس کی بناء مسلمان اپنی جانیں اور اپنا مال متاع بے دریغ راہِ خدا میں لٹادینے کے لیے آمادہ ہوجاتے تھے اور سربکف میدانِ جنگ میں کودپڑنے کو تیار رہتے تھے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی تصور معرفت خود اسلام کی دی ہوئی تعلیم ہے۔یہ الگ بات ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی تعلیمات میں بھی معرفتِ الٰہی اور محبتِ الٰہی کی نشانیاں ملتی ہیں۔کیونکہ اسلام کوئی الگ دین و مذہب نہیں ہے جو پہلے انبیاء علیہم السلام

---

[1] دہلوی، شاہ ولی اللہ، **ہمعات**، (لاہور: سندھ ساگر اکادمی، 1946ء)، ص:36

[2] البقرہ:165

[3] مسلم القشیری، **الصحیح**، ح:169، ص:۴۱

کی تعلیمات سے ہٹ کر کوئی نئی تعلیم دے بلکہ اسلام انہی انبیاء کرام کی تعلیمات کو مزید آگے پہنچاتا ہے۔اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں بنتا کہ اسلامی تعلیمات عیسائیت یا کسی اور مذہب سے اخذ شدہ ہے۔

معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات اس بات کی طرف زور دیتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے۔تو مستشرقین نے اس کو بھی عیسائیت سے ماخوذ قرار دیا جبکہ اسلامی تعلیمات میں جا بجا اس کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔اسلام میں ذکرِ الٰہی کی تعلیم ایک خاص طریقے سے دی گئی ہے۔قرآن مجید اور حدیث مبارکہ میں ایسے بے شمار ارشادات ملتے ہیں، جن میں ذکرِ الٰہی پر بہت زور دیا گیا ہے۔جیسا کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

﴿وَاذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيراً وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ﴾[1]-

ترجمہ: اور اپنے رب کو خوب یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

ایک اور مقام پر ارشادِ خداوندی ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيراً وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾[2]

ترجمہ: اے ایمان والو! تم ذکر کرو اللہ کا بہت ذکر ، اور اس کی تسبیح بھی پڑھو صبح و شام۔

اسی طرح احادیث میں بھی معرفتِ الٰہی کے لیے ذکر الٰہی کثرت سے کرنے پر تاکید کی ہوئی ہے۔

جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

((يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِى بِي،وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي،فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي))[3]-

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کہتا ہے ، میں اپنے بندے کے خیال کے نزدیک ہوں ،اور میں اس کے ساتھ ہوں ، جب اس نے میرا ذکر کیا۔پس اگر اس نے میرا ذکر کیا اپنے نفس میں تو میں نے بھی اس کا ذکر کیا اپنے نفس میں۔

ان آیات و احادیث میں مختلف انداز میں ذکرِ الٰہی پر زور دیا گیا ہے ،ایسی صورت میں ذکرِ الٰہی کو مسیحیت یا کسی اور مذہب سے اخذ کرنے کی کیا ضرورت پیش آئے گی۔تو لہذا صوفیائے کرام نے ذکرِ الٰہی کی تعلیم خود اسلام سے حاصل کی ہے اسلام ہی اس کا منبع اصلی اور بنیادی ماخذ ہے۔

---

[1] ال عمران:41

[2] الاحزاب:41-42

[3] ظهير ،احسان إلهي، **دراسات في التصوف**،(دار الإمام المجدد للنشر 2005)،ص:202

قرآن و حدیث میں بیان کردہ یہ سارا تصورِ معرفت اور تصورِ فنا ہے اور اس تصور پر کثرت سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ مبارکہ موجود ہیں۔ جب تصورِ فنا قرآن و حدیث میں موجود ہے، جو مسلمان کا مرجع اول ہے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ صوفیاء کرام قرآن اور حیاتِ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو چھوڑ کر ان تعلیمات کے لیے دوسرے مذاہب سے رجوع کر کے یہ تعلیمات ان سے حاصل کرے؟ ایسا ہر گز ممکن نہیں کیونکہ صوفیاء کے لیے پہلا مرجع تو قرآن مجید اور حدیث ہے، اگر ان دونوں سے تصورِ معرفت اور تصورِ فنا کا حصول نہ ہوا تو تب کسی دوسرے دین کی طرف رجوع کریں گے۔ جبکہ یہ ساری تعلیمات خود قرآن اور حدیث کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

فصل دوم: گولڈزیہر(Ignaz Goldziher)اوراس کا مستشرقانہ رجحان

اس فصل میں گولڈزیہر کے مستشرقانہ رجحان کے بارے میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ مستشرقانہ رجحان کے اعتبار سے مستشرقین کو کئی اقسام اور طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ان میں سے چند اہم اقسام درج ذیل بیان کیا گیا ہے۔

معتدل مزاج مستشرقین:

یہ مستشرقین کا وہ گروہ ہے جو مسلمان نہ تھے اس لیے ان کا آبائی ادیان کے زیر اثر ہونا فطری بات تھی۔اس طبقے کی تحریروں میں بس شمار غلطیوں توہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اسلام، محمد صل للہ علیہ والہ وسلم اور اسلامی تعلیمات کو زبردست خراج تحسین بھی پیش کرتے ہیں۔ان میں چند مستشرقین یہ ہیں:

- کاسن دی پرسیول، رحرڈ سائمن، گاڈفرلے ہگنز، یوہان جے ریسکے اور مائیکل ایچ ہارٹ وغیرہ شامل ہیں۔

ملحد مستشرقین:

قرون وسطی میں جب یورپ میں مذہب اور سائنس کے درمیان میں جنگ جاری تھی، تب جو لوگ ملحد ہوئے۔انھوں نے مذہب کے خلاف لکھنے کے لیے اسلام کو بطور رمز استعمال کیا، کیوں کہ پوپ کی طرف سے مسیحیت پر زبان درازی کرنے پر کڑی سزاہیں دی جاتی تھیں۔اس کی ایک بہت بڑی مثال والٹیئر ہے۔ جس نے محمد صل للہ علیہ والہ وسلم پر ایک ڈراما (Le Famatisme on Mohammaticv Prophete) لکھا، جس کا انتساب پوپ کے نام کیا،اس طرح اس نے پوپ کو بھی خوش رکھااور مذہب پر بھی حملہ کیا۔

متعصب مستشرقین:

اس طبقے میں ان مستشرقین کو رکھا جاتا ہے جن کا مقصد بے لاگ اور غیر جانبدارنہ علمی تحقیق کے لبادے میں اسلام کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرتے رہے ہیں۔ان میں چند مشہور افراد یہ ہیں۔

کیمون، جین برڈ، ہمفرس پرائی ڈیکس، سر ویلم میور، جارج سیل اور گولڈزیہر وغیرہ شامل ہیں۔

انتہائی دقت نظر سے اسلام کا مطالعہ کرنے والے مستشرقین:

بہت کم مستشرقین گذرے ہیں جنہون نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیااور اس کی بنیاد پر اپنی تحقیقات پیش کیں، مگر ان میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو "پیشہ ور مستشرقین" میں آتے ہیں۔ایسے مستشرقین ہیں:

- گولڈزیہر، سر ولیم میور، ارٹر جیفری، مارگولیتھ اور جارج سیل وغیرہ شامل ہیں

اگناز گولڈ زیہر کا تعارف : (Introduction of Ignaz Goldziher)

گولڈ زیہر کا پورا نام" Ignaz Goldziher " ہے۔اردو میں عمومی طور پر" اجناس گولڈ زیہر" یا اگناز گولڈ زیہر" لکھا اور پڑھا جاتا ہے، جبکہ عربی میں "اجنتس جولد تسیھر" یا" کولد صھر " لکھا جاتا ہے۔اجناس گولڈ زیہر 22 جون 1850ء کو ہنگری کے شہر (Szekesfehervar) میں پیدا ہوا۔ وہ جرمنی کا رہنے والا تھا اور مذہباً یہودی تھا۔ لکھنے پڑھنے کا اور مطالعہ کا ذوق فطری تھا۔اس لیے کم عمری میں یعنی ابھی پانچ سال کی عمر میں ہی عہد نامہ عتیق کا عبرانی ایڈیشن کا مطالعہ شروع کر دیا۔آٹھ سال کی عمر میں پوری تلمود پڑھ ڈالی۔ابھی عمر سولہ برس کی تھی اور وہ سکول بوائے ہی کہلاتا تھا کہ اس نے فلسفے اور قدیم زبانوں فارسی اور ترکی کی کلاسوں میں جو بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوئی تھیں، پابندی اور باقاعدگی سے شرکت شروع کر دی۔ یہاں اس نے مشہور مستشرق وامبری سے استفادہ کیا۔اس کی تکمیل کرنے کے بعد گولڈ زیہر کو مزید اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے لیے ہنگری گورنمنٹ کی وزارتِ تعلیم کی طرف سے ایک وظیفہ مل گیا تو 1869ء میں وہ جرمنی چلا گیا۔اور لیپزگ (Leipzig)اور برلن (Berlin) کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ لیپزگ میں اس نے مشہور عربی دان پروفیسر فلاشیر (Fleischer) سے عربی کی تعلیم حاصل کیا اس طرح اس نے عربی زبان میں مہارت حاصل کیا۔اسی کی زیر نگرانی میں کام کر کے 1870 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اس وقت اس کی عمر 20 سال تھی۔اس کے بعد وہ اپنے شہر واپس آیا اور 1872 میں بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں بطور وزیٹنگ لیکچرار اپنی خدمات انجام دینا شروع کیا۔

جرمنی سے کچھ عرصہ کے بعد وہ ہالینڈ چلا گیا جو اس زمانے میں اسلامیات کے درس و مطالعہ کا یورپ میں سب سے بڑا مرکز تھا، چھ مہینے قیام کیا۔اس قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولڈ زیہر نے اب تک جو کام کیا تھا، اگرچہ اس کا دائرہ وسیع تھا، لیکن اس کا تعلق زیادہ تر یہودی اور سامی زبانوں (جن میں عربی بھی شامل تھی) کے ادب و لٹریچر کے مطالعہ سے تھا۔ مگر اب یعنی لیڈن میں قیام اور اسلامیات کے درس و مطالعہ میں مشغول ہوئے، جیسا کہ گولڈ زیہر نے خود اپنی ڈائری میں تحریر کیا ہے۔

"The study of Islam and its research became the most important mission of my academic life"[1] .

اسلام کا مطالعہ اور اس پر تحقیق میری علمی زندگی کا نہایت اہم مشن بن گیا۔

اس سلسلے میں اس نے مزید مختلف ممالک کا سفر کیا ان میں سے ایک اہم سفر گولڈ زیہر کے لیے مشرق وسطیٰ کا سفر تھا۔اس سفر کی روداد وہ اپنی کتاب " Introduction to Islamic Theology and Law" میں یوں لکھا ہے۔

اس نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا اور ستمبر 1873 سے اپریل 1874 تک دمشق اور قاہرہ میں قیام کیا۔ شام میں شیخ طاہر الجزائری سے ان کا تعارف ہوا اور کچھ عرصہ ان کی صحبت میں گزارا۔ جامع الازہر، قاہرہ میں کسی غیر مسلم کا داخلہ قانوناً ممنوع تھا۔ لیکن گولڈ زیہر نے خصوصی اجازت حاصل کر کے اس میں داخلہ لے لیا اور بحیثیت طالب علم وہاں پڑھنا شروع کر دیا۔ گولڈ زیہر نے جو زمانہ یہاں گزارا، اس کو اس نے اپنی زندگی کی خوشگوار ترین اور مفید ترین مدت بیان کیا ہے[2]۔

علمی اور تحقیقی کام

بارہ برس کی عمر میں گولڈ زیہر نے عبرانی زبان کی مناجاتیں ان کی اصل اور ان کی اقسام پر مقالہ لکھا اور اسے شائع کرایا۔ وہ قاہرہ میں اپنے والد کی سخت علالت کے باعث جو مرض الموت ثابت ہوئی، زیادہ قیام نہ کر سکا اور وطن لوٹ آیا۔ یہاں ان کے گھر کا تجارتی کاروبار انحطاط پزیر تھا۔ علاوہ ازیں ہنگری گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کا اب وہ پہلا ہمدردانہ اور حوصلہ افزاء رویہ باقی نہ رہا تھا اور ملک کی سیاسی صورتحال بھی بدل چکی تھی۔ ان مشکلات اور موانع کے باوجود گولڈ زیہر نے باقاعدہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ انہماک اور کامل توجہ و یکسوئی کے ساتھ جاری رکھا۔ چنانچہ 1874 میں ویانا کی امپیریل اکادمی کی روئیداد میں گولڈ زیہر کے علمی کارنامہ کی اشاعت ہوئی تو علوم شرقیہ اور خصوصاً اسلام اور اس کے متعلقات کے ایک جدید طرز کے محقق کی حیثیت سے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں۔ اور یہی واقعہ اس کی شہرت کا نقطہ آغاز بنا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہنگری میں سامیوں کے خلاف تحریک بڑے زور و شور سے چل رہی تھی اور اس بناء پر یہودیوں کو اکثر و بیشتر اعزازات و تقررات سے محروم کر دیا گیا تھا۔ گولڈ زیہر بھی اس کی زد سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ وہ بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارنامے جن کی دھوم ممالک غیر کے حلقوں میں مچی ہوئی تھی، خود اس کے اپنے وطن میں ان کی کوئی قدر نہ تھی۔ یہ زمانہ گولڈ زیہر کے لیے بڑا صبر آزما تھا۔ 1894 میں بوڈاپسٹ یونیورسٹی نے گولڈ زیہر کو پروفیسر مقرر کیا مگر محض اعزازی

---

[1] Goldziher,Ignaz,edit ,S.M.Stren,*Muslim Studies*(London: Routledge,2005),34.

[2] GoldZiher,Ignaz ,*Introduction to islamis theology and law* (London: Mexsa Press,1987),16.

طور پر، یعنی پروفیسر کا لقب رکھنے کے باوجود گولڈ زیہر کو نہ تنخواہ ملتی تھی اور نہ اور سہولتیں میسر تھیں۔ وطن میں ان کے ساتھ یہ معاملہ اس وقت تھا جبکہ 1889 میں آٹھویں انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹ نے گولڈ زیہر کو ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی قدر افزائی کی غرض سے ایک تمغہ طلائی دیا اور 1894 میں کیمبرج یونیورسٹی نے گولڈ زیہر کو ڈبلیو روبرٹس اسمتھ کی جانشینی کی غرض سے پروفیسر شپ کی پیش کش کی تھی، جس کو خود گولڈ زیہر نے منظور نہیں کیا تھا[1]۔

آخر معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر گولڈ زیہر نے یہودی کمیونٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ جس کو مسلسل تیس 1876 سے 1904 تک کرتا رہا۔ اس میں اگرچہ تنخواہ کافی تھی، لیکن یہ کام گولڈ زیہر کی طبیعت اور مزاج کے خلاف تھا۔ لیکن اس میں مصروفیت کے باوجود شام کے اوقات، تعطیلات کے ایام میں جو وقت ملتا تھا، گولڈ زیہر اسے علمی اور تحقیقی کاموں میں صرف کرتا اور انھیں شائع کرتا رہتا تھا۔ جس سے اس کی عظمت اور شہرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر کار 1904 میں اس کا تقرر ایک باقاعدہ اور باتنخواہ پروفیسر کی حیثیت سے بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوا۔ پہلے یہ سامی زبانوں اور ان کے ادبیات کا پروفیسر رہا۔ 1914 میں فیکلٹی آف لاء کے تحت اسلامی فقہ کا صدر شعبہ بن گیا۔ اس طرح گولڈ زیہر نے مختلف اداروں میں اپنی خدمات انجام دیتے گئے اور 13 نومبر 1921ء کو اس کا انتقال ہوا۔

تصانیف

پروفیسر گولڈ زیہر کے بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن چند نہایت اہم اور بڑی معرکۃ الآراء کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔

1۔ فرقہ ظاہریہ: ان کا مذہب اور ان کی تاریخ 1884 میں شائع ہوئی۔ انگلش میں یہ کتاب (The Zahiris , there Doctrine and Their History) کے نام سے Wolfgang Behn کے ترجمہ سے، ای، جے بریل لیڈن سے 1971 میں منظر عام پر آئی۔

2۔ اسلامیات کا مطالعہ: یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے اول الذکر کتاب کے چند برس بعد منظر عام پر آئی۔ عربی میں یہ کتاب ((**دراسات اسلامیه**))کے نام سے "**خیر قدری، شیخة العطیة**" کے ترجمہ و تحقیق کے ساتھ "**مرکز الحضار العربیه للاعلام و النشر والدراسات**" سے ایک جلد میں چھپی ہے۔

---

[1] GoldZiher,*Introduction to islamis theology and law*,5.

3۔اسلامی دینیات اور قانون(Introduction to Islamic Theology and Law) : 1906 میں گولڈ زیہر کو امریکہ کی طرف سے اسلامی دینیات اور اسلامی فقہ کے عہد بہ عہد ارتقاء پر چھ تقاریر کی دعوت موصول ہوئی۔ گولڈ زیہر نے یہ دعوت قبول کر کے کچھ مدت میں لیکچرز تیار کر لیے، لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کمزوری کی بناء پر گولڈ زیہر کو امریکہ کا یہ سفر منسوخ کرنا پڑا۔اور انھوں نے یہ لیکچرز کتابی شکل میں چھپوایا۔

4۔'' **مذاهب التفسير الاسلامی**'' اس کتاب میں تفسیر قرآن کے مختلف مناہج پر بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے۔اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ڈاکٹر عبد الحلیم النجار نے کیا ہے جو جامعہ قاہرہ میں پروفیسر ہیں،اسے مکتبۃ الخانجی، مصر نے شائع کیا ہے[1]۔

اس کی اور بھی بہت ساری کتابیں ہیں جن کی تدوین کر کے انھیں شائع کیا ہے۔

مستشرقین کی اسلامی تحقیقات پر جتنا اثر انداز گولڈ زیہر کا ہوا ہے،اتنا اس کا کوئی دوسرا معاصر مستشرق نہیں ہوا[2] ۔

گولڈ زیہر نے جرمن،انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں کتب تصنیف کیں جن کا تعلق اسلامی فرقوں کی تاریخ، فقہ، عربی ادب اور علومِ قرآنیہ سے تھا۔اس نے اپنی زندگی کے کئی سال اِسلامی موضوعات کی تحقیق و تفتیش میں گذارے اور متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا اور مختصر عرصہ میں اس کی تالیفات و تعلیقات اور ابحاث و مقالات کی اچھی خاصی فہرست منظرِ عام پر آگئی[3]۔ گولڈ زیہر کی کتابوں میں سے 'مذاہب التفسیر الاسلامی' اس کے ترکہ میں بہت زیادہ اہمیت اور شہرت کی حامل ہے اور بلاشک وشبہ یہ کتاب مستشرقین کے لیے علمی سرمایہ ہے،اس کتاب میں اسلام کے مبادیات اور قرآنی علوم پر جس طرز اور اُسلوب سے بحث کی گئی ہے وہ مستشرقین کے نزدیک نہایت بلند مرتبہ کام ہے[4]۔

گولڈ زیہر کے نظریات میں بسا اوقات اسلامی مصادر اور اس کی تعلیمات کے حوالہ سے پوشیدہ روّیوں کا اظہار بھی ہوتا ہے جس کو نہ صرف مسلم علماء بلکہ خود مستشرقین نے بھی اعتراف کرتے ہوئے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا ہے۔چنانچہ پروفیسر برنارڈ لیوس نے گولڈ زیہر کی کتاب "Introduction to Islamic Theology and law کے حالیہ انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۹۷۹ء کے مقدمہ میں لکھا ہے:

---

[1] اکبر آبادی، سعید احمد، **پروفیسر اجناس گولڈ زیہر**،(اعظم گڑھ: دار المصنفین، شبلی اکیڈمی،،یو۔پی،ہند)،ص:39۔41

[2] الازہری، **ضیاء النبی**،ص:15/7

[3] موسیٰ، محمد یوسف، **العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام**،(قاہرہ: دار الکتب الحدیثہ،۱۹۵۹ء)،ص:۴

[4] موسیٰ، **العقیدۃ والشریعۃ**،ص:۵

''گولڈزیہر کو خیال ہی نہیں تھا کہ اس کی کتابوں کے قاری مسلمان بھی ہوں گے، اسلیے کہ یہ لوگ اپنا مخاطب مغرب کے قارئین کو ہی بناتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے دوسرے مصنفین کی طرح گولڈزیہر بھی قرآن کو پیغمبرِ اسلام کی تصنیف کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک ایسا کہنا اسلام کی سخت تنقیص ہے، علاوہ ازیں اسلام پر لکھنے والے تمام مغربی مصنفین کی طرح گولڈزیہر بھی قرآن وحدیث میں عہدِ جاہلیت کے بعض اجنبی اثرات پر بحث کرتا ہے۔ یہ موضوع بھی حساس مسلمانوں کے لیے سخت تکلیف دہ ہے''[1]۔

گولڈزیہر 'دائرۃ المعارف الاسلامیہ' کے محررین میں سے ایک ہے۔ قرآن پاک کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام قرار دیتا ہے اور اسلام کو مفتریات کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔[2]

اگناز گولڈزیہر کا مستشرقانہ رجحان :

مغربی دنیا میں گولڈزیہر، مذہب اسلام اور اس کے قوانین کے حوالے سے بہت مشہور تھا۔ اسلامی تعلیمات خاص کر قرآن اور حدیث کے حوالے سے مغربی دنیا میں اس نے شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس کی شہرت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ 16 مئی 1906ء کو امریکہ سے اسے اسلامی تاریخ و قانون پر لیکچر دینے کے لیے دعوت نامہ آیا۔ ان کا یہ لیکچرز علمی حلقوں میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس حوالے سے مغربی دنیا میں گولڈزیہر کو ''شیخ الاسلام'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مصطفی السباعی گولڈزیہر کے مستشرقانہ رجحان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''لا يحتاج جولد تسيهر إلى أي مقدمة من حيث علمه ، خاصة في موضوع القرآن الكريم وعلم الحديث ، فقلمه طليق وهناك الكثير من الشكوك في أنه أبو الفكر الشرقي''[3]۔

''ڈاکٹر مصطفی السباعی کے نزدیک گولڈزیہر اپنی علمی اعتبار سے کسی تعارف کا محتاج نہیں، قرآن مجید اور علمِ حدیث کے موضوع پر خصوصیت سے اس کا قلم پھیلا ہے اور متعدد شبہات قائم کیے ہیں جو بالکلیہ اِستشراقی فکر کی پیداوار ہیں''۔

گولڈزیہر کو مختلف زبانوں میں عبور حاصل تھا اس لیے انھوں نے اسلامی فرق، فقہ اسلامی، قرآنیات اور عربی ادب سے متعلق ان کی بہت سی تصنیفات جرمن، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ملتی ہیں۔ اس کی تحقیق کا دائرہ بہت وسیع تھا اور زیادہ تر اس کا تعلق یہودی اور سامی زبانوں (جن میں عربی زبان بھی شامل تھی) کے ادبی لٹریچر سے تھا۔

---

[1] GoldZiher,Ignaz, *Islamic Studies*، (Landon :Allen and Unwin Ltd., 1886),67.

[2] الفتاح، علیان محمد عبد، **اضواء علی الاستشراق**،، (کویت: دار البحوث العلمیۃ، ۱۴۰۰ھ)، ط:۱، ص:۹ ۔ ۵۲

[3] السباعی، **الاستشراق والمستشرقون**، ص:۳۳

گولڈ زیہر استشرقی اور اس کے افکار سے خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہا ہے اور اپنے کام کی نوعیت کے حوالے سے مستشرقین کے اس طبقہ میں شمار ہوتا ہے جس نے بقدر وسعت اسلامی تعلیمات پر مختلف تناظر سے مطالعہ کیا ہے۔اور اپنے من کے مطابق ان پر تنقید کی ہے۔ جس کو مسلم محققین اور خود مستشرقین نے بھی اعتراف کیا ہے۔اس حوالے سے مستشرق برنارڈ لیوس نے لکھا ہے: کہ

"Ignaz Goldziher did not anticipate that the readers of his books would be Muslims, because he addressed the readers of the West only. In the eyes of Muslims, to say so is a serious criticism of Islam. In addition, like all Western writers who have written on Islam, GoldZiher discusses in the Qur'an and Hadith some of the strange effects of the Age of Ignorance. This subject is also very painful for Muslims" [1].

" گولڈ زیہر کو یہ اندازا ہی نہیں تھا کہ اس کی کتابوں کے قاری مسلمان بھی ہونگے، کیونکہ انھوں نے اپنا مخاطب مغرب کے قارئین کو ہی بنائے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے دوسرے مصنفین کی طرح گولڈ زیہر بھی قرآن کو پیغمبرِ اسلام کی تصنیف کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک ایسا کہنا اسلام کی سخت تنقیص ہے،علاوہ ازیں اسلام پر لکھنے والے تمام مغربی مصنفین کی طرح گولڈ زیہر بھی قرآن و حدیث میں عہد جاہلیت کے بعض اجنبی اثرات پر بحث کرتا ہے۔یہ موضوع بھی مسلمانوں کے لیے سخت تکلیف دہ ہے"[2]۔

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ گولڈ زیہر کا مستشرقانہ رجحان اسلامی تعلیمات کے حوالے سے انتہائی سخت ہے۔ اس لیے وہ اسلامی تعلیمات میں خصوصاً اسلامی تعلیمات کی بنیاد قرآن و حدیث پر من گھڑت اعتراضات کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔اس کی مستشرقانہ رجحان کے حوالے سے ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی لکھتے ہیں کہ :

گولڈ زیہر اپنی علمی بد یانتی، عداوت اور خطرات کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں، قرآن اور علم حدیث کے موضوع پر خصوصیت سے اس کا قلم پھیلا ہے اور متعدد شبہات قائم کیے ہیں جو بلکل استشراقی فکر کی پیداوار ہیں۔ وہ قرآن پاک کو کلامِ محمد قرار دیتا ہے اسلام کو مفتریات کا مجموعہ مانتا ہے[3]۔

---

[1] Goldziher،Ignaz , *Islamic Studies* ,86.

[2] کھگہ ، فیروز الدین شاہ، **مطالعہ اسلام اور استشراقی تنقیدات**، ص:67

[3] السباعی، **الاستشراق والمستشرقون**، ص:33

گولڈ زیہر ایک یہودی مستشرق ہے۔ جو حدیث پر اعتراضات کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے۔ اس نے کتاب مذاہب التفسیر لاسلامی کے پہلے باب کے ابتدائیہ میں قرآت قرآنیہ کے ضمن میں سبعہ احرف کی روایات کو موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے[1]۔

اس کے اہم ترین اعتراضات تین ہیں۔

قرآنی متن دیگر تمام کتب سماویہ کے برعکس زیادہ اضطراب، تحریف اور عدم ثبات کا شکار ہوا[2]۔

قرآت کا اختلاف مصحف عثمانی کے رسم الخط کے نقطوں اور اعراب سے خالی ہونے کے سبب وجود میں آیا اور یہ تمام قرأت انسانی اختراع ہیں[3]۔

صحابہ کرام کے مصاحف میں باہم کمی بیشی کا فرق موجود تھا۔ مثلاً حضرت عبداللہ ابن مسعود کے مصحف میں سورۃ الفاتحہ اور معوذتین نہ تھیں۔ جبکہ ابی بن کعب کے مصحف میں سورۃ الخلع اور سورۃ الحفد کی اضافی سورتیں شامل ہیں[4]۔

قرآن کریم اور تفسیر کے میدان میں مستشرقین نے بہت کام کیا ہے۔ تفسیر کے میدان میں مستشرقین میں سے ایک مشہور مستشرق گولڈ زیہر ہے اس کی تفسیر 'مذاہب التفسیر الاسلامی' ہے۔ اس کتاب کا عربی زبان میں دو بار ترجمہ ہو چکا ہے۔ ایک ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے کیا اور دوسری مرتبہ 1953ء میں ڈاکٹر عبدالحلیم النجار نے کیا ہے۔ یہ کتاب مستشرقین کے نزدیک ایک اساسی اور بہت اہم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کا منہج کچھ یوں ہے:

پہلے مبحث میں قرأت قرآنیہ کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اکثر اپنی مدعا ثابت کرنے کے لیے شاذ اور ضعیف قرأتوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ دوسری مبحث میں تفسیر بالماثور کو زیر بحث لایا گیا اور اس میں بھی اکثر ضعیف روایات کو من پسند نتائج کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

پھر ایک فصل ''تفسیر عقدی'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے اور اس میں زیادہ تر باطنی اتجاہات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کے بعد '' تفسیر دینی فرقوں کے نزدیک '' کے عنوان سے ایک فصل قائم کی گئی ہے اس میں نظریات کو خلط ملط کیا گیا ہے۔ اور آخری فصل میں '' اسلامی تمدن کی روشنی میں تفسیر '' کے عنوان سے ہے اور اس میں محمد عبدہ اور اس کے

---

[1] النجار، عبدالحلیم، **مذاہب التفسیر الاسلامی**، (قاہرہ: مکتبہ الخانجی)، ص: 8

[2] ایضا، ص: 8

[3] شلبی، عبدالتفاح اسماعیل، **رسم المصحف العثمانی واوہام المستشرقین فی قراءات القرآن الکریم: دوافعہا ودفعہا**، (مصر: مکتبہ نہضۃ، ۱۹۶۰ء) ص: 75

[4] ایضا، ص: 75

شاگردوں کی تفسیری اتجاہ کا بیان ہے۔ گولڈ زیہر اس مدرسے کو ''دور حاضر کے معتزلہ'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور اس فصل میں بھی زیادہ تر وہ چیزیں ہیں جس میں مدرسہ محمد عبدہ (مدرسہ منار) نے جمہور اہل السنت کی مخالفت کی ہے۔

وہ غلطیاں جو تفسیر کے میدان میں گولڈ زیہر سے سرزد ہوئی ہیں وہ ابھی تک مسلسل کے ساتھ مستشرقین کے علمی تحقیقات میں چلتی آرہی ہیں کیونکہ ابھی تک مستشرقین تفسیر اور علوم القرآن کو اصلی مصادر نہیں بلکہ گولڈ زیہر جیسے مستشرقین کی تصنیفات اور تحقیقات سے اخذ کرتے ہیں[1]۔

اسلامی تصوف اور اس کے بنیادی مصدر قرآن کریم پر گولڈ زیہر (Ignaz Goldziher) کا طرز عمل :

اسلامی تصوف کے حوالے سے گولڈ زیہر اس بات کا قائل ہے کہ اسلامی تصوف بدھ مت کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔

"Indian influence is evidenced by some literary works, and it is manisfested by the admission od hindu elements into the gamut of muslim religious ideas.in the second Islamic century , when the vigorous activity of translators expended .... specifically Buddhist works were also translated into Arabic"[2].

اس حوالے سے راجہ قاسم محمود نے اپنے ایک مقالے میں اس طرح تحریر کیا ہے۔

''کہ ابو ریحان البیرونی نے اس حوالے سے بہت کچھ لکھا انھوں نے ہندوؤں کے احوال، عقائد، علوم اور دینی و فلسفی مسالک کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور ان کا فلسفہ یونان اور اس کے ساتھ مسلمان صوفیاء کے اقوال وطریق سے تقابل کیا ہے۔ البیرونی نے حکماء ہندو، یونان اور صوفیہ مسلمین کے درمیان کئی چیزوں کو مماثل قرار دیا جیسے کہ ترک وسائط اور خلع علائق۔۔۔ اس کے بعد ڈاکٹر حلمی لکھتے ہیں کہ ہندومت کے تناسخ کے عقیدے کو وحدت الوجود کے مماثل قرار دے کر سمجھا جانے لگا اور بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ حلول اور وحدت الوجود ایک ہی چیز ہے۔ ڈاکٹر مصطفی حلمی کہتے ہیں کہ البیرونی کے نظریہ کی تائید کئی یورپی مستشرقین نے بھی کی جن میں ہارٹن، گولڈ زیہر اور اولیری نمایاں ہیں. گولڈ زیہر نے کہا کہ حضرت ابراہیم بن ادھم کی زندگی کا واقعہ کہ انھوں نے بادشاہت اور امارت ترک کر کے فقر وفاقہ کی زندگی اختیار کی ہو بہو گوتم بدھ کی سوانح زندگی سے ماخوذ ہے''[3]۔

---

[1] ثناءاللہ، حسین، **قرآن اور مستشرقین**، (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، 2010ء)، ص: 221

[2] Goldziher, Ignaz, *Introduction to islamic Theology and Law*, 141.

[3] https://www.mukaalma.com/21115/tasawwuf (Accessed.22-03-2022)

اس طرح گولڈ زیہر اس بات کے بھی قائل ہے کہ اسلامی تصوف نصرانیت سے متاثر ہے۔

"Occeasionally even the Sufi mystical doctrine were pervaded by this cult.Moreover in proportion as they were removed from orthodoxy…that Christian had deep connections with the Arabs and that Christian,s intellectual background was very strong from the Arabs, so his thoughts and ideas had an impact on the Arabs.."[1]

تصوف کی بابت ایک خیال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ یہ نصرانیت سے متاثر ہے دلیل وہ ہی سابقہ پیش کی جاتی ہے جو فارسی اثر کے بارے میں دی جاتی ہے کہ عربوں کے ساتھ عیسائیوں کے گہرے روابط تھے اور کیونکہ عیسائیوں کا علمی پس منظر عربوں سے بہت مضبوط تھا اس لیے اس کے خیالات وافکار کا عربوں پر اثر پڑا۔

گولڈ زیہر اسلامی تصوف کو اسلامی تعلیمات کا حصہ نہیں سمجھتے ہیں بلکہ غیر از قرآن و سنت قرار دیتے ہیں اس حوالے سے ایک انٹر نیشنل مجلہ "تواریخ" میں Mohd Syukri Yeoh Abdullah اپنے ایک تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں۔

"Orientalists, the like of Reynold A. Nicholson (1951 and 1975), E.G. Browne (1951), and the writings of Ignaz Ignaz Goldziher as compiled by J.S. Trimingham (1949), have caused untold damage to Islamic su6ism by their insidious innuendoes about tasawwuf not being Islamic, but an assimilation of Greek, Persian, Hindu, Buddhist, and other non-Islamic philosophy"[2].

اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ گولڈ زیہر اسلامی تصوف کو یونانی، فارسی، ہندو، بدھ مت اور دیگر غیر اسلامی فلسفے سے ماخوذ سمجھتا ہے۔

کرامات و مراتب اولیاء:

گولڈ زیہر اپنی کتاب "Muslim Studies" میں کرامات و مراتب اولیاء کو اپنا موضوع اور ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ صوفیاء کے لیے مکار، بھکاری اور درویش کا لفظ استعمال کیا ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

During the fifth century of the Hijar, when the veneration of saints with all its excesses dominated the world of Islam , there lived a muslim mystic

[1] Goldziher ,*Introduction to islamic Theology and Law*,140.

[2] Abdullah ,Mohd syukri Yeoh,Tasawwuf: An Impetus to Islamic Revivalism in the Malay world, *TAWARIKH* 2, no. 2 (2011):175-190.

called Samnun and surnamed al Muhibb, the loving one, he who is sunk in the love of Allah.[1]

پانچویں صدی ہجری میں جب تعظیمِ صوفیاء اپنی تمام تر رفعتوں کے ساتھ دنیائے اسلام پر غالب آگئی ایک مسلمان درویش تھا جس کا نام سیمنون تھا اور آبائی نام المحب یعنی پیار جو اللہ کی محبت میں مستغرق ہو[2]۔

اسلامی تصوف کے بہت سے بنیادی مصادر ہیں ان میں سے جو سب سے اہم اور بنیادی مصدر قرآنِ مجید ہے۔ مستشرقین نے اسلامی تصوف کے اس بنیادی مصدر پر مختلف حوالوں سے تنقید کا نشانہ بنایا۔قرآنی متن کی تحقیق و توثیق کے حوالے سے مستشرقین کے علمی کام کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ وہ در حقیقت وحی کی اصل روح کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔اس کی وجوہات میں ان کے پہلے سے طے شدہ مقاصد کارفرما ہوں یا اسلام کے مصادر کا حقیقی فہم حاصل کرنے کی عدمِ صلاحیت ہو، بہر حال ان کی تحقیقی نگارشات میں دیانتدارانہ رویوں کے برعکس مصادر اسلامیہ کو مشکوک قرار دینے کے جذبات منعکس ہوتے نظر آتے ہیں۔

ان مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے مستشرقین نے مسلمانوں کے ذہنوں میں قرآن کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی اور اسی مقصد سے دو بنیادی قسم کے اعتراضات کو اپنا محور بنایا۔

پہلا محور قرآن کی جمع و تدوین اور دوسرا محور قرآن کی قرآت کا اختلاف

ان مقاصد کو لے کر بہت سے مستشرقین نے اس پر کام شروع کیا ان میں سے ایک مشہور مستشرق گولڈ زیہر ہے۔ گولڈ زیہر وہ مستشرق ہے جس نے متنِ قرآنی اور قرأت کے حوالے سے باقاعدہ اور رسمی طور پر بحث و تحقیق کا آغاز کیا۔اس نے مذاہب التفسیر الاسلامی کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے پہلے باب میں قرأت قرآنیہ کے ضمن میں سبعہ احرف کی روایات کو موضوع اور من گھڑت قرار دیا۔ یہاں اس مقالہ کے اس فصل میں گولڈ زیہر کے متنِ قرآن کے حوالے سے جو افکار ہیں ان کو تحریر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

گولڈ زیہر کا قراءاتِ قرآنیہ کو موضوع بنانے کا مقصد

قرأتِ قرآنیہ کو خاص موضوع بنانے کا اصل ہدف ہے کیونکہ قرأت قرآنیہ براہِ راست قرآن سے تعلق رکھتا ہے، اگر اس میں شکوک وشبہات پیدا کر دیے جائیں تو خود مسلمانوں کے دلوں میں قرآن کی صحت پر اعتبار متزلزل ہو جائے گا، چنانچہ مستشرقین نے قرآن کو ہدفِ تنقید بنانے کیلیے قراءات قرآنیہ موضوع بحث بنایا۔

---

[1] Goldziher,*Muslim Studies*,258.

[2] ضمیر الدین، **گولڈزیہر کے اسلامی تصوف پر اعتراضات کا تحقیقی جائزہ**(مقالہ ایم فل علوم اسلامیہ،یونیورسٹی آف سرگودھا،2016)ص:136

اجناس گولڈ زیہر اور نظریہ ارتقاءات قرآنیہ

اجناس گولڈ زیہر مستشرقین کے اس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جس نے اسلامی شریعت اور اس کے بنیادی مصادر کو اپنی تنقید کا خصوصی مرکز بنایا ہے۔ بوڈاپسٹ (Budapest)، برلن (Berlin)، لیپزگ (Leipzig) اور لائیڈن (Leiden) کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتا رہا بعد ازاں شوقِ علم اس کو شام کے مشہور عالم شیخ طاہر الجزائری کی پاس لے گیا اور ان کی صحبت میں کافی عرصہ گذارا، اس کے بعد فلسطین اور پھر مصر منتقل ہوا جہاں جامعہ الازہر کے علماء سے استفادہ کیا۔

قرآن مجید کی قرأت، تفسیر اور تفسیر کے مختلف مناہج واَسالیب کے حوالہ سے گولڈ زیہر کی مشہور کتاب کا عربی ترجمہ ''مذاہب التفسیر الاسلامی'' کے نام سے قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر عبدالحلیم النجار نے کیا ہے یہ ترجمہ پہلی 1955 میں مصر سے شائع ہو کر اربابِ علم وادب میں بہت مقبول ہوا۔

اگرچہ اسلامی موضوعات میں تحقیق کے دوران قرأتِ قرآنیہ براہِ راست اور مستقل طور پر گولڈ زیہر کا موضوع نہیں رہا تاہم 'مذاہب التفسیر الاسلامی' میں خاص طور پر پہلے باب کے آغاز میں ۷۰ صفحات، قرآنی متن میں اِضطراب اور نقص ثابت کرنے کے لیے حدیث سبعۂ احرف کی اِستنادی حیثیت اور قرأت کی حجیت وقطعیت پر بہت سے اعتراضات وشبہات پر مشتمل ہیں۔ جن میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

نصِ قرآنی میں شبہات

گولڈ زیہر نے قرآن کے نص جو کہ قرآن کا بہت اہم حصہ ہے اس میں شبہات اور غیر ثابت متن قرار دینے کے لیے قرأت کو اپنا سہارا بنایا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ تمام تشریعی کتب میں سے قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کو سب سے زیادہ اِضطراب اور عدمِ ثبات کا سامنا کرنا پڑا، اس نے دیگر کتب سماویہ سے قرآن کا تقابل کرتے ہوئے نصِ قرآنی کی بابت زیادہ شبہات پیش آنے کا نظریہ قائم کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

> **''لایوجد کتاب تشریعی اعترفت به طائفة دینیة اعرافاً عقدیا علی انه نص منزل أو موحی به یقدم نصه فی أقدم عصور تداوله مثل هذه الصورة من الاضطراب وعدم الثبات کما نجد فی نص القرآن''**[1]۔

---

[1] النجار، عبدالحلیم، **مذاہب التفسیر الاسلامی**، ص: ۴

یعنی کسی بھی مذہب کے عقیدہ کی آسمانی یاالہامی کتاب جس کی نص کو موجودہ دور میں سب سے زیادہ اضطراب اور عدمِ ثبات کا مسئلہ درپیش ہے وہ قرآنی نص ہے۔

اس شبہ کا جواب دینے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس طرح کے اشکالات ملحدین بہت پہلے سے کرتے چلے آرہے ہیں اور اہلِ علم ان کا بڑی شدومد سے جواب بھی دے چکے ہیں۔ نصِ قرآنی کی عدمِ توثیق کے حوالہ سے بنیادی طور پر ابن قتیبہ (م۲۷۶ھ) نے متفرق بنیادی شبہات کا اصولی رد کردیا ہے اور اس اعتراض پر تفصیلی کلام کیا ہے[1]۔

ہمارے خیال میں مستشرق موصوف کا یہ دعویٰ دو لحاظ سے بڑا تعجب خیز ہے:

( ) گولڈ زیہر نے سابقہ شریعتوں کی کتب کو ان کی اصلی نصوص میں نہیں دیکھا تو کیسے حکم لگا سکتا ہے کہ ان میں قرآن کی طرح متعدد قرأت و وجوہ نہیں تھیں۔

( ) جبکہ اسی باب میں گولڈ زیہر تلمود، تورات کے ایک ہی وقت میں کثیر زبانوں میں نازل ہونے کا قول اختیار کرتا ہے[2]۔

اس طرح دیگر کتبِ سابقہ کی نصوص میں اختلافات کا ایک کثیر حصہ ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں۔ اس کا اقرار خود گولڈ زیہر ان الفاظ میں کرتا ہے:

ای نسخة من التوراة کان یستخدمها فی الدراسة[3]۔

اس حوالے سے یوں کہا جائے تو بہتر ہے کہ گولڈ زیہر کا یہ اعتراض قابل غور نہیں ہے تاریخی اور نقلی ہر اعتبار سے باطل ہے جس پر دلائل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ نصِ قرآنی کو کسی قسم کا کوئی اضطراب یا عدمِ ثبات پیش نہیں آیا، کیونکہ اِضطراب اور عدمِ ثبات کا مطلب یہ ہے کہ کسی نص کو مختلف وجوہ اور متعدد صورتوں پر اس طور پڑھا جائے کہ ان صورتوں کے مابین معنی اور مراد ایک دوسرے کے منافی اور معارض ہوں یا ان کا ہدف و مقصود بالکل مختلف چیزیں ہوں اور وہ مفہوم ایسا ہو کہ روایات سے اس کا ثبوت بھی نہ ہو، لیکن اگر نص میں وارد ہونے والی مختلف صورتیں متواتر روایات پر مبنی ہوں اور معنی میں بھی تضاد واقع نہ ہو تو اس کو اضطراب یا عدمِ ثبات نہیں کہا جاتا۔ جبکہ قرآن میں موجود وجوہ اور صورتیں ہر قسم کے تناقض سے پاک ہیں اور نہ ہی ان کے معانی میں تعارض و تضاد ہے بلکہ وہ تمام صورتیں ایک دوسرے کو ظاہر اور ثابت کرتی ہیں۔

---

[1] ابن قتیبہ، ابو محمد بن عبداللہ مسلم، **تاویل مشکل القرآن**، (القاہرہ: دار التراث، ط: ۲، ۱۹۹۳ء)، ص: ۲۴۔۲۵

النجار، عبدالحلیم، **مذاہب التفسیر الاسلامی**، ص: ۵۳

[3] ایضا، ص: 86

قرآن کی معتمد قراءات، بسااوقات، ایک ہی نص میں مختلف ہوتی ہیں، لیکن ان سب کی نسبت چونکہ مصدرِ اصلی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف ہوتی ہے لہٰذا وہ تمام صورتیں بھی قرآن ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بقول قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دی کہ جس میں سہولت ہو وہی اختیار کر لو[1]۔

بعض عیسائیوں نے غالباً اپنی کتاب میں بے شمار تحریفات اور انجیل کے مختلف نسخوں میں اختلافات کو قرآنی قرأت کی طرح قرار دیتے ہوئے یہ کہا کہ:

إننا مختلفون فی قراءة کتابنا فبعضنا یزیدحروفا وبعضنا یسقطها[2]۔

اس کے جواب میں علامہ ابن حزم رحمہ اللہ (م ۴۵۶ھ) نے قرآنی قراءات کے اختلاف کی نوعیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

> **"فلیس هذا اختلافا، بله و اتفاق منا صحیح؛ لان تلک الحروف وتلک القراء ات کلها مبلغ بنقل الکواف إلی رسول الله صلی الله علیه و اٰله وسلم إنها نزلت کلها علیه؛ فأی تلک القراءات قرآنا فهی صحیحة وهی محصورة کلها مضبوطة معلومة لازیادة فیها ولا نقص؛ فبطل التعلق بهذا الفصل والله الحمد"**[3]۔

امام قرافی رحمہ اللہ نے نصاریٰ کے اس زعم کے جواب میں کافی طویل بحث کی ہے جس میں انھوں نے انجیل اور قرآنی آیات کے درمیان فروق کو واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قراءاتِ مختلفہ کی اِجازت کا پس منظر قبائلِ عرب کی مختلف لغات تھیں، کوئی امالہ کرتا تو کوئی تفخیم، کسی کی لغت میں مد ہے کسی میں قصر، کسی کے نزدیک حروف میں جہر ہے تو کسی کے نزدیک اخفاء۔ اگر سب کو ایک ہی لغت کا مکلف قرار دیا جاتا تو ان کو مشقت اٹھانی پڑتی، اس مشقت کو دور کرنے کیلیے قرأت نازل ہوئیں اور یہ سب کی سب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متواتر طریقہ سے مروی ہیں۔ سو ہمیں ان تمام قرأت پر اعتماد ہے کہ یہ من جانب اللہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دہن مبارک سے نکلی ہوئی ہیں۔ اس کے برعکس عیسائی اپنی اناجیل کے مصنفین کو عادل راویوں کے ذریعہ ثابت کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ اس لحاظ سے عالمِ عیسائیت کے

---

[1] باز مول، محمد بن عمر بن سالم، **القراءات واثرہا فی التفسیر والاحکام**، (مصر: دار الکتب العلمیۃ، 1986) ص: 315/1

[2] ابن حزم، **الفصل فی الملل والاہواء والنحل** (بیروت: دار المعرفۃ للطباعۃ والنشر، ط ۲، ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء)، ص: ۲/۷۶

[3] ابن حزم، **الفصل فی الملل والاہواء والنحل**، ص: 77

پاس انجیل کے کسی حرف کے بارے میں یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اللہ کا کلام ہے لہٰذا انجیل کے حاملین، مسلمانوں کے قرآن کے اصول و قواعد کا اپنی کتاب پر اطلاق کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں[1]۔

غرض یہ کہ اختلافِ قرأت، اضطراب اور عدمِ ثبات کے قبیل سے نہیں بلکہ یہ سب قرأت ہمیں یقینی طور پر رسول اللہ سے بطریقِ تواتر وصول ہوئی ہیں اور ان میں سے ہر قرأت قرآن ہے۔ لہٰذا گولڈ زیہر کا یہ شبہ کسی طرح کی عقلی و نقلی دلیل سے قطعاً عاری ہے اور اگر یہ قرآن کسی غیر کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف ہوتا، لیکن چونکہ یہ اللہ کا کلام ہے اس لیے اختلافات سے پاک ہے۔ تاہم اختلافِ قرأت کی نوعیت سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔

قرأت کا اختلاف اس اختلاف کے قبیل سے نہیں جس میں تضاد یا تناقض پایا جاتا ہے بلکہ یہ اختلاف، تغایر اور تنوع کا ہے جو قرآنی اعجاز کی علامت ہے۔ ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الاختلاف نوعان: اختلاف تغاير، واختلاف تضاد فاختلاف التضاد لايجوز، وليست واجده بحمد الله فى شئ من القرآن الا فى الامر والنهى من الناسخ والمنسوخ واختلاف التغاير جائز''[2]۔

تغیر و تنوع کا یہ اختلاف قرآنی قرأت میں موجود ہے اور ہر قرأت ایک مستقل آیت کے حکم میں ہے یقیناً یہ اختلاف 'ایجاز' کو واضح کرتا ہے۔ قرآن کا سارا مزاج ارشاد و تعلیم کے اسی راستہ پر چلتا ہے۔

ابن تیمیہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ولا نزاع بين المسلمين أن الحروف السبعة التى أنزل القرآن على ها لا تتضمن تناقض المعنى وتضاده، بل قد يكون معناها متفقاً أو متقارباً، كما قال عبد الله ابن مسعود: إنما هو كقول أحدكم: اقبل، وهلم وتعال''[3]۔

اور مسلمانوں کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قرآن جن سات حروف پر نازل ہوا ہے ان میں معنی میں تضاد اور اس کے مخالف نہیں ہیں۔ جیسا کہ عبداللہ ابن مسعود نے کہا: یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم میں سے کسی نے کہا: آگے بڑھو، آؤ اور آؤ۔

قرأت کے مابین اختلاف کی ممکنہ صورتیں

قرأت کے مابین اختلاف تین حال سے خالی نہیں ہوتا:

---

[1] کھگہ، فیروز الدین شاہ، **مطالعہ اسلام اور استشراقی تنقیدات**، ص:72

[2] ابن قتیبہ، **تاویل مشکل القرآن**، ص ۳۳

[3] ابن تیمیہ، **مجموع الفتاویٰ**، (سوریا مطبعۃ الرسالۃ، ط ۱، ۱۳۹۸ھ)، ۱۳/ ۳۹۱

( )لفظ مختلف ہوں اور معنی متحد۔

( )لفظ اور معنی دونوں مختلف ہوں، لیکن تضاد کے بغیر ایک مفہوم میں جمع ہوں۔

( )لفظ اور معنی مختلف ہوں، ایک شے میں اجتماع بھی ممکن نہ ہو، لیکن ایک دوسری وجہ سے تضاد کے بغیر جمع ہو جائیں[1]۔

تنوعِ قرأت کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

( ) رَبَّنَا بَاعِدْ اور بَاعَدَ [2]۔

( ) اِلَّا اَنْ يُّخَافَا الّا يُقِيمَا اور الَّا اَنْ يَخَافَا الا يقِيْمَا[3]۔

( ) وَاِنْ كَانَ مَكْرہم لِتَزُوْلُ اور لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَال[4]۔

( ) يخدعون اويخادعون[5]۔

( ) يَكْذِبُوْنَ اور يُكَذِّبُوْنَ[6]۔

( ) لمستُمْ اورلامستم[7]۔

( )حَتَّى يَطْهُرْنَ اور يَطَّهَرْنَ[8]۔

ہر قرأت دوسری قرأت کے لیے ایسی ہی ہے جیسے ایک آیت دوسری آیت کے لیے، ہر ایک پر ایمان واجب ہے اور جو معنی وہ قرأت رکھتی ہیں اس کا اتباع بھی واجب ہے۔ تعارض کا گمان کرتے ہوئے دو وجوہ میں سے کسی ایک کو ترک کرنا جائز نہیں بلکہ خود حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

---

[1] ندوی، محمد ثناءاللہ، **علوم اسلامیہ اور مستشرقین**، ص:262

[2] سبا:۱۹

[3] البقرۃ:۲۲۹

[4] ابراہیم:۴۶

[5] البقرۃ:۹

[6] البقرۃ: ۱۰

[7] النساء:۴۳

[8] البقرۃ:۲۲۲

((مَنْ كَفَرَ بِحَرْفٍ مِنْهُ فَقَدْ كَفَرَ بِهِ كُلِّهِ))[1]۔

جن قرأت میں لفظ اور معنی دونوں متحد رہتے ہیں ان کا تنوع دراصل کیفیتِ نطق میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً: ہمزات، مدات، امالات اور نقلِ حرکات، اظہار، ادغام، اختلاس، لام اور راء کو باریک کرنا یا موٹا کرنا وغیرہ جن کو قراء 'اصول' کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں کوئی تناقض اور تضاد نہیں ہوتا، کیونکہ ایک لفظ کی ادائیگی کے مختلف طریقے لفظ کو مختلف نہیں بناتے بلکہ لفظ بدستور اسی طرح رہتا ہے اور بسا اوقات اَدائیگی کے انہی طریقوں سے متعدد معانی نمودار ہوتے ہیں جو رسم میں متحد ہونے کے باوجود متنوع معانی کے حامل ہوتے ہیں[2]۔

غرض جملہ قرأت حق ہیں اور ان کا اختلاف بھی حق ہے، اس میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں۔ قرآن مجید ہر تحریف و تبدیلی یا اضطراب و اختراع سے پاک واحد کتاب ہے جس کا تقابل دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی۔ چنانچہ یہ دعویٰ بر محل ہوگا کہ قرآن ہی وہ واحد کتاب ہے جس کی نص کو اضطراب اور عدمِ ثبات پیش نہیں آیا اور باقی تمام کتب تحریفات کا شکار ہوئی ہیں اور اس حقیقت کے دونوں پہلوؤں کے دلائل مختصر انداز سے تحریر کر دیے گئے ہیں۔

قرآن کے متعدد متون اور عدم وحدت

گولڈ زیہر اپنی کتاب میں مختلف قرأت پر تنقید اور ان کو قرآنی متن میں سببِ اضطراب قرار دینے کے ساتھ ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ مختلف قرأت دراصل قرآن کے متعدد متون ہیں اور تاریخِ اسلامی کے کسی دور میں نصِ واحد کے ساتھ قرآن منظرِ عام پر نہیں آسکا ماسوا چند اقدامات کے جن کا اثر مستقل نہیں رہا۔ اس ضمن میں وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن کے کارنامہ کو نصِ قرآنی کی وحدت کی طرف اہم قدم قرار دیتا ہے، لکھتا ہے:

''وفی جمیع الشوط القدیم للتاریخ الإسلامی لم یحرز المیل إلی التوحید العقدی للنص إلا انتصارات خفیفة ''[3]۔

''اسلامی تاریخ کے تمام قدیم دور میں، متن کے نظریاتی اتحاد کی طرف رجحان کو صرف معمولی کامیابیاں حاصل ہوئیں''۔

اس شبہ کا حاصل دو چیزیں ہیں:

---

[1] شیبۃ، أبو بکر ابن أبي، **الکتاب المصنف في الأحادیث والآثار**، (الریاض: مکتبۃ الرشد، 1409ھ) باب: من کرہ ان یقول اذا قرا القرآن: لیس کذا، ح: 30109 ص: 136/6

[2] ابن تیمیہ، **مجموع الفتاویٰ**، ۱۳/ ۳۹۲

[3] النجار، **مذاہب التفسیر الاسلامی**، ص ۵

اول: قرأتِ مختلفہ قرآن کے متعدد متون ہیں، لہٰذا قرآن ایک نہیں ہے۔

دوم: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کو ایک کر دیا۔

گولڈ زیہر اپنے شبہات میں تدریجی رنگ اختیار کرتے ہوئے اوّلاً نصِ قرآنی کو مضطرب گردانتا ہے پھر جمعِ عثمانی سے ماقبل مصاحف کا مصحفِ عثمانی سے تقابل کرتا ہے جس کے بعد اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قرآن کے مختلف Versions ہیں۔ اس کے بعد مذکورہ بالا شبہ پیش کیا جو سابقہ شبہات کا ہی تسلسل ہے۔

گولڈ زیہر کے نزدیک مسلمان ہمیشہ قرآنی نص کی وحدت کی طرف رغبت رکھتے تھے لیکن ان کی یہ خواہش بارآور ثابت نہیں ہو سکی البتہ دورِ عثمانی میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی۔ یہاں یہ واضح رہے کہ گولڈ زیہر بھی دیگر مستشرقین کی طرح دلائل سے قطع نظر پہلے سے طے شدہ نظریات ہی کو اپنا واحد وظیفہ بناتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان دعووں پر اس نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ بہر صورت اس شبہ کی دوری کے لیے کچھ نکات ملاحظہ ہوں:

- اول: کسی ایک مسلمان سے بھی یہ ثابت نہیں کہ اس نے کبھی یہ خیال کیا ہو کہ قرآن کریم کی کئی نصوص ہیں، ان کو ایک کر دیا جائے اور اگر ایسا ہوتا تو ہم تک یہ بات ضرور پہنچتی۔
- خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کی جو کتابت کروائی اور ان کو مختلف ممالکِ اسلامیہ کی طرف اِرسال کیا اور لوگوں کو اس پر مامور کیا، اس کا باعث توحید نصِ قرآنی کی طرف میلان نہیں تھا بلکہ تمام مسلمانوں کو قرأت ثابتہ پر اکٹھا کرنے کی رغبت تھی تاکہ متواتر قرأت کے علاوہ قرأت کا خاتمہ ہو اور امت پر آسانی اور سہولت ہو جائے[1]۔
- مصاحف میں قرآن کی کتابت کا سبب یہ تھا کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اہلِ حمص، اہلِ دمشق اور اہلِ کوفہ وبصرہ کی یہ خبر پہنچی کہ ان میں سے ہر ایک اپنی قرأت کو دوسرے کی قرأت سے بہتر کہتا ہے اور لوگ نزاع میں مبتلا ہو رہے ہیں تو اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے تقریباً بارہ ہزار کی تعداد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمع ہوئے اور یہ رائے دی کہ لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیا جائے۔ چنانچہ خلافتِ ابو بکر رضی اللہ عنہ میں جمع کردہ مصحف کو، جو اس وقت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا، منگوا کر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ایک جماعت کو حکم دیا کہ وہ اس سے عرضۂ اخیرہ کا لحاظ رکھتے ہوئے مصاحف تیار کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان مصاحف کی تیاری کے بعد ہر مصحف کے ساتھ ایک ایک قاری بھی مختلف شہروں میں بھیجا تاکہ وہ رسمِ

---

[1] القاضی، عبد الفتاح، **القراءات فی نظر المستشرقین والملحدین**، (دار مصر للطباعۃ، ۱۴۰۲ھ)، ص ۱۹

مصحف کے مطابق متواتر قرأت کی تعلیم دے۔ اس طرح ان علاقوں میں تابعین حفاظ کا ایک جمِ غفیر پیدا ہو گیا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے براہِ راست شاگرد تھے[1]۔

قاضی ابو بکر باقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"لم يقصد عثمان قصد أبى بكر فى جمع القرآن بين لوحين، وإنما قصد جمع هم على القراءات الثابتة المتواترة المعروفة عن النبى صلى الله عليه و اٰله وسلم والغاء ماليس كذلك"[2]۔

"یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا میلان اور قصد قرآن کو دو تختیوں میں جمع کرنا نہیں تھا بلکہ متواتر اور ثابت قرأت کا جمع و تحفظ مقصود تھا جو پورا ہوا۔"

- حافظ ابو عمرو الدانی رحمہ اللہ کا قول ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت نے باطل اور غیر معروف قراءات کی گنجائش کو مصحف سے نکال باہر کیا اور صرف منقول اور متواتر قراءات کو محفوظ کر دیا۔ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل اور قصد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قصد، قرآن کو دو گتوں میں محفوظ کرنے، کی طرح نہ تھا بلکہ یہ قرأتِ ثابتہ کو جمع کرنا تھا[3]۔
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنی متن کو نقاط اور اعراب سے خالی رکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کا میلان اور رغبت لوگوں کو متواتر قرأت پر جمع کرنا تھا اور منسوخ و شاذ قرأت سے چھٹکارا دینا تھا[4]۔
- اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصد توحید نصِ قرآنی ہوتا تو وہ مصاحف کو ایک ہی صورت میں لکھواتے اور ان کے مابین کوئی اختلاف بھی موجود نہ ہوتا۔ پس مختلف صورتوں اور متعدد کیفیات پر اس کی کتابت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے توحید نصِ قرآنی کا ارادہ نہیں کیا بلکہ بطریقِ تواتر منقول قرأت پر لوگوں کو جمع کرنا مقصود تھا[5]۔

---

[1] الاندلسی، عبدالواحد بن عاشر، **تنبیہ الخلان علی الاعلان بتکمیل مورد الظمآن**، (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ط۱، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء)، ص: ۲۸۲

[2] القاضی، **القراءات فی نظر المستشرقین والملحدین**، ص: ۹۳

[3] محمدی، ابراہیم میر، **مکانۃ القراءات عند المسلمین**، (لاہور: جامعہ لاہور الاسلامیہ، س۔ن)، ص۲۹۔۳۰

[4] القاضی، **القراءات فی نظر المستشرقین والملحدین**، ص۱۹۔۲۰

[5] ایضاً، ص۱۹۔۲۰

اختلافِ قرأت کا سبب مصاحف میں عدمِ نقطہ و حرکات:

گولڈ زیہر نے قرأت کے اختلاف کو رسمِ مصحف پر محمول کیا ہے، کہ قرأت کا اختلاف دراصل رسم کے نقاط و حرکات سے خالی ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنی کتاب المذھب الاسلامیہ میں لکھتے ہیں:

''والقسم الاکبر من هذه القراءات یرجع السبب فی ظهوره الی خاصیة الخط العربی، فان من خصاصه ان الرسم الواحد للکلمة الواحدة قد یقرءُ باشکال مختلفة ، تبعا للنقطة فوق الحروف او تحتها والقسم الاکبر من هذه القراءات یرجع السبب فی ظهوره الی خاصیة الخط العربی، فان من خصاصه ان الرسم الواحد للکلمة الواحدة قد یقرءُ باشکال مختلفة، تبعا للنقطة فوق الحروف او تحتها، کماان عدم وجود الحرکات النحویة، و فقدان الشکل فی الخط العربی، یمکن ان یجعل للکلمة حالات مختلفة من ناحیة موقعها من الاعراب، فهٰذه التکملات للرسمه الکتابی، ثمه هذه الاختلافات فی الحرکات و الشکل، کل ذالک کان السبب الاول لظهور حرکة القراءات فیما اهمل نقطه او شکله من القرآن''[1]۔

ترجمہ: ''ان قرأت کا بڑا حصہ بظاہر عربی خطاطی کی خصوصیات کی وجہ سے ہے، کیونکہ اس کی خصوصیت کے لحاظ سے کسی ایک لفظ کے ایک ڈرائنگ کو مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے، جو کہ حروف کے اوپر یا نیچے والے نقطوں پر منحصر ہے، اور اس کا بڑا حصہ یہ ریڈنگز بظاہر عربی خطاطی کی دو خصوصیات کی وجہ سے ہیں، کسی ایک لفظ کی ایک ہی ڈرائنگ کو مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے، حروف کے اوپر یا نیچے والے نقطوں کے لحاظ سے، بالکل اسی طرح جیسے گرامر کی حرکات کی عدم موجودگی، اور عربی خطاطی میں شکل کا نقصان، لفظ کو نحو میں اس کے مقام کے لحاظ سے مختلف صورتیں بنا سکتا ہے۔ حرکات اور شکل، یہ سب کچھ پڑھنے کی حرکت کے ابھرنے کی پہلی وجہ تھی، جبکہ قرآن سے ایک نقطہ کو نظرانداز کرنے کی صورت میں اس کی شکل مختلف ہوتی ہے''۔

گولڈ زیہر نے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے چند قرآنی الفاظ کی مثالیں بیان کی ہیں۔ موصوف کے نزدیک نقاط سے مصحف کے خالی ہونے سے قراء کے مابین اختلاف واقع ہوتا ہے۔ جیسا کہ **وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ** اس آیت میں گولڈ زیہر نے دوسرا احتمال یہ بیان کیا ہے کہ بغیر نقطے سے ممکن ہے کچھ اس طرح اس آیت کو پڑھے **تستکبرون** کی جگہ **تستکثرون**۔ لیکن یہ قراءاتِ اربع عشر میں سے کوئی قراءت نہیں ہے۔

---

[1] النجار، **مذاہب التفسیر الاسلامی**، ص: 4

گولڈ زیہر کے نزدیک خطِ عربی میں تشکیل و تعریب کا نظام نہ ہونے اور نحوی حرکات کی عدم موجودگی کی وجہ سے بھی قراءات میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ جبکہ غور کیا جائے تو قرآنی رسم کو اختلافِ قراءات قرار دینا کسی طور پر بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ غرض یہ کہ یہ بات روایات سے ثابت ہے کہ قرآنی قرأت کا مدار سینہ بہ سینہ منتقلی پر ہے نہ کہ کتابت پر۔ اور یہ بات بھی واضح ہے کہ قرأت نقطوں یا اعراب سے نہیں بنیں بلکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم سے براہِ راست سماع اور مشافہت پر مبنی ہے[1]۔

مستشرقین اس بات سے پوری طرح واقف تھے کہ مسلمانوں کے نزدیک قرآن کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور جب تک یہ کتاب ان کے ہاتھوں میں ہو گی، کامیابی کے راستے ان کے لیے کھلے رہیں گے۔ مسلمان اس بات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں کہ اس کتاب سے رہنمائی لیتے ہوئے وہ کسی بھی وقت پوری کائنات کو مغلوب کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ اس لیے مستشرقین نے اسی کتاب کو ہدفِ تنقید بنایا اور اس مصدر اصلی کو اس انداز میں اقوامِ عالم کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ کتاب دوسری آسمانی کتب کے ہم پلہ بن جائے۔ مستشرقین اور خاص کر گولڈ زیہر کا اسلامی تعلیمات پر اعتراضات محض چند مشترکات کو دیکھ کر کیا گیا ہے کہ جب اس نے دیکھا کی جو تعلیمات اسلام اوت تصوف کے بارے میں ہے وہی تعلیمات دوسرے مذاہب میں بھی ملتی ہے اس طرح اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام میں تصوف کی جو تعلیمات ہیں وہ دوسرے مذاہب سے ماخوذ شدہ ہے۔ تو ان کے ان اعتراضات کے پس پردہ وہ مماثلت کارفرما ہے جو مستشرقین کو عیسائیت، رومن اور اسلامی تصوف کے مابین نظر آتی ہے۔ حالانکہ یہ بات صراحتاً غلط ہے کہ دو مختلف قوانین کے مابین اگر تھوڑی سی مشابہت پائی جائے تو کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایک قانون دوسرے قانون کا چربہ ہے؟ ممکن ہے کہ بعض محققین کے یہاں ان دونوں تعلیمات کے مابین مماثلت نظر آئے لیکن دونوں اپنی اصل اور روح کے اعتبار سے حد درجہ مغائر اور ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں۔ پس ایسی مشابہت اور مماثلت دیکھ کا کسی کے عقیدے پر حرف لگانا علمی اصولوں کے منافی تصور ہو گا۔

---

[1] سیف الاسلام، حافظ، **تحریک استشراق کی حقیقت اور استشراقی لٹریچر کے اثرات**، ماہنامہ دار العلوم، 2015) 3، شمارہ 5

فصل سوم: آرتھر جان آربری اور اس کا مستشرقانہ رجحان

آرتھر جان آربری مسیحی عقیدے کا مالک تھا انھوں نے شروع سے مختلف سکول آف تھاٹس کا مطالعہ کیا۔ صوفیاء کرام کی زندگانی پر بھی اس کا گہرا مطالعہ تھا۔ ان کی تعلیمات سے کافی حد تک متاثر بھی تھا۔ اس حوالے سے باقیوں کی نسبت آربری کے نظریات میں اعتدال نظر آتا ہے۔ اس فصل میں آربری اور اس کے مستشرقانہ رجحان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اے۔ جے آربری کا تعارف

اے جے آربری کا پورا نام آرتھر جان آربیری ہے جو 1905 میں پیدا ہوا وہ ایک برطانوی مستشرق، عالم، مترجم، ایڈیٹر اور مصنف تھے، جنھوں نے فارسی اور عرب زبان کے موضوعات پر تقریباً 90 سے زائد کتب لکھیں، ترجمہ کیں اور ان میں ترامیم کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فارسی و عربی اور صوفی علوم میں مہارت حاصل کیں۔ لیکن ان کی وجہ شہرت قرآن پاک کے بہترین مترجم ہونا ہے۔ اے جے آربیری نے کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ گریجویشن کرنے کے بعد آربیری نے قاہرہ یونیورسٹی میں کلاسیکی شعبے میں اس کے سربراہ کے طور پر کام کیا۔ جنگ کے سالوں کے دوران اس نے اپنی لسانی مہارتوں کے لیے لندن میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔

1944 میں آربری کو لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل انیڈ افریقن سٹڈیز میں فارسی کے پروفیسر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ اس کے دو سال بعد عربی کے پروفیسر طور پر کام کیا۔ 1947 میں آربری عربی کے ساتھ سر تھامس اڈمز پروفیسر کے طور پر کیمبرج واپس آئے اور 1969 میں اپنی موت کے وقت تک وہیں رہے۔ آربری نے خود ایک سوانحی خاکے میں بتایا کہ کس طرح وہ اپنے مسیحی عقیدے سے محروم ہو گئے تھے۔ باوجود اس کے ان کی خاندانی جڑیں مسیحی ہیں۔ اور ان کے خاندان کے لوگ مسیحی ایونگل سکول کے ماننے والے ہیں۔ تاہم جب انھوں نے اسلام کے صوفیائے کرام کا طویل گہرائی سے مطالعہ کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ وہ کس قدر غلط عقیدوں کو ماننے والے تھے۔ مطالعہ اسلام نے ان کے ایمان کو بحال کیا اس سلسلے میں اے جے آربری نے خود لکھا:

> "I am an academic scholar, but I have come to realize that pure reason is unqualified to penetrate the mystery of Gods light, and indeed. If too fondly indulged interpose on impenetrable veil between the heart and God. The world in which we live is certainly full of shadows. I have had my full share of personal sorrows and amities, and I am as actually aware as the next man

of appealing danger threating man kind. But I have experienced the Divine light, I need not wish for any higher grace"[1]

''میں ایک علمی اسکالر ہوں، لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ خالص عقل خدا کے نور کے اسرار کو سمجھنے کے لیے نااہل ہے، اور حقیقت میں۔اگر بہت شوق سے دل اور خدا کے درمیان ناقابل تسخیر پردہ ڈال دیا جائے۔ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ یقیناً سائے سے بھری ہوئی ہے۔ میں نے اپنے ذاتی دکھوں اور رنجشوں میں اپنا پورا حصہ لیا ہے، اور میں حقیقت میں اتنا ہی واقف ہوں جتنا کہ اگلے انسان کی طرح خطرے کی دھمکی دینے والے انسان کو۔لیکن میں نے نور الٰہی کا تجربہ کیا ہے، مجھے کسی اعلیٰ فضل کی خواہش کی ضرورت نہیں''۔

ان کی تحریروں میں فارسی اور عربی تصانیف کی تدوین شدہ تحریریں کلاسیکی فارسی اور عربی شاعری کے تراجم، قرآنی علوم، اسلامی الہیات اور فلسفہ، تصوف، فارسی اور عربی زبان، کتابیات اور کتب خانہ کے کیٹلاگ، قارئین اور طلباء کے لیے انتھالوجی، مائی ادب اور مقبوم عام شامل ہیں۔ جدید اسلام، برٹش اور نیٹلزم اور عمر خیام اور فٹز جیر، لڈ جیسے مختلف موضوعات پر کام کیا۔ انھوں نے قرآن کا جو انگریزی ترجمہ کیا اس نے ان کی تمام سابقہ کوششوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ انڈیا آفس کیمبرج یونیورسٹی اور چیسٹر بیٹی لائبریریوں میں مشرقی مخطوطات کے ان کے کیٹلاگ اسلامی میدان میں کام کرنے والے تمام اسکالرز کے لیے ایک لازمی ذریعہ اور رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ یہ آربری کا بنیادی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی سکالرشپ کے ثمرات نہ صرف ان کے نقش قدم پر چلنے والے طلباء کے لیے بلکہ عام لوگوں کے لیے بھی دستیاب کرائے۔[2]

آربری کو بہت سے تعلیمی اعزازات سے نوازا گیا 1949 میں وہ برٹش اکیڈمی کے فیلو منتخب ہوئے۔ مالٹا یونیورسٹی نے انھیں 1963 میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا اور 1964 میں شاہ ایران نے انھیں نشان دانش درجہ اول سے نوازا۔ وہ دمشق کی زبان کی اکیڈمی قاہرہ، فارسی اکیڈمی اور دمشق کی عرب اکیڈمی کے متعلقہ رکن اور یونیسکو کی ترجمہ کمیٹی اور تہران میں برطانوی انسٹی ٹیوٹ آف فارسی اسٹڈیز کے نائب صدر تھے۔

1960 میں انھوں نے کیمبرج میں مڈل ایسٹ سنٹر قیام کیا اور اس کے وہ پہلے چیرمین تھے جو مشرق وسطی میں جدید سیاسی پیشرفتوں سے متعلق ایک ادارہ ہے جسے اب اورینٹل سٹڈیز کی فیکلٹی میں شامل کیا گیا ہے 1961 میں ان کی

---

[1]Arberry, A.J, *A sufi martyr*'' (Autumn, 1969) vol 3,.4
[2]https://iranicaonline.org/articles/(Accesed 23-02-2022)

سفارش کے ذریعے کیمبرج یونیورسٹی نے ترکی میں ایک تدریسی عہدہ قائم کیا۔ایک نرم مزاج مزاحیہ آدمی پروفیسر آربری یونیورسٹی اور کالج کی کمیٹیوں کے ایک ناقابل تسخیر رکن تھے جہاں کسی مسئلے پر ان کی فوری گرفت اور مضحکہ خیز پہلو کو فوری طور پر پہچاننا، انتہائی تکلیف دہ بحث کو زندہ کر دیتا تھا موت کے قریب ہونے پر بھی وہ فیکلٹی بورڈ کے اجلاسوں میں وفاداری کے ساتھ شرکت کرتے تھے ان کے شائع شدہ کام کی پیداوار بہت زیادہ تھے پھر بھی انھوں نے اس کا ہر لفظ خود ٹائپ کیا اور ہنسی کے ساتھ اس بات کا اقرار بھی کیا کہ صرف وہ ہی اپنی لکھاوٹ کو سمجھ سکتے ہیں ان کی زندگی ان کے گھر اور خاندان پر مرکوز تھی۔ان کی بیٹی کی مسٹر گائے ایونز کے ساتھ دو پوتیوں کے ذریعے شادی کے بعد خوشحال گھرانہ بنا تھا۔وہ سفر کرنے کو سخت ناپسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ بغیر ان کا وقت ضائع کیے ان کے گھر ملاقات کے لیے آئیں۔کیوں کہ وہ اپنی کتابوں اور سیز دور نہیں رہ سکتے تھے۔نوجوان اسکالرز ان کے ملنے کے لیے ان کے ہاں شام کی چائے پر آتے تھے اور یہ لمحات ان کے لیے کافی خوشگوار ہوتے تھے [1]۔

آربری ایک محنتی اور علمی استعداد رکھنے والا مستشرق تھا اس کے پاس ہمیشہ علمی محفل سجی ہوتی تھی۔اسے مختلف زبانوں پر دسترس حاصل تھا۔

آرتھر جان آربری: انگریز مستشرق، عربی، فارسی اور اسلامی علوم پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ قرآنِ پاک کے انگریزی میں ترجمہ کیا۔آپ نے فریدالدین عطار کی 'تذکرۃ الاولیا' اور جلال الدین رومی کی 'فیہ مافیہ' کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا۔آربری نے علامہ محمد اقبال کے دو فارسی مجموعوں 'رموزِ بیخودی' اور 'جاوید نامہ' کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جبکہ اُن شذرات کو بھی شائع کیا جن پر حاشیہ کی صورت میں نکلسن کے اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمہ پر علامہ اقبال نے تصحیح کی تھی۔آربری نے اقبال کی اُردو شاعری سے صرف 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' کا انگریزی ترجمہ کیا۔آربری کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ فرزندِ اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال کے اُستاد رہ چکے ہیں [2]۔

اے۔جے۔آربری مشہور انگریز مستشرق ہے۔ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی سباعی اپنی کتاب '' الاستشراق اور مستشرقون '' میں اے۔جے۔آربری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

---

[1] http://www.canbridge.org//core1287/arberry (Accessed 12-02-2022)
[2] http://www.isfdb.com/.org/data/acrtical(Accessed 14-03-2022)

"ا.ج اربری انجلیزی معروف بالتعصب ضد الاسلام والمسلمین ومن محرری (دائرۃ المعارف الاسلامیۃ) والان استاذ بجامعۃ کمبردج-ومن المؤسف انہ استاذ الکثیر من المصریین الذین تخرجوا فی الدراسات الاسلامیۃ و اللغویۃ فی انجلترا"[1]۔

کہ اے۔جے۔آربری انگریز مستشرق ہے۔اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کا تعصب بہت مشہور ہے۔دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے لکھنے والوں میں اس کا نام سرفہرست ہے۔وہ کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔اور اکثر مصری طلبا جو انگلینڈ میں " الدراسات الاسلامیہ واللغویہ " کے فارغ ہیں، وہ ان کا استاد رہے ہیں۔

اے۔جے۔آربری کی مشہور تصنیفات

1۔الاسلام الیوم: یہ اے جے آربری کی مشہور کتابوں میں سے ایک کتاب ہے 1943ء میں اس کی طباعت ہوئی۔

2۔مقدمہ لتاریخ التصوف: یہ کتاب 1947ء میں چھپ گئی تھی۔

3۔التصوف : یہ کتاب 1950 ء میں چھپ کر منظر عام پر آگئی۔

4۔ترجمۃ القرآن : اے جے آربری کا یہ کام پوری دنیا میں مشہور ہوا۔اس نے 1950 میں قرآن کا باقاعدہ ترجمہ کیا۔اِس ترجمہ قرآن کی اشاعت 1955ء میں لندن سے ہوئی۔پہلی جلد میں سورہ الفاتحہ سے سورہ طٰہٰ تک کا یعنی 21 سورتوں کا ترجمہ موجود ہے اور یہ جلد 352 صفحات پر مشتمل ہے۔دوسری جلد میں سورہ الانبیاء سے سورہ الناس تک یعنی 93 سورتوں کا ترجمہ موجود ہے اور یہ جلد 376 صفحات پر مشتمل ہے۔کل صفحات 728 ہیں۔

ترجمہ قرآن کو بیسویں صدی عیسوی کے تراجم قرآن کی صفِ اول میں شمار کیا جاتا ہے جو تعصب سے پاک ہے، حالانکہ مصنف مسیحی تھے۔کتاب کے دیباچہ میں مصنف کے اِس بات کا اظہار کیا تھا کہ :

"اہل مسلم کے نزدیک قرآن کی تفسیر مشکل ترین مراحل میں سے ایک ہے،اِس لیے میں صرف اِس کا ترجمہ کر رہا ہوں"۔

عربی زبان کے مشہور محقق وادیب خلیل محمد نے اِس ترجمہ قرآن سے متعلق بیان دیا کہ :

---

[1] السباعی، مصطفیٰ حسنی، **الاستشراق و المستشرقون**، ص:38

''یہ ترجمہ بغیر کسی تعصب کے غالباً دنیا بھر کے بہترین تراجم قرآن میں شامل کر لیا گیا ہے''[1]۔

مترجم و محقق قرآن محمد عبدالحلیم نے اِس ترجمہ قرآن سے متعلق لکھا ہے کہ :

''آر بری نے اِس ترجمہ کے ذریعہ سے جس احترام و عقیدت کا اظہار کیا ہے، وہ دیکھنے کو خوشگوار اور سننے کو خوشنماء محسوس ہوتا ہے۔اُس کے عربی زبان کے جملوں اور آیات کے ترجمہ میں محتاط اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان کے محاورات، روزمرہ کی گفتگو اور بول چال سے واقف ہے اور عربی زبان کی انشاء سے قریب تر ہے۔تاہم اِس ترجمہ میں جس چیز کی کمی ہے وہ یہ ہیں کہ ضروری مقامات پر جہاں تشریح وضاحت طلب ہونی چاہیے تھی، نہیں کی گئی، تفسیری معلومات کا فقدان ہے اور یہ بات انگریزی زبان کے متکلمین کو قرآن کا ترجمہ پہلی بار پڑھتے ہوئے دشواری میں ڈال سکتا ہے''[2]۔

آرتھر جان آربری اور اس کا مستشرقانہ رجحان

اے جے آربری کا پورا نام آرتھر جان آربری ہے۔وہ ایک برطانوی مستشرق، عالم، مترجم، ایڈیٹر اور مصنف تھے اور مذہب کے اعتبار سے مسیحی تھے۔اسلامی تعلیمات کے بارے میں کچھ لوگ اسے متعصب سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ اسے ایک منصف پسند اور علم دوست مستشرق تصور کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اپنی کتاب ''استشراق اور مستشرقین'' میں اے۔جے۔آربری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"أن أربري مستشرق إنجليزي. تحيزه على الإسلام والمسلمين معروف جيداً. اسمه بارز بين كتّاب ديرة المعارف الإسلامية. يعمل أستاذاً في جامعة كامبريدج. ومعظم الطلاب المصريين الذي تخرج من "الدراسات الإسلامية واللغوية" في إنجلترا ، كان معلمهم.[3] ۔

''کہ اے۔جے۔آربری انگریز مستشرق ہے۔اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کا تعصب بہت مشہور ہے۔دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے لکھنے والوں میں اس کا نام سرفہرست ہے۔وہ کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔اور اکثر مصری طلبا جو انگلینڈ میں '' الدراسات الاسلامیہ واللغویہ '' کے فارغ ہیں، وہ ان کا استاد رہے ہیں''۔

---

[1]Khaleel Mohammed ،*Assessing EnglishTranslations of the Qur'an*، (Middle East Quarterly (Spring 2005) :58-71.

[2] M.A.S, Abdul Haleem, *The Qur'an*,(Oxford: Oxford Uni press, 2004)..xix

[3]السباعی، مصطفیٰ حسنی، **الاستشراق و المستشرقون**، ص:49

لیکن مقالہ نگار نے اسلامی تصوف کے تناظر میں اے جے آربری کے بارے میں جتنی تحقیق کی اس حوالے سے اے جے آربری ایک علم دوست اور منصف پسند محقق پایا۔ کیونکہ اس نے اسلامی تصوف پر مستشرقین کی جانب سے جو جو اعتراضات اسلامی تصوف پر تھے ان سارے اعتراضات کو مفرضوں سے تعبیر کرتے ہوئے سب کو بے بنیاد قرار دیا۔ اس حوالے سے مختلف مستشرقین نے تصوف پر جو اعتراضات کیے تھے ان سب کا اچھے انداز میں جواب دیا۔ جیسا کہ درج ذیل ان کے جواب درج کیا گیا ہے۔ لہذا اسلامی تصوف کے حوالے سے اے۔ جے آربری منصف مزاج اور اعتدال پسند مستشرقین قرار پایا۔

رچرڈ ہارٹ مین کے عائد کردہ الزامات اور آربری کا جواب

Richard Hertman تصوف کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کے فلسفے کے اثرات اسلامی تصوف میں با یزید کے ذریعے داخل ہوئے چونکہ بایزید بسطامی نے ہندی فلسفہ اپنے استاد ابو علی سندی مشہور صوفی بزرگ سے سیکھا تھا۔ اس سے قطعی اور بین طور پر ثابت ہوا کی تصوف کی اصل ہندو مذہب ہے''[1]۔

آربری نے اس کے اعتراض کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ اس دلیل کے پیچھے کوئی بنیاد نہیں۔

ہارٹ مین کے دیگر الزامات!

ہارٹ مین نے تصوف کے خلاف دیگر الزامات یہ لگائے کہ تصوف کی اصل زرتشت ہے۔ یہودی قبالہ ہے، عیسائی مسٹیسزم ہے اور نوافلاطونیت ہے۔ دیکھیے ایک ہی سانس میں انھوں نے تصوف کے کتنے باب گنوادیے ہیں۔ کیا یہ تضاد بیانی نہیں ہے اور کیا ان کا یہ نظریہ دوسرے نظریات کو خود بخود ختم نہیں کر دیتا۔ افسوس ہے کہ اپنی تضاد بیانی self contradication کو فاضل مصنف نے محسوس نہ کیا۔

ہارٹ مین کے اس اعتراضات کے متعلق پروفیسر آربری کتاب مذکور میں لکھتے ہیں:

> ''یہ دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اول تو یہ تمام نظریات ایک دوسرے کی نفی کرنے والے ہیں. دوسرا سوال یہ ہے کہ ان متضاد نظریات کو کیسے یکجا کیا جاسکتا ہے اور کیسے ان کو تصوف کا نام دیا جاسکتا ہے''۔

اس سوال کا جواب ہارٹ مین یہ دیتے ہیں کہ:

> ''اس کام کے ذمہ دار جنید بغدادی ہیں. لہذا ہارٹ کا مقصد یہ ہے کہ اب ان تمام شواہد کو جمع کر کے تجزیہ کیا جائے۔ ممکن ہے کہ شاید ہمیں تصوف کی اصل کا کوئی ثبوت مہیا ہو سکے''۔

---

[1] Arberry, *An Itroduction to the History of Sufism*,.36

- ہارٹ مین کی باتوں میں تضادات ہیں ایک طرف اس نے قطعی اور بین طور پر ثابت کر چکے ہیں کہ تصوف کی اصل ہندومت ہے۔
- دوسری طرف یہ بات کھڑی کردی کہ تصوف کی اصل یہودی قبالہ ہے اور زرتشت ہے اور عیسائی مسٹیسزم، نو افلاطونیت neoplatonism ہے۔
- تیسری بات وہ کہتے ہیں کہ اب ہم تمام یورپین سکالروں کو مل کر اس بات کا کھوج لگانا چاہیے کہ تصوف کی اصل کیا ہے۔ایک طرف وہ تصوف کی اصل ہندوازم قرار دیتا ہے، اس کے بعد پھر شک میں پڑ جاتے ہیں اور یہودی قبالہ، زرتشت عیسائی مسٹیسزم اور نوافلاطونیت کو تصوف کا ماخذ قرار دیتے ہیں ۔

ولیم جونز(William Jones[1]) کے الزامات اور آربری کا جواب:

ولیم جونز ایک اور مستشرق ہیں جو تصوف کو ہندومت اور ویدانیت کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں اس وجہ سے کہ دونوں میں مشابہت بہت ہے۔

پروفیسر آربری اس اعتراض کا یوں جواب دیتے ہیں :

> "But based on William Jones's speculation, the words of Iranian poets are. They did not have the opportunity to study the original Arabic documents, which are in dire need of analysis to shed more light on the origin of Sufism"[2] .

"لیکن ولیم جونز کی قیاس آرائی کی بنیاد ایرانی شعراء کا کلام ہے. ان کو اصل عربی دستاویزوں کے مطالعہ کا موقع ہی نہیں ملا جن کے تجزیے کی اشد ضرورت ہے تاکہ تصوف کی اصل پر مزید روشنی پڑ سکے"

جان میلکم کے الزامات اور اے جے آربری:

جان میلکم(John Malcolm[3]) کا شمار ان مستشرقین میں ہوتا ہے جو ہندوازم کو تصوف کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔

ان کے متعلق پروفیسر آربری لکھتے ہیں:

> "Sir John Malcolm in his book History of Persia has discussed at length the fundamental principles of Sufism, which is the cradle of long

---

[1] سر ولیم جونز(1746–1794) لندن میں پیدا ہوا وہ ایک ماہر فلکیات، استشراق، اور قانون تھے۔کلکتہ میں ہائی کورٹ کے جج کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے، وہ ہندوستان میں بھی پڑھا ہے اور بنگال کی Asiatic Society کی بنیاد رکھی۔

[2] Arberry, *An Itroduction to the History of Sufism*,9.

[3] جان میلکم(1769-1833) ایک سکاٹش سپاہی، سفارت کار، ایسٹ انڈیا کمپنی کے منتظم، سیاست دان، اور مورخ تھے۔یہ تصوف کو ہندوستان میں رائج دیگر مذاہب ،عقائد اور روایات کے ساتھ جوڑنے پر مرکوز رہا۔

misunderstandings. The source of Malcolm's research is Captain Graham's lectures which he gave in 1811 at the Bombay Literary Society. As far as Graham's information is concerned, it is so meagre and so meagre that it cannot be relied upon. Also, Malcolm's list of executions of Sufis and all their figures are also very absurd"[1] .

''سر جان میلکم نے اپنی کتاب تاریخ فارس میں تصوف کے بنیادی اصولوں پر طویل بحث کی ہے جو طویل غلط فہمیوں کا پلندہ ہے۔ میلکم کی ریسرچ کا ماخذ کیپٹن گراہام کا وہ لیکچر ہے جو انھوں نے 1811 میں بمبئ کی ادبی سوسائٹی میں دیا. جہاں تک خود گراہام کی معلومات کا تعلق ہے وہ ایسی کم مایہ اور کم پایہ ہیں کہ ان کی طرف ذرہ بھر التفات نہیں کیا جا سکتا ہے. نیز میلکم نے جو صوفیاء کے سلاسل کی فہرست اور ان کے تمام اعداد و شمار دیے ہیں وہ بھی بہت بے تکے ہیں''۔

تصوف پر ایرانی اثرات کے برعکس پروفیسر آربری کتاب مذکور میں یہ ثابت کر چکے ہیں ایران کے صوفی شعراء کے عارفانہ کلام کا یورپ پر گہرا اثر ہوا۔ وہ لکھتے ہیں :

''ایران کا عارفانہ کلام کافی مدت سے جرمنی پر اثرانداز ہو رہا تھا اور جرمنی کے نامور شاعر گوئٹے اس سے بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ فرانس میں وہاں کے نامور بزرگ سلوسٹر ڈے سیکی پر بھی تصوف کا بڑا اثر ہوا جس کی وجہ سے انھوں نے 1819 میں شیخ فرید الدین عطار کے پند نامہ کا متن اور ترجمہ شائع کیا"۔

تھولک کے الزامات:

تھولک (Tholcuck) کے متعلق پروفیسر آربری لکھتے ہیں کہ :

میلکم کی تاریخ فارس کے بعد یورپ میں تصوف کے متعلق سب سے بڑی تصنیف ایف۔ آر۔ ڈی تھالک کی صوفیمیس (sufimus) ہے جو عصر حاضر کی صحافت کے معیار کی رو سے ایک معمولی چیز ہے۔ تھالک اپنے قارئین پر اپنی عظیم ریسرچ اور لسانی قابلیت کا رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کام میں وہ ناکامی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لیے ان کو جو مواد حاصل ہوا وہ بالکل ناکافی تھا۔ ان کے مواد کا زیادہ تر ذخیرہ ایران سے لیا گیا جو بہت ہی عامیانہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کا مطالعہ تک نہیں کیا۔

تھالک کی تحقیق پر پروفیسر آربری لکھتے ہیں کہ :

''مختلف مذاہب کے روحانی نظریات میں مشابہت ایسا جال ہے کہ اس میں سب پھنس جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مشابہت کی بناء پر تصوف کی تاریخ مرتب کرنا بے کار ہے. ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ فی الحال ان تمام قیاس

[1] Arberry, *An Itroduction to the History of Sufism*,11.

آرائیوں کو ختم کر کے کم از کم ایک نسل تک ہم سب کو اس بات پر متفق ہو جانا چاہیے کہ اگر تصوف کی تاریخ مرتب کرنا مطلوب ہے تو ہمیں تصوف سے متعلق اسلامی اور صرف اسلامی ذرائع اور وسائل پر بھروسہ کرنا ہوگا''[1]۔

اس کتاب میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :

''براؤن کی ریسرچ اور ان کی تصوف کے متعلق گہری نظر کا مقابلہ آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ ان تمام تصانیف میں اسلامی تصوف کے ساتھ محبت اور گہری دلچسپی روح رواں کی طرح نظر آتی ہے۔ بالخصوص ان کی کتاب '' فارس کی ادبی تاریخ'' ریسرچ کے میدان میں شاہکار ہے[2]۔

اے۔جے۔آربری کا ترجمہ قرآن(۱۹۰۵ء۔۱۹۶۹ء)

اے۔جے۔آربری کے خیال میں قرآن مجید نہ تو نثر ہے نہ شاعری بلکہ ان دونوں کا امتزاج ہے۔

"The Koran is neither prose nor poetry,but a unique fusion of both"[3].

آربری نے ای۔ایچ۔پالمر کی تقلید کرتے ہوئے قرآن مجید کو ایک نئے ترنم کے ساتھ آیات کو گروپ میں تقسیم کر کے ترجمہ کیا ہے۔

"Like palmer, however, he attempts to give a leteral translation and to produce the rhythm in it. He says: I have striven to devise rhythmic patterns and sequence groupings in correspondence with what the arabic presents,paragraphing the grouped sequence as they seem to form original units of revelation"[4].

تاہم، پامر کی طرح، وہ لفظی ترجمہ دینے اور اس میں ترنم پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: میں نے عربی کے پیش کردہ خطوط کے مطابق ترنم کے نمونوں اور ترتیب گروپ بندیوں کو وضع کرنے کی کوشش کی ہے، گروہی ترتیب کو پیرا گراف کرتے ہوئے جیسا کہ وہ وحی کی اصل اکائیوں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مہر علی، اے۔جے آربری کے اس ترجمہ قرآن کے بارے میں اپنا موقف یوں بیاں کرتا ہے کہ :

موصوف کا یہ انداز تحریر قاری کے لیے مشکل پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ قاری کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کس آیت کا کون سا ترجمہ ہے اور موصوف نے آیات کے نمبر بھی درج نہیں کیے۔ دوسرے مستشرقین کی طرح اس ترجمہ میں بھی بے شمار غلطیاں موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے

---

[1] Arberry,*An Inroduction to the History of Sufism*.15
[2] Ibid,19
[3] Arberry ,A.J,The koran interpreted,:x
[4] Ibid,:x

کہ اس نے سابقہ تراجم کی نقل کی ہے خاص طور پر پالمر کی۔اس لحاظ سے یہ ترجمہ بھی غلطیوں سے مبرا نہیں ہے لہٰذا نا قابل قبول ہے[1]۔

ان نکات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اے جے آربری کا متشرقانہ رجحان اسلامی تصوف کے بارے میں معتدل اور انصاف پر مبنی ہے۔اسی لیے وہ اسلای تصوف کے حوالے سے کہتا ہے کہ اسلامی تصوف کے لیے عربی مصادر اور اصل مراجع کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔اس سے بڑھ کر بڑی بات یہ ہے کہ آربری تصوف کے حوالے سے یہاں تک کہتا ہے کہ تصوف تک پہنچنے کے لیے قرآن و حدیث تک رسائی انتہائی ضروری ہے۔اور اس نے اسلامی تصوف کی بہت ساری ایسی خصوصیات کی طرف اشارہ بھی کیا جو کسی مستشرق کی تحریر میں نہیں ملتی۔اس کے مطابق اسلام کا صوفیانہ عنصر، تصوف مومنوں کو عبادت کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے جو کہ آرتھوڈوکس رسومات اور عبادات سے بالاتر ہو کر اپنے رب کے ساتھ رابطہ استوار کرتا ہے۔اس طرح کے تصوف کو آربری ایک بہترین تصوف قرار دیتا ہے۔آربری کے نظریات دوسرے مستشرقین کی نسبت منفرد ہے اسی بناء پر آربری نے بہت سے مستشرقین کے مختلف اعتراضات کو علمی بنیادوں پر تجزیہ کر کے رد کیا گیا۔وہ یہ سمجھتا ہے کہ اکثر مستشرقین کے اعتراضات کا صحیح انداز میں تحقیق کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مستشرقین بغیر کسی مضبوط دلیل کے صرف مشترکات اور مماثلات کی بنایدپر نظریہ قائم کرتے ہیں حالانکہ مشترکات و مماثلات ہر مذہب میں ہوتے ہیں۔

[1] Mohar ،Ali *The quran and the orientalists* , (New York: heritage press 1958)345

باب چہارم:

اسلامی تصوف سے متعلق مستشرقین کے مطالعات کا تجزیہ

فصل اول: اسلامی تصوف کی مصدریت

فصل دوم: اسلامی تصوف کی تشکیل وارتقاء

فصل سوم: اسلامی تصوف کی تاریخ

باب چہارم:

اسلامی تصوف سے متعلق مستشرقین کے مطالعات کا تجزیہ

یورپ میں احیائے علوم اور نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے نتیجے میں مختلف علوم کی تدوین عمل میں آئی۔اہل مغرب کے ایک گروہ نے جدید سائنسی علوم میں تحقیق و مطالعہ کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ اور مشرقی فنون کو بھی اپنی تحقیقات اور مطالعے کا حصہ بنایا اور بہت سوں نے اس کے لیے اپنی زندگیاں گزار دیں ۔اس تحقیق کے نتیجے میں پچھلی دو صدیوں میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور دیگر معروف یورپی زبانوں میں اسلام کا ایک ایسا جدید ورژن مدون ہو کر سامنے آیا جسے اسلام کی یورپین تعبیر قرار دیا جاسکتا ہے۔

اہل یورپ کی تحقیق و مطالعات سے جہاں دنیائے اسلام کو کچھ فائدہ ہوا کہ اسلامی مخطوطات کا ایک گراں قدر ذخیرہ اشاعت کے بعد لائبریریوں سے نکل کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور صاحبان علم ودانش کو مزید تحقیق کرنے کا موقع ملا تو وہاں اس سے پہنچنے والے ناقابل تلافی نقصانات بھی تھے۔یہودی، عیسائی اور لامذہب مغربی پروفیسروں کی ایک جماعت نے اسلام، قرآن مجید، پیغمبر اسلام، اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم اسلامیہ میں تشکیک و شبہات پیدا کرنے کی ایک تحریک برپا کرتے ہوئے اہل اسلام کے خلاف ایک فکری جنگ کا آغاز کر دیا۔

مستشرقین نے مختلف مقاصد کے پیش نظر عمومی طور پر تمام علوم اسلامیہ کو اپنے مطالعہ و تحقیق کا مرکز بنایا ہے۔جن میں قرآن، حدیث، فقہ وسیرت وتاریخ کے علاوہ تصوف کے موضوع پر بھی انہوں نے مطالعات کیے ہیں۔تصوف کے حوالے سے مستشرقین مختلف نظریات رکھتے ہیں۔مستشرقین میں سے این میری شمل نے بھی تصوف پر بہت بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔مشرقی دنیا میں ان کی تحریریں بہت مقبول ہے۔ان کے علاوہ پروفیسر رینالڈ نکلسن نے بھی تصوف پر مختلف کتابیں تحریر کی ہے۔اس باب میں پروفیسر رینالڈ نکلسن، اگناز گولڈ زیہر اور اے جے آربری کے اسلامی تصوف سے متعلق مطالعات کا تجزیہ و تحلیل پیش کیا گیا ہے۔یہ لوگ مشرقی علوم کے حوالے سے معروف ہیں۔اہل مغرب ان کی تحریروں کو مستند سمجھے جاتے ہیں۔

فصل اول: اسلامی تصوف کے مصادر

اس فصل میں مصادرِ تصوف کے حوالے سے بحث کی گئی ہے اسلامی تعلیمات میں اسلامی تصوف کے مصادر اور مآخذ کا مسئلہ انتہائی پیچیدہ ہے۔ خصوصاً انیسویں صدی کی ابتداء سے لے کر آج تک مستشرقین تصوف کے حقیقی مصادر کی تلاش میں ہیں۔اس سلسلے میں بعض مستشرقین اسلامی تصوف کو ایک ہی مصدر کی طرف اور کچھ مستشرقین اسلامی تصوف کی بنیاد متعدد کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ان کا خیال یہی ہے کہ تصوف اسلامی تعلیمات میں سے نہیں بلکہ یہ اسلام میں باہر سے آیا ہے اسلام سے اس کا تعلق نہیں ہے بلکہ یہ ایران اور اہل فارس کی فکر سے ماخوذ ہے، کوئی اسے ہندوستانی ادیان کا اثر قرار دیتا ہے۔ بعض اسے عیسائیت اور یہودیت سے ماخوذ قرار دیتے ہیں اور بعض لوگ اسے افلاطونی فلسفہ سے منسوب کرتے ہیں مال ۔

پہلا نظریہ: اسلامی تصوف کی مصدریت میں مسیحیت کا دخل:

مستشرقین میں سے بعض لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اسلامی تصوف کے بنیادی مصادر اسلامی تعلیمات نہیں ہیں بلکہ اسلامی تصوف کا سرچشمہ عیسائیت اور مسیحی رہبانیت ہے۔انجیل مقدس کے مطالعہ و تحقیق سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں زہد و رہبانیت پر تاکید کی گئی ہے۔صوفیانہ زندگی مسیحیت کی روح اور اس کے عارفانہ اور زاہدانہ افکار و عقائد سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔اس لیے مستشرقین تصوف کو مسیحی تعلیمات کا حصہ قرار دیتے ہیں،اس حوالے سے پروفیسر نکلسن، گولڈ زیہر اور اے۔ جے۔آربری کے نظریات یہاں تحریر کیا گیا ہے۔

پروفیسر نکلسن:

پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں کہ تصوف کا اصل مصدر عیسائیت ہے۔کیونکہ تصوف میں بہت ساری تعلیمات عیسائیت کی ہیں اور عیسائیت اسلام سے پہلے کا دین ہے۔جیسا کہ لباس صوف کا پہننا، صوفیاء کا خاموشی کو اپنانا،ذکرِ الٰہی پر تاکید کرنا، محبتِ الٰہی اور زہد پر زور دینا یہ تمام عیسائیت کی تعلیمات ہیں جو صوفیاء نے اپنایا ہے۔اس حوالے سے کچھ نکلسن کے اقتباسات ملاحظہ کرے:

"The name was derived from suf , and was originally applied to those Muslim ascetics who imitation of Christian hermits , clad themselves in coarse woolen grab as a sign of penitence and renunciation of worldly vanities"[1].

تصوف کا نام " صوف" سے لیا گیا ہے اور اس کا اطلاق ان مسلمان زاہدوں پر کیا گیا ہے جنھوں نے عیسائی راہبوں کی اتباع میں توبہ اور دنیوی رغبتوں سے گریز کیا اور علامت کے طور پر کھر درا اُونی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔

نکلسن کہتے ہیں کہ :

- صوف کا اُونی لباس، جسے صوفیاء پہنا کرتے ہیں، اسی وجہ سے ان کا نام صوفیاء رکھا گیا یعنی تصوف کا مادہ اشتقاق صوف ہے اور تصوف کا اصل مآخذ عیسائیت ہے کیوں کہ عیسائی راہب یہ لباس پہنتے تھے۔
- خاموشی صوفیاء کی خصوصیت ہے اور زیادہ بولنے پر صمت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ عیسائی راہبوں سے لی گئی تعلیم ہے کیونکہ عیسائی راہبوں کے ہاں بھی خاموشی کو ترجیح دی جاتی تھی۔
- صوفیاء کی ایک خصوصیت ذکرِ الٰہی ہے۔ یہ تعلیمات بھی حضرت عیسیٰؑ نے دی تھیں، اس لیے یہ بھی عیسائیت کی خصوصیت ہے اور صوفیاء کی اس خصوصیت کا اصل بھی عیسائیت ہی ہے۔
- صوفیاء زہد پر بہت زور دیتے ہیں، جب کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات ہیں۔ بالخصوص عیسائی راہب اس کی عملی تصویر ہوا کرتے تھے، وہ دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو کر آخرت کی فکر کے لیے جنگلوں میں چلے جایا کرتے تھے۔

صوفیاء کے ہاں محبتِ الٰہی کا ذکر بہت زیادہ ملتا ہے جب کہ یہ تصور بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا حصہ ہے۔

نکلسن اپنی کتاب The Mystics of Islam میں تصورِ محبت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"Any one acquainted, however slightly, with the mystical poetry of Islam must have remarked that the aspiration of the soul towards God is expressed, as in almost the same terms which might be used by an Oriental Anacreon or Herrick"[2].

جس کسی کو بھی اسلام کی صوفیانہ شاعری سے ذرا سا شغف ہے، وہ اتنا ضرور سمجھتا ہے کہ رجوع الی اللہ کا اظہار ایک اصول کی طرح کسی مشّاق مشرقی مدحت نگار کی نطقِ سرور وستائش ہی میں ہو سکتا ہے۔

محبت الٰہی کے تصور پر ان کا درج ذیل پیرا گراف انتہائی اہم ہے جو ان کے موقف کو واضح کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] Nicholson,*The Ideal of personality in Sufism*. ،4.
[2] Nicholson, *The Mystics of Islam*, 102.

"Ibn al –Arabi claims that Islam is peculiarly the religion of love , inasmuch as the Prophet Mohmammad is called God's beloved ,but though some traces of this doctrine occur in the Koran , its main impulse was unquestionably derived from Christianity"[1].

ابن عربی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام خاص طور پر محبت کا دین ہے، کیونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا محبوب کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ایسے کچھ آثار قرآن مجید میں بھی ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی اصل بلاشبہ عیسائیت سے لی گئی ہے۔ نکلسن کہتے ہیں کہ اگرچہ تصور محبت کے چند شواہد قرآن سے ملتے ہیں مگر اصل میں بغیر کسی تردد وخوف کے میں کہ سکتا ہوں کہ یہ نظریہ مسیحیت سے اخذ کیا گیا ہے۔

گولڈزیہر(Ignaz Goldziher)کا موقف:

گولڈ زیہر کے مطابق اسلامی تصوف میں "ایثار اور قناعت کی جو صفت پائی جاتی ہے، دولت اور سرمایہ داروں پر فقر اور فقر کی جو برتری موجود ہے، یہ خالص اسلامی نہیں بلکہ نصرانیت اور عیسائیت کے مطالعہ اور شغف کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو احادیث مروی ہیں وہ بھی دراصل عیسائی راہبوں ہی کے عقائد واعمال کا جلوہ ہیں[2]۔

مستشرقین نے اس نظریہ کی حمایت میں مختلف دلیلیں پیش کی ہیں جس کا خلاصہ مصر کے محقق ڈاکٹر عبدالرحمن بدوی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے[3]۔

- اسلامی تصوف اور مسیحی تصوف میں ظاہری لباس میں مشابہت، جیسے خرقہ (جبّہ) کا استعمال، جس طرح مسیحی راہب اپنے شانوں پر کپڑا ڈالتا ہے۔ اسی طرح اون کا استعمال اور اس کے کپڑے کو تصوف کی نشانی سمجھنا۔
- چند امور میں فکری مشابہت جیسے نفس کی محاسبہ کرنا۔
- اسلامی تصوف میں بعض آرامی اور سریانی زبان کے الفاظ استعمال کرنا، جیسے لاہوت، ناسوت، رحموت، رہبوت، ربانی اور روحانی وغیرہ۔
- مسلمانوں اور عرب نصرانیوں کے درمیان حیرہ، کوفہ، دمشق اور نجران وغیرہ علاقوں میں اختلاط۔
- متقدمین صوفیاء کی بعض روایتیں جو وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

---

[1]Ibid, 111.

[2]حلمی، **تاریخ تصوفِ اسلام**، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلیشرز، 1964)، ص:90

[3]بدوی، عبدالرحمن، **تاریخ التصوف الاسلامی**، (کویت: وکالۃ المطبوعات، 1970ء)، ص: 33- 34

اس سلسلے میں Von Kremer نے اپنی کتاب "اسلام کے چیدہ چیدہ اذکار کی تاریخ" (Geschichle der herrschundendeen des Islam) میں اسلامی تصوف کی تاریخ وتدوین پر پہلی مرتبہ علمی اور تحقیقی کوشش کی۔ اس میں کریمر نے اپنا یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ اسلامی تصوف دو مختلف عناصر کا مجموعہ ہے۔ ایک عنصر مسیحی رہبانیت والا اور دوسرا ہندی بدھ مت والا۔ اور یہ دونوں عناصر تصوف کے بڑے مشائخ جیسے حارث المحاسبی، ذوالنون مصری، ابویزید البسطامی اور جنید بغدادی کی زندگی میں ملتے ہیں۔ اور ہندی بدھ مت کا عنصر نظریۂ وحدۃ الوجود کا تصوف اور اہل تصوف میں موجود ہونا ہے[1]۔

گولڈ زیہر کہتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات میں زہد و تقویٰ پر کافی زور دیا جاتا ہے۔ یہ رہبانی رویہ عیسائی خانقاہیت کے براہ راست مشاہدہ کے ذریعہ پھلا پھولا حتی کہ اس کے اہداف و مقاصد بھی حرف بہ حرف مشابہ ہیں۔

گولڈ زیہر کتاب متی اور لوقا کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ متی اور لوقا میں مذکور طیور سماوی کا یہ ذکر کہ وہ نہ بیج بوتے، نہ فصل کاٹتے، نہ ہی دونوں کو بالیوں میں محفوظ رکھتے ہیں مگر یہ کہ آسمانی باپ کے ذریعہ اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ تو عہد نامہ جدید کے یہ خیالات، جو زہد و ترک سے متعلق اقوال میں بکثرت استعمال ہوئے۔ ان متوکلانہ نظریات کے عین قلب میں قریبا اسی قدیم لفظی پیرایہ میں پائے جاتے ہیں[2]۔

عیسائی گوشہ نشینی یا صوفیوں کے مخصوص لبادے کی تقلید کرتے ہوئے ان مسلمانوں نے خود کو ''صوف'' یعنی موٹے اون سے ملبوس کیا جنھوں نے دنیا و مافیہا کو ترک کر کے توبہ وانابت اور زہد و عبادت کا رخ کیا تھا۔ صوف کے اس رواج نے اسم ''صوفی'' کو ترقی دی، جسے زاہدانہ رجحان کے نمائندوں نے تب مکمل طور پر اپنا لیا جب ان کا عملی زہد ایک اعلیٰ مرحلہ تک ترقی کر گیا اور ایک خاص فلسفہ کے ساتھ شیر وشکر ہو گیا۔ جس کا ایک مخصوص و متعین اثر ان کے تصور مذہب پر آئندہ مرتب ہونا تھا۔ یہ ''تصوف'' کا آغاز تھا[3]۔

اسی طرح گولڈ زیہر (Gold Ziher) نے بھی تصوف کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک زہد اور دوسرا تصوف۔ اس کے نزدیک زہد کا روح اسلامی اور اہل السنۃ والجماعۃ کے مذہب سے ایک مضبوط رشتہ ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور بعثت کے اثرات کا نتیجہ تھا۔ جو کہ عین رہبانیت ہے۔

---

[1] عفیفی، ابوالعلاء، **مقدمۃ فی التصوف الاسلامی** (القاھرۃ: لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر 1956ء)، ص:82

[2] GoldZiher, *Introduction of Islamic Theology and law*,204.

[3] ریحان عمر، **اسلامی عقائد اور قانون کا تاریخی ارتقاء**، (لاہور: عکس پبلیکشنز، 2018ء)، ص:204

اس کے ساتھ گولڈ زیہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد میں غلو کی ممانعت والی احادیث کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جو صوم دہر اور عبادت کی خاطر مسلسل جاگنا اور ازدواجی زندگی سے دور رہنا وغیرہ پر مشتمل ہیں[1]۔

اے جے آربری کا نظریہ:

اے جے آربری لکھتے ہیں کہ یورپ میں تصوف اور تعلیماتِ تصوف پر کام کرنے والوں میں سے ایک بڑا نام اور نامور شخصیت سر جان میلکم ہے۔ اس نے History of Persia نامی کتاب تصوف پر لکھی۔ جس کو بعد میں آنے والے مستشرقین نے مرجع و مآخذ جان کر پڑھا اور اس کتاب نے بعد میں آنے والے مستشرقین کو نظریات قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

سر جان میلکم کے اس کتاب کے حوالے سے اے جے آربری لکھتے ہیں: کہ اس کتاب کے چار ذرائع ہیں ان چار ذرائع کی بدولت سر جان میلکم کی یہ کتاب بنی۔ ان ذرائع میں سے پہلا ذریعہ سر ولیم گراہم کا ہے جو اصل میں عیسائی تھا اس کے وہ لیکچر ہے جو انھوں نے 30 دسمبر 1811 میں بمبئی لیٹر رسوسائٹی میں Bombay Native Infantry کی 6^{th} Regiment کی Ist Battalion کو دیا تھا[2]۔

اس سے یہ نتیجہ ملتا ہے کہ اے جے آربری بھی یہاں یہ کہنا چاہتا ہے کہ تصوف کی تعلیمات میں عیسائیت کی تعلیمات شامل ہے۔

دوسرا نظریہ: اسلامی تصوف کی مصدریت میں فارسی علوم کا دخل:

بعض مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ اسلام کا تصوف دراصل فارسی تصوف کا آئینہ دار ہے۔ ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ عرب و فارس کے درمیان، اجتماعی، ثقافتی اور دینی تعلقات موجود تھے، عرب خود اپنا کیسہ خالی رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً وہ فارسی علوم اور تصوف کے خزانہ سے اپنا دامن بھر لیا کرتے تھے۔ اور ان کا یہ تعلقات مختلف زمانوں سے برقرار رہے ہیں۔ اس حوالے سے ذیل میں مستشرقین میں سے پروفیسر نکلسن، گولڈ زیہر اور اے جے آربری کے نظریات یہاں تحریر کیا گیا ہے:

پروفیسر نکلسن کا نظریہ:

---

[1] GoldZiher,*Muslim Studies*,54.

[2]https://www.mukaalma.com/12865/(Accessed19-02-2022)

مستشرقین میں وہ لوگ جن کا یہ قول ہے کہ تصوف کی اصل فارسی ایرانی ہے،ان میں سے ایک پروفیسر نکلسن ہے ان کی بھی بعض باتوں سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اس بات کے قائل ہے۔اسی حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ تصوف میں اور صوفیاء میں محبتِ الٰہی کا ذکر بہت زیادہ ملتا ہے جبکہ یہ تصور ایرانی شعراء کے کلام میں جابجا ملتا ہے۔اس حوالے سے وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"Any one acquainted, however slightly, with the mystical poetry of Islam must have remarked that the aspiration of the soul towards God is expressed, as a rule, in almost the same terms which might be used by Oriental Anacreon or Herricjk"[1].

جس کسی کو بھی اسلام کی صوفیانہ شاعری سے ذرا شغف ہے،وہ اتنا ضرور سمجھتا ہے کہ رجوع الی اللہ کا اظہار ایک اصول کی طرح کسی مشّاق مشرقی مدحت نگار کی نطقِ سرور وستائش ہی میں ہو سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ بطور مستشرق پروفیسر نکلسن کی مہارت فارسی زبان میں تھی۔اس لیے ان کے مطالعہ کا بنیادی نقطہ اور محور ومرکز ایرانی شعراء تھے جن میں صوفی شعراء بھی شامل تھے۔یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ایرانی شعراء کے کلام سے محبت کے تصور کو پروان چڑھایا اور اسی سمت میں آگے چلتے گئے۔

این میری شِمل کہتی ہیں کہ نکلسن اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ تصوف فارسی سے ماخوذ ہے اس کے لیے اس نے یہ دلیل کے طور پیش کی ہے:

In 1201 Ibnc Arabi wa s inspired to perform the pilgrimage to Mecca. It was there that he met a highly accomplished young Persian lady . Enraptured by her beauty and intelligence , he composed the Tarjuman al-ashiodq, "The Interpreter of Longing, " graceful verses written in the best tradition of classical Arabic poetry.[2]

1201 میں ابنِ عربی مکہ کی زیارت کے لیے آمادہ ہوا۔یہیں پر اس کی ملاقات ایک انتہائی قابل نوجوان فارسی خاتون سے ہوئی۔اس کی خوبصورتی اور ذہانت سے محظوظ ہو کر، اس نے ترجمن الاشودق تصنیف کی جو کلاسیکی عربی شاعری کی بہترین روایت میں لکھی گئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں بعد میں تصوف کا حصہ بنا۔

گولڈزیہر(Ignaz Goldziher)کا موقف:

[1] Nicholson,*The mystics of Islam*,102.
[2] Schimmel Annemarie ,*Mystical Dimensions of Islam*,264

مستشرقین میں وہ لوگ جن کا یہ قول ہے کہ تصوف کی اصل فارسی ایرانی ہے، ان میں سے ایک گولڈ زیہر، ایف اے ڈی تھولک اور ڈوزی شامل ہے۔اس حوالے سے جرمن کے مستشرق F.A.D Thuluk اپنی کتاب Sufismus sire theologiapanthistiea میں لکھتے ہیں کہ اسلامی تصوف کا اصل مجوسی ہے۔دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ شمالی ایران میں اسلامی فتوحات کے بعد اکثر مجوسی اپنی مجوسیت پر بدستور قائم رہے۔اور تصوف کے اکابرین کی اکثریت شمالی ایران، خراسان میں سے نکلے۔ساتھ ہی تصوف کے اکثر بانی مجوسی الاصل تھے، جیسے معروف کرخی اور ابو یزید البسطامی وغیرہ[1]

جب کہ ہالینڈ کے مستشرق Dozy اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ تصوف مسلمانوں کی طرف فارس سے آیا ہے اور فارس میں اسلام سے پہلے ہند سے آیا تھا۔ڈوزی کے نزدیک فارس میں ایک نظریہ عرصۂ دراز سے آرہا ہے کہ "ہر چیز کا صدور اللہ کی طرف سے ہے اور عالم کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے اور موجود حقیقی صرف اللہ عزوجل کی ذات ہے"۔یہ وہ الفاظ ہیں جو اسلامی تصوف سے ٹپکتے ہیں[2]۔

ان جملوں سے معلوم ہوتا ہے یہ لوگ فارسی کو تصوف کا اصل مصدر سمجھتے ہیں۔

اے جے آربری کا موقف:

اے جے آربری بذاتِ خود تصوف کے مصادر کے مختلف ہونے کے قائل نہیں ہے لیکن وہ کچھ ان مستشرقین کے نظریات پر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں جو تصوف کو فارسی اور ایرانی ماخوذ مانتے ہیں۔یورپ میں تصوف کو متعارف کرانے والوں میں سے سکالر ایف۔اے ڈی تھولک کا موازنہ کرتے ہیں جس نے 1819 میں فریدالدین عطار کے ہند نامے کا ترجمہ کیا۔تھولک نے اطالوی زبان میں Sufsmus Sive Theology persica pantheistica کتاب لکھی جو یورپ میں تاریخ تصوف پر سب سے بڑی کتاب تصور کی جاتی ہے۔جس نے مستشرقین کا تصوف کے بارے میں نظریہ قائم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔اے جے آربری کہتے ہیں کہ تھولک نے اس کتاب کا سارا مواد ایران سے لیا ان کی اس کتاب کا سارا مواد حضرت بلال الدین رومی کی مثنوی محمود شبستری کی ''گلشن راز'' مولانا عبدالرحمٰن کی ''تحفۃ الاحرار'' ''بہاررستان''،حبیبنی اور اسدالدین کی ایک ایک کتاب سے اکٹھا کیا گیا ہے۔

---

[1] صہیب سعران، **مقدمۃ کتاب فی التصوف الاسلامی**، (قاہرہ: لجنۃ التالیف والنشر، 2007ء)، ص:76

[2] التفتازانی، ابوالوفاء، **مدخل الی التصوف الاسلامی**، (قاہرہ: دار الثقافۃ للنشر والتوزیع، 1979)، ص26

تھولک کی اس مشہور کتاب کے یہ مصادر و مراجع ہیں۔ ان مصادر و مراجع میں مثنوی مولانا روم کے علاوہ ایک بھی کتاب ایسی نہیں جس کا تعلق تصوف اور تاریخ تصوف کی تالیفات و تعینات سے ہو۔ مثنوی بھی عین تعلیمات تصوف کے بارے میں نہیں بلکہ اس میں شاعری کا انداز میں کچھ نصائح اور حکمتیں ہیں۔ ان تمام کتابوں میں سے کسی ایک کا نام بھی تصوف کی علمی تاریخ کے ضمن میں نہیں آتا۔ ان میں سے کچھ اسکالرز ہیں اور کئی عام تاریخ کے مصنفین جبکہ کچھ شعراء اور کچھ فلسفی ہیں۔

اے جے آربری کے مطابق یورپی مصنفین کی ساری تحقیق قیاس اور مفرضوں پر مبنی ہے۔ ان کے نظریات تخیل، ظن اور اندازوں پر مبنی ہیں۔ ان مصنفین کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اسلامی تصوف کو جاننے والا نہیں تھا بلکہ وہ تقابلی تصوف کے حوالے سے جانتے تھے۔ ان کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ ہندومت، ویدانت، بدھ مت، عیسائیت اور ایرانی و یونانی فلسفوں میں تصوف کی کیا حیثیت ہے اور ان تمام مذاہب، ادیان اور فلسفوں کے تصوف میں کیا مشترکات و مماثلات ہیں انھی مماثلات کے پیش نظر اسلامی تصوف پر بھی اپنا نظریہ قائم کیا۔ آربری کے مطابق مستشرقین چار سو سال تک تصوف کے تقابلی جائزے پر کام کرتے رہے اور اس کے لیے انھوں نے صرف ایرانی ذرائع اور لٹریچر پر انحصار کرتے رہے [1]۔

اے جے آربری کے مطابق کہ اسلامی تصوف کے مآخذ میں سے ایک مآخذ ایرانی شعراء ہے۔ اس حوالے سے ولیم جونز کے بارے میں لکھتے ہیں۔ کہ تصوف کو یورپ میں متعارف کرانے والوں میں سے ایک سر ولیم جونز ہے۔ جنھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں یونانی، لاطینی، فارسی، عربی اور دیگر زبانیں سیکھ لیں تھیں۔ اسے آٹھ زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اس کی اصل دلچسپی زبانیں سیکھنا، ویدوں کے مطالعے اور دورِ آخر کے صوفیائی فلسفہ اور فلسفہ ویدانت کے درمیان مشترکات میں تھی۔ اس لیے اس نے بنگال، ہندوستان اور ایران کا سفر کیا۔ گویا ان تین ذرائع سے تصوف پہلی بار یورپ میں متعارف ہوا۔ اور پھر اس تصوف کو اسلام میں داخل کیا گیا۔ جیسا کہ اے جے آربری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ‘‘Thus sir Jones speculated, basing his theories on an acquaintance with the mysticism of the Persian poets only’’ [2].

ترجمہ: اس طرح سر ولیم جونز کے تصوف کے بارے میں جو جو تھیوری ہے وہ صرف ایرانی شعراء پر مبنی ہے۔

اس سے اے جے آربری یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی تصوف کو ایرانی شعراء سے لیا گیا ہے۔

---

[1] Arberry,*An Introduction to the History of Sufism*,79.

[2]-Ibid.,10.

یورپی دنیا میں تصوف مختلف لوگوں کے ذریعے پہنچا۔ کیوں کہ اس دور میں لوگوں کو دور دراز ملکوں میں سفر کرنے کا شوق ہوتا تھا خصوصا بعض لوگ تحقیق کی خاطر اپنے پسند کے ممالک کی طرف سفر کرتے تھے اور وہاں کی تہذیب و تمدن کا خاص مطالعہ کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ ولیم جونز بھی مختلف ممالک بنگال، ہندوستان اور ایران کا سفر کیا۔ انھیں یونانی ،لاطینی، فارسی، عربی اور دیگر زبانیں آتی تھی۔ ویدوں، ایرانی شعراء کا مطالعہ کیا تو اسے شعراء، صوفیاء اور فلسفہ ویدانت کے درمیان مشترکات پائی۔ اس طرح انھوں نے ایرانی شعراء کا کلام پڑھ کر فارسی کو تصوف کا مصدر قرار دیا۔

تیسرا نظریہ: اسلامی تصوف کی مصدریت اور ہندی ثقافت:

بعض مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ اسلامی تصوف کا ماخذ ہندی ثقافت ہے، اور یہ اسلامی ثقافت میں ایسا گُھسا ہے جیسا کہ بعض ہندی عادات اور رسم و رواج داخل ہوا ہے۔ یہ لوگ اسلامی تصوف کے بعض نظریات اور وظائف عملیہ کو ہندی تصوف کے متشابہ قرار دیتے ہیں جیسے ہندی مذاہب میں زہد اور ذکر و فکر کے طریقے، معرفت، فناء اور وحدۃ الوجود جیسے مسائل میں ایک گونہ یکسانیت ہے۔

پروفیسر نکلسن کا نظریہ:

تعلیماتِ تصوف کو دیگر مصادر سے اخذ کرنے کے سلسلے میں پروفیسر نکلسن اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامی نے ہندی فلسفے سے متاثر ہو کر تصورِ فنا اسلامی تصوف میں شامل کیا ہے۔ فنا کا تصور دراصل ہندی سے ماخوذ ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> "The sufi conception of the passing away of individual self in universal being is certainly , I think ,of Indian origin .Its first great exponent was the persion mystic , bayazid of Bistm , who may have received it from his teachers,abu ali of sind"[1].

> میرے خیال میں تصوف میں پیش کردہ 'تصورِ فنا' یعنی فرد کا کائناتی وجود میں فنا ہو جانا بھی یقیناً ہندوستانی مذہب کے تصورِ فنا سے ماخوذ ہے۔ اس کے اولین شارح بسطام سے تعلق رکھنے والے ایرانی صوفی بایزید تھے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے یہی تصور اپنے استاد ابو علی سندھی سے اخذ کیا ہو۔

نظریہ کے حامل مستشرقین میں سے Hortman, Max Horten اور A.Von Cremer قابل ذکر ہیں۔ Horten کا یہ نظریہ ہے کہ اسلامی تصوف کے اصول و ضوابط ہندی فکر سے ماخوذ ہیں[2]۔

---

[1] Nicholson,*The Mystics of Islam*,17.

[2] التفتازانی، **مدخل الی التصوف الاسلامی**، ص: 28

ڈاکٹر ابوالعلاء عفیفی لکھتے ہیں

"کہ ہورٹن نے اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔اس سلسلے میں اس نے 1927ءاور 1928ء میں دو مقالے بھی لکھے ہیں۔اس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابو یزید بسطامی و حلاج اور جنید بغدادی کا تصوف ہندی افکار سے بھری تھی۔ خصوصاً منصور حلاج کے نظریات پر زیادہ تر چھاپ ہندی افکار ہی کا تھا۔اور ساتھ ہی اس نے تصوف کے بعض فارسی اصطلاحات کے تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسلامی تصوف بعینہ ہندی ویدی مذہب ہے"[1]۔

اسی طرح دلائل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ :

ابتدائی اکثر مشائخ صوفیہ غیر عربی تھے، جیسے ابراہیم بن ادہم، شقیق بلخی، ابو یزید بسطامی اور یحیی بن معاذ الرازی۔ یہ کہ تصوف اسلامی پہلے پہل خراسان میں ظاہر ہوااور پھیلا۔یہ کہ ترکستان فتح اسلامی سے پہلے مشرقی اور مغربی دنیا کا ایک دینی اور ثقافتی مرکز تھا۔جب اس کے باشندے اسلام میں داخل ہوئے تو انھوں نے اپنے قدیم صوفی عادات و نظریات کے رنگ سے اسلامی تصوف کو رنگ کر دیا۔یہ کہ مسلمان خود بھی ہندی اثرات و نظریات کے اختلاط کے معترف ہیں[2]۔

گولڈ زیہر اور نظریہ ہند:

کتاب تاریخ تصوفِ اسلام میں اس نظریہ پر گولڈ زیہر کا موقف یوں نقل کیا ہے کہ گولڈ زیہر کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم کی زندگی کا واقعہ کہ انھوں نے بادشاہت اور امارت کی زندگی ترک کر کے فقر اور فاقہ کی زندگی اختیار کر لی تھی، ہو بہ ہو مہاتما بدھ کی سوانح زندگی سے ماخوذ ہے، ترکِ دنیا کا جو رنگ بدھ مت میں پایا جاتا ہے وہ یہاں بھی نظر آتا ہے[3]۔

گولڈ زیہر کے اس نظریے کو پروفیسر این میری شِمل اپنی کتاب میں اس طرح لکھتی ہے "

> "For the earliest period influences from Turkestan are much more important, as Richard Hartmann has shown.Ignaz Golziher had already pointed out paralled traditions in Islamic mystical tales and Buddhist stories."[4].

---

[1] عفیفی, ابوالعلاء **مقدمۃ فی التصوف الاسلامی**، ص:34

[2] ایضاً، ص:34

[3] حلیمی، **الحیاۃ الروحیۃ فی الاسلام**، ص:68

[4] Schimmel Annemarie,*Mystical Dimensions Of Islam*,11.

ابتدائی دور کے لیے ترکستان کے اثرات بہت زیادہ اہم ہیں، جیسا کہ رچرڈ ہارٹ مین نے اس کا اشارہ کیا ہے اور Goldziher بھی اس بات کے قائل ہے کہ پہلے تصوف میں صوفیانہ کہانیوں اور بدھ مت کی کہانیوں میں متوازی روایات ملتی ہیں۔

اے۔جے۔آربری:

اے جے آربری اسلامی تصوف کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اسلامی تصوف کا ایک مآخذ ہند ہے۔یعنی وہ کہتا ہے کہ مسلم صوفیاء نے اپنی تعلیمات انڈیا سے حاصل کیا ہے۔اس کو ثابت کرنے کے لیے مختلف سکالرز کے نظریات کو بیان کرتا ہے۔ان سکالرز میں سے ایک مشہور سکالر رچرڈ ہارٹ مین ہے۔اس حوالے سے رچرڈ ہارٹ مین کے تین نظریے کو بیان کرتا ہے۔

رچرڈ ہارٹ مین نے تصوف کے مآخذ کے حوالے سے تین نظریات پیش کیے ہیں:

پہلا نظریہ: رچرڈ ہارٹ مین کہتے ہیں کہ ترکستان یعنی وسط ایشیا مشرق و مغرب کی تہذیبوں کے اتصال اور ملاپ کا مقام ہے روس اور انڈیا کی سرحدیں وہاں ملتی ہیں۔ سرحدیں ملنے کی وجہ سے رچرڈ نے تین نظریات قائم کیے کہ وسط ایشیاء میں تینوں تہذیبیں ملتی ہیں، لہٰذا یہاں ایک دوسرے کے نظریات اور فلسفے بھی منتقل ہوتے ہوں گے۔چونکہ خراسان اور ایران کے دیگر علاقوں میں مسلم صوفیاء کی کثرت تھی اس لیے مسلم صوفیاء نے تصوف کی تعلیمات روس، یونان اور انڈیا سے لی ہوں گی۔

دوسرا نظریہ: رچرڈ نے تصور رضا کے حوالے سے ایک نظریہ قائم کیا ہے کہ صوفیاء اللہ تعالی کی خوشنودی اور رضا پر راضی رہنے پر بہت زور دیتے ہیں جب کہ ہندوؤں میں یہ تصور بہت زیادہ ملتا ہے، لہٰذا اندازا ہوتا ہے کہ صوفیاء نے یہ تصور وہیں سے لیا ہوگا[1]۔اس سے رچرڈ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اسلامی تصوف کی بنیاد ہند و تعلیمات ہیں۔

تیسرا نظریہ: رچرڈ ہارٹ مین کہتا ہے کہ ایران اور ہندوستان کی تعلیمات کے اثرات اسلامی تصوف میں بایزید بسطامی کے ذریعے داخل ہوئے ہیں[2]۔

ان تین نظریات سے ہارٹ مین نے یہ نتیجہ لیا کہ اسلامی تصوف کی بنیاد خارجی ہے۔اسلام میں اس کو مختلف ذرائع سے داخل کیا گیا ہے۔

---

[1] Arberry, *An Introduction to the History of Sufism*, 36.
[2] Ibid, 36.

اسی طرح Richerd Hortman کا قول Arberry نقل کرتے ہیں کہ صوفی ابو علی سندی، ابو یزید البسطامی کے استاذ رہے ہیں اور یہ صاف ظاہر ہے کہ تصوف کا اصل ہندی ہے [1]۔

اس طرح اے جے آربری دوسروں کے نظریات کے توسط سے یہ ثابت کیا کہ تصوف کے مصادر میں سے ایک ہندی تعلیمات ہیں۔

چوتھا نظریہ: اسلامی تصوف کا اصل یونانی:

مستشرقین کا ایک گروہ اس بات کے قائل ہے کہ اسلامی تصوف یونانی تصوف کی ایک خاص قسم ہے۔ وہ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ اسلامی تصوف کو بعض افکار بقول ان کے قدیم اور جدید افلاطونی فلسفہ سے ملتے جلتے ہیں۔

پروفیسر نکلسن کا موقف:

پروفیسر نکلسن اسلامی تصوف کی مصدریت پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عیسائیت کے بعد تصوف کی تعلیمات کا دوسرا ذریعہ جدید افلاطونیت ہے۔ کہ اسلامی تصوف پر جدید افلاطونیت کا اثر ہے ، بلکل اسی طرح جس طرح اس پر عیسائیت کا اثر ہے۔ نکلسن نے الٰہیات، فلسفہ اور مابعد الطبیعات میں ارسطو، افلاطون اور اسلامی تصوف میں مشترک پہلو اور نظریات ڈھونڈے۔ اس وقت الٰہیات، فلسفہ اور مابعد الطبیعات پر بحث ہوتی تھی، جس سے عقیدہ وجود میں آیا۔ انھوں نے ان چیزوں کے مطالعہ سے یہ تصور بنایا کہ یہ چیزیں مسلم صوفیاء کے ہاں بھی ملتی ہیں جو بہت بعد کا زمانہ ہے، تو انھوں نے یہ مفروضہ گھڑ لیا کہ مسلم صوفیاء نے یہ تصورات جدید افلاطونیت سے لیے ہیں۔

اس پر نکلسن چار چیزوں کی مثال دیتے ہیں جو اسلامی تصوف اور افلاطونیت میں مشترک ہیں:

1۔ فلسفہ اشتراق: اس میں اندرونی شہود اور سیر و سلوک پر تاکید کرتا ہے فلسفہ اشراق کے مؤسس، شہاب الدین سہروردی ہیں [2]۔ نظریہ صدور، فلسفہ ابتداء، فلسفہ وجد۔

---

[1] Ibid,34-

[2] مطہری، مرتضی ، **مجموعہ آثار**، (قم: انتشارات موسسہ فرہنگی اشراق و عرفان ,۱۳۷۶ش) ص:۱۴۸

ان چار چیزوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ یہ چار چیزیں تصوف میں پائی جاتی ہیں اور ان کا تذکرہ جدید افلاطونیت میں بھی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبا یہ تعلیمات صوفیاء نے افلاطونیت سے لی ہوں گی [1]۔

نکلسن اپنے اس دعوٰی کے لیے دلیل پیش کرتے ہیں کہ اسلامی تصوف میں معرفت ، محبت اور وجد کا یہ تصور حضرت ذوالنون مصری نے متعارف کرایا ہے۔ذوالنون مصری کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود بہت بڑے فلاسفر تھے،اس لیے انھوں نے فلسفیانہ دین کا پورا تصور اسلامی تصوف میں داخل کیا۔جس زمانے میں ذوالنون مصر میں پیدا ہوئے اس زمانے میں مصر Hellenistic science کا مرکز تھا، گویا وہ صرف وہاں ہونے کی بنا پر فلسفی تھے۔وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> "One of those who bore the chief part in its developments, Dhu'1-Nun the Egyptian, is described as a philosopher and alchemist.In other word, a student of Hellenistic science" [2].
>
> اس کے فروغ میں غالب حصہ ذوالنون مصری کا ہے جو کہ ایک فلاسفر اور کیمیا دان تھے دوسرے لفظوں میں یونانی علوم کے طالب علم تھے۔

اے۔جے۔آربری کا نظریہ:

اے۔جے آربری اس بات کا قائل نہیں ہے کہ تصوف کا اصل یونانی ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ کسی نے تصوف کو یونان کے ساتھ اور کسی نے جدید افلاطونیت کے ساتھ منسوب کیا۔جن صوفیاء کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کیا ان میں سے کوئی یونانی زبان سے واقف تھے ؟در حقیقت دیکھا جائے تو اوائل دور کے صوفیاء جنھوں نے تصوف مرتب کیا،ان میں سے شخصی طور پر کوئی بھی یونانی زبان سے متعارف نہ تھا۔اگر انھیں یونانی زبان آتی نہیں تھی تو پھر انھوں نے یونانی فلسفے اور جدید افلاطونیت کے افکار کو کہاں سے لیا؟اگرچہ مامون رشید کے دور میں مختلف زبانوں کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں مگر تصوف تو اس سے بہت عرصہ پہلے وجود میں آچکا تھا اور ابتدائی صدیوں میں تصوف پر لٹریچر بھی وجود میں آچکا تھا۔

اے۔جے آربری کے اصل الفاظ یوں ہیں:

> "It is by no certain that Plotinus was ever translated anto Arabic , and in any case , it seems that if any Greek authors excerised a real direct influence on the Arab

---

[1] - Nicholson, *The Mystics of Islam* , 12-13
[2] Ibid,13.

mystic , none of whom is known to have been personally acquainted with Greek, they are more likely to have been late syncretists"[1].

یہ کسی بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ Plotinus کا ترجمہ کبھی عربی میں کیا گیا ہو اور نہ ہی کسی صورت یہ لگتا ہے کہ کسی یونانی مصنف نے عرب صوفیاء پر براہ راست اثر کیا ہو۔ان میں سے کسی کے بارے میں کہا نہیں جاسکتا کہ یونانیوں کے ساتھ ان کے براہِ راست رابطے تھے۔شاید ان کے بارے میں زیادہ امکان ہے کہ ان کا تعلق عقائد و نظریات اور مذاہب کو مخلوط کرنے والے قدیم گروہ سے رہ چکا ہو۔

پروفیسر نکلسن کے علاوہ کچھ اور مستشرق اس نظریے کے قائل ہیں: جیسا کہ E. H Whinfield کا بیان ہے کہ نوافلاطونیت میں اشراقی باطنی فلسفہ میں اور تصوف کے الہام اور کشف میں ایک گونہ مشابہت اور مماثلت ہے، جو ایک واضح ثبوت ہے کہ صوفیاء نوافلاطونیت سے متاثر ہیں [2] ۔

ان اقتباسات سے واضح ہوا کہ مستشرقین کے ہاں اسلامی تصوف کا مآخذ اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام میں یہ سب بعد میں داخل کیا ہے۔کیونکہ اسلام سے پہلے ہندومت، بدھ مت، عیسائیت اور یہودیت موجود تھے تو یہ تعلیمات ان مذاہب میں نمایاں ہیں۔اس اعتبار سے مستشرقین کہتے ہیں کہ اسلامی تصوف کے مآخذ خود اسلام نہیں ہے بلکہ تصوف اسلام میں داخل کیا گیا ہے۔نکلسن، گولڈ زیہر اور اے۔جے آربری نے اپنے ان نظریات کو ثابت کرنے کے لیے بہت سے عوامل و اسباب اور اقتباسات ذکر کیے جو کہ اوپر تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

مستشرقین کی مصدریتِ تصوف پر تجزیہ و تحلیل:

یہاں مستشرقین نے مصدریتِ تصوف پر جو جو نظریات رکھتے تھے ان کو تفصیلا درج بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے۔اب یہاں ان کے نظریات کا تجزیہ و تحلیل پیش کیا جارہا ہے۔

نظریہ اول کا تجزیہ و تحلیل:

مستشرقین اس بات کے قائل ہیں کہ تصوف کا اصل اسلام نہیں بلکہ مسیحیت ہے۔

مستشرقین خود آپس میں اپنے نظریات کے خلاف بولتے ہیں جیسا کہ اے۔جے آربری تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تصوف کی مصدریت کو غیر از اسلام دوسرے مختلف مذاہب سے قرار دینا یہ مذہبی تعصب کے علاوہ کچھ نہیں کیونکہ اس نے علمی امانت کو بالائے طاق رکھ کر اس طرح الزامات لگائے ہیں۔

---

[1] Arberry, *Introduction to the History of Sufism* ,64.

[2] E. H Whinfield, *Gulshan-i-Raz (The mystic Roze Gorden)*, (London: Trubner & Co. ,1880), 6-7.

"It is not so much honest scholarship, as the worst form of the sectarian bigotry" [1].

"یہ اتنا ایماندار وظیفہ نہیں ہے، جتنا کہ فرقہ وارانہ تعصب کی بدترین شکل ہے"۔

رہی یہ بات کہ عربوں کا اسلام سے پہلے اور بعد میں نصاری کے ساتھ روابط تھے۔ اگرچہ جزیرۃ العرب میں موجود نصاری کے مختلف فرقے موجود تھے جو مختلف ثقافات اور افکار سے متاثر تھے۔ لیکن مسلمانوں کا ان سے کسی قسم کی روحانی زندگی کے لیے ہدایات اور ارشادات طلب کرنا خلاف عقل ہے کیونکہ مسلمانوں کے پاس خود روحانیت کا ایک وافر ذخیرہ قرآن وسنت کی شکل میں موجود ہے، جو زہد اور نفس کے ساتھ مجاہدہ اور اللہ تعالی سے محبت سے کی تعلیمات پر مبنی ہے۔

دوسری بات اس حوالے سے خود مستشرقین آپس میں بھی ایک رائے پر متفق نہیں ہیں، بلکہ بعض مستشرقین کا تو اپنی آراء میں بھی تضاد ہے۔ تصوف پر سب سے زیادہ کام کرنے والے مستشرقین ماسینیون اور نکلسون ہیں، وہ بھی اس طرف مائل ہیں کہ تصوف اسلامی کسی اجنبی مصدر سے ماخوذ نہیں ہے۔ کبھی کبھی اشارہ دیتے ہیں کہ فلاں مصدر سے مشابہت رکھتا ہے، لیکن بعد میں دوسری جگہوں پر اپنی قول سے رجوع کرتے ہیں۔

باقی یہ بات کہ مسیحی راہبوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات، تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر یہ تعلقات ثابت بھی ہو جائیں تو یہ قرآنی تعلیمات کے منافی نہیں ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَى ذَلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ﴾ [2]۔

ترجمہ: "(اے رسول) اہل ایمان کے ساتھ عداوت میں یہود اور مشرکین کو آپ پیش پیش پائیں گے اور ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں انھیں قریب تر پائیں گے، جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں عالم اور درویش صفت لوگ ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے"۔

اگر ہم بنظر غائر قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے جوہر کا مطالعہ کریں، تو ہمیں روز روشن کی طرح عیاں ہو گا کہ زہد، مجاہدۃ النفس اور دنیا کی شہوتوں اور لذتوں سے دور رکھنے کی واضح مصادر قرآن کریم اور احادیث نبویہ ہیں۔

مثال کے طور پر قرآن کریم کی ایک آیت:

---

[1] Arberry, *An introduction to the history of Sufism*، 33.

[2] المائدہ:82-83

﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾[1]۔

ترجمہ: ''جان رکھو کہ دنیاوی زندگی صرف کھیل، بیہودگی، آرائش، آپس میں فخر کرنا اور اولاد واموال میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش سے عبارت ہے، اس کی مثال اس بارش کی سی ہے جس کی پیداوار (پہلے) کسانوں کو خوش کرتی ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے پھر دیکھتے ہو کہ وہ کھیتی زرد ہو گئی ہے پھر وہ بھس بن جاتی ہے جب کہ آخرت میں (کفار کے لیے) عذاب شدید اور (مومنین کے لیے) اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو سامان فریب ہے''۔

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ جو زہد کا مجسم پیکر تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راتوں کو اتنی کثیر عبادت کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں مبارک میں ورم آجاتا۔ اتنی کثیر عبادت کے باعث صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ اتنی مشقت کیوں فرماتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے بخشش کا وعدہ فرمارکھا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا : کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں[2]۔

نظریہ دوم کا تجزیہ و تحلیل:

مستشرقین نے تصوف کی مصدریت کے حوالے سے ایک مصدر، فارسی وایرانی تعلیمات کو قرار دیا تھا۔ اس پر تجزیاتی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ :

تصوف صرف معروف کرخی اور بایزید بسطامی کے مرہون منت نہیں ہے اور نہ سارا تصوف ان ہی حضرات کی وجہ سے پھیلا، بلکہ اس میں مغرب عربی اور مصر کا خاص عمل دخل ہے، جیسے ذوالنون مصری، ابو سلیمان الدارانی اور حارث المحاسبی وغیرہ۔ اور یہ جو نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ عالم کا فی ذاتہ کوئی وجود نہیں ہے اور موجود حقیقی رب ذوالجلال کی ذات

---

[1] الحدید:20

[2] بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب التہجد، باب قیام النبیؐ، ح:1130، ص:207۔

ہے۔اگراس کااشارہ تصوف میں وحدۃالوجود کی طرف ہے،تو یہ نظریہ تصوف،کہ آخری چھٹی صدی میں آیااور اسلام کے تمام صوفیاءکا یہ مذہب اور مسلک نہیں ہے[1]۔

وہ مستشرقین جو اس بات کے قائل ہیں کہ اسلامی تصوف کی مصدریت میں فارسی کا دخل ہے ۔اس کو مستشرق Arberry اس انداز میں ردّ پیش کرتا ہے۔کہ ان کا یہ نظریہ جدید تحقیق کے اصولوں کے منافی ہے،اور ایک فضول بحث چھیڑی ہے[2]۔

اور مستشرق پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں:

"That the first foundation and basis of knowledge of Al-Kalam, Fiqh and Sufism is the Holy Quran and the Sunnah"[3] .

"کہ علم الکلام، فقہ اور تصوف کی اوّل بنیاد اور اساس قرآن کریم اور سنت ہی ہے"۔

نظریہ سوم کا تجزیہ و تحلیل:

مستشرقین نے تصوف کے مصادر میں سے ایک مصدر ہندی اور اس کے فلسفے کو قرار دیا ہے اس بارے میں خود مستشرقہ A. Schimmel لکھتی ہیں:

"The arguments which he has given for making Sufism a Hindi source are not satisfactory and these arguments are insufficient to claim him"[4] .

جس نے تصوف کو ہندی مصدر قرار دینے کے لیے جو دلائل دیئے ہیں وہ تسلی بخش نہیں ہیں اور اس جیسے دعوی کرنے کے لیے یہ دلائل ناکافی ہیں۔

جبکہ Arberry کہتے ہیں :

"No one tried to make Sufism a Hindi source except Max Horten, but the proponents of his arguments, or the inferences he made, contradicted his own claim, and its purpose. And the style is contradictory. Masnavin, on the other hand, calls Hallaj a monotheist"[5].

ترجمہ: کہ میکس ہارٹن جیسے آدمی کے علاوہ کسی اور نے تصوف کو ہندی مصدر قرار دینے کی کوشش نہیں کی، لیکن اس کے دلائل کا جو طریقۂ کار ہے یا اس نے جو استنباطات کیے ہیں وہ خود اپنے دعوی کی مخالفت کرتے ہیں، اور اس کا مقصد اور طرز بیان جدا لی ہے۔ جبکہ ماسنیون نے حلاج کو موحد (Monotheist) قرار دیا ہے۔

---

[1] http://religion.asianindexing.com/index.php?title=Al-Idah/(Accessed 21-02-2022)
[2] Arberry, *An introduction to the history of Sufism*,32.
[3] Niehasson,*The Idea of personality in Sufism* ,8-9.
[4] Schimmel .Annemarie .*Mystical Dimension of Islam*, (The University of North Carolina Press .1975), 33
[5] Arberry, *An introduction to the history of Sufism*,31.

اسی طرح پروفیسر نکلسن (Nicholson) تصوف کی مصدریت کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ :

"A part from the fact that Sufism like every other religions movement in Islam, has its roots in the Quran and Sunnah and cannot be understand unless we study it from the source upwards"[1].

درحقیقت تصوف اسلام کے دیگر دینی تحریکات کی طرح اس کی جڑیں اور ماخذ قرآن وسنت سے جڑی ہیں۔اور اس کی حقیقت کو سمجھنے سے ہم اس وقت تک قاصر رہیں گے جب تک ہم اس کے بنیادی مصادر تک رسائی نہ کریں۔

اس حوالے سے نکلسن نے دیوان شمس تبریز کے ترجمہ کے مقدمہ میں کہتے ہیں کہ :

"The identity of two beliefs does not prove that one is generated by the other, they may be the result of a like cause" [2].

دو عقیدوں کے درمیان مشابہت اور مماثلت اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ ایک دوسرے سے متاثر ہیں۔ہو سکتا ہے دونوں کے سبب مشترک کا نتیجہ ہو۔

اس طرح مستشرقین جو تصوف کے ہندی اثرات کے بارے میں خیال کرتے ہیں، ان کے دلائل میں کوئی وزن نہیں ہے اور زمینی حقائق کے بالکل برعکس ہیں۔

نظریہ چہارم کا تجزیہ و تحلیل :

بعض مستشرقین نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اسلامی تصوف کی بنیاد یونانی فلسفہ فکر ہے، اسلام میں اس قسم کے تصوف کو بعد میں داخل کیا گیا ہے۔اس حوالے کچھ تجزیہ و تحلیل یہ ہے کہ مصر کے تصوف کے بڑے بڑے علماء جیسے ابوالعلاء عفیفی، ڈاکٹر محمد مصطفی حلمی اور شیخ المشایخ ابوالوفاء التفتازانی اس بات پر متفق ہیں کہ تصوف میں بعض مصطلحات اسلام میں دخیل ہیں جو یونانی فلسفہ سے عمومی طور پر اور افلاطونی فلسفہ سے خصوصی طور پر بذریعۂ ترجمہ مسلمانوں کے اندر آئے ہیں جو کہ ابن ناعم نے کتاب "اتولوجیاارسطاطالیس" کا ترجمہ کر کے مسلمانوں کو پیش کیا تھا کہ ارسطو نے افلاطون کے تاسوعات سے اقتباس لیا ہے اور اس سے لاہوتی مذہب نکلا ہے۔

ڈاکٹر محمد مصطفی حلمی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"کہ "اتولوجیاارسطو" جو نوافلاطونیت کی کتاب ہے، میں مذکور ہے کہ حقیقت علوی کا ادراک فکر سے نہیں ہوتا۔بلکہ اس کا ادراک نفس اور عالم محسوس سے فناء اور مجرد ہو کر مشاہدہ سے کیا جاتا ہے۔اس نظریہ کی گنجائش فلسفی صوفیاء کے کلام میں بھی معرفت کے باب میں موجود ہے کہ حس اور عقل سے معرفت حقیقی کا حصول ناممکن ہے۔بلکہ اس کا حصول تب ہوتا ہے جب بندہ نفس کو ترک کرے اور اللہ تعالی اس کے دل میں نور ڈال دے اور وہ ذات الٰہی میں ایسا

[1] Nicolson. *The idea of personality in Sufism*, 4.
[2] Nicolson. *Selected poems from the Diwani Shams Tabrezi*. (USA: ibex publishers,2001) ,65

مستغرق ہو کہ فرق بالکل ختم کردے۔ پس ثابت ہوا کہ معرفت کے حصول کے طریقہ میں دونوں مکاتب فکر میں مشابہت ہے۔ اسی طرح مسلم صوفیاء، دلف ٹیمپل (معبد) میں لکھے ہوئے اس یونانی عبارت سے بھی واقف ہوں گے کہ "اپنے نفس کو خود جان لو"۔ صوفیاء نے اس عبارت کو پہچان لیا اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب اس قول " مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ "[1]۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا کے زمرے میں لیا۔ اسی طرح فلسفی صوفیاء کے وضع کردہ بعض اصطلاحات جیسے کلمہ، عقل اوّل، علت اور معلول، فیض وجد، وحدت اور کثرت جیسے الفاظ کا استعمال تاثیر کی ایک واضح دلیل ہے"[2]۔

لیکن یہ تاثیر اسلامی تصوف پر بہت کم درجے تک محدود رہا۔ جو عقل فعال اور نفس کو بدن سے مجرد کرکے اوپر مخلوق کے ساتھ اتصال وغیرہ جیسے باتیں کرنے والے اس تاثیر کی زد میں آئے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ معرفت کی باتیں کرنے والوں کا مصدر خالص اسلامی ہے۔ جو قرآن و حدیث میں اس کے نمونے ملتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن کے تصوف پر یہ اثرات تھے وہ چھٹے صدی ہجری کے چند لوگ تھے۔ اس سے پہلے تصوف اپنے خالص اسلامی رنگ میں مضبوط بنیادوں پر استوار ہوا تھا[3]۔

ان اقتباسات اور نکات سے اس بات کی رہنمائی ہوگئی کہ اسلامی تصوف کی بنیاد خارج از اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام ہی اس کی بنیاد ہے۔ اسلامی تعلیمات میں تزکیہ نفس، احسان اور زہد و تقویٰ کے حوالے سے بہت ساری تعلیمات ملتی ہے۔ ان تعلیمات کی رہنمائی میں مسلمانوں اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ جو لوگ اسلامی تصوف کی بنیاد غیر از اسلام قرار دیتے ہیں ان کی دلیلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مختلف مفروضوں کی بناپر بات کی ہیں ان کے پاس کوئی ٹھوس اور مضبوط دلائل و شواہد نہیں ہیں اور مستشرقین نے قرآن و حدیث کو ان تعلیمات کے لیے مصدر بنا کر ان کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ ان کا حوالہ پیش کیا۔ جب اصل مصادر قرآن و حدیث کا مطالعہ ہی نہیں کیا تو کیسے معلوم ہوگا کہ ان تعلیمات کا اصل کیا ہے، خصوصاً تصوف کے بارے میں کیا معلوم ہوگا کہ تصوف کا اصل کیا ہے، اس کے مآخذ کونسے ہیں۔ کیونکہ مستشرقین نے تو تصوف کو عیسائیت، فارسی، ہندی اور یونان کی تاریخ کے پس منظر دیکھتا رہا۔ لہٰذا وہ اس کا ناطہ ایران، یونان اور ہند سے ملاتے رہے۔ ان کا عرب سے کوئی تعارف نہیں ہوا اور نہ انھیں قرآن و حدیث اور عربی مصادر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ لہٰذا ایسی صورت میں ان سے مآخذ تصوف کی درست معلومات ملنا بعید از حقیقت ہے۔

---

[1] مجلسی، محمد باقر، **بحار الانوار**، (بیروت: مؤسسۃ الوفاء، 1404ق)، ص: 32/2

[2] حلمی، محمد مصطفی، **الحیاۃ الروحیۃ فی الاسلام**، ص 57- 58

[3] ایضاً۔

فصل دوم: اسلامی تصوف کی تشکیل وارتقاء پر منتخب مستشرقین کے آراء:

پہلی فصل میں تصوف کی مصدریت کے حوالے سے مستشرقین کی جو آراء تھی ان کو تفصیل سے بیان کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ان آراء پر تجزیہ و تحلیل بھی کیا گیا۔ جس طرح تصوف کے اصول اور اس کے مشتقات میں اختلاف تھے اسی طرح تصوف کی تشکیل وارتقاء میں بھی مختلف نظریات ہیں۔ اب اس فصل میں اسلامی تصوف کی تشکیل کے حوالے سے مستشرقین میں سے پروفیسر نکلسن، اگناز گولڈزیہر اور اے۔ جے آربری کا خصوصی مطالعہ کیا گیا ہے۔

اسلامی تصوف کی تشکیل وارتقاء کے بارے میں نکلسن کا موقف:

پروفیسر نکلسن تصوف کی تشکیل، نشو نما اور ارتقاء کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اسلامی تصوف کی تعلیمات کا بیشتر حصہ مسیحیت سے مستعار لیا گیا ہے۔ جن جن چیزوں کے مشترکہ ملاپ سے تصوف وجود میں آیا اس کا سب سے اہم عنصر مسیحیت ہے۔ گویا ان کا دعویٰ ہے کہ تصوف کی تشکیل عیسائیت کی تعلیمات سے ہوئی ہے۔ وہ اس دعوے پر دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Many Gospel texts and apocryphal saying of Jesus are cited in the oldest sufi biographies"[1].

انجیل کی بہت سی عبارات اور حضرت عیسی علیہ السلام کے وضعی اقوال کا قدیم ترین صوفی سوانح عمریوں میں حوالہ دیا گیا ہے۔

اب وہ کون سی تعلیمات ہیں، جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ انجیل یا مسیحی راہبوں سے لی گئی ہیں؟ اس پر پروفیسر نکلسن مثال دیتے ہیں کہ صوفی اور تصوف کا نام "صوف" سے نکلا ہے۔ جیسے:

"The name was derived from suf , and was originally applied to those Moslem ascetics who,in imitation of Christian hermits , clad themselves in coarse woolen grab as a sign of penitence and renunciation of worldly vanities"[2].

تصوف کا نام "صوف" سے لیا گیا ہے اور اس کا اطلاق ان مسلمان زاہدوں پر کیا گیا ہے جنھوں نے عیسائی راہبوں کی اتباع میں توبہ اور دنیوی رغبتوں سے گریز کی علامت کے طور پر کھردرا اُونی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔

وہ کہتے ہیں کہ صوف کا اُونی لباس، جسے صوفیاء پہنا کرتے ہیں، اسی وجہ سے ان کا نام صوفیاء رکھا گیا یعنی تصوف کا مادہ اشتقاق صوف ہے اور تصوف کا اصل مآخذ عیسائیت ہے کیوں کہ عیسائی راہب یہ لباس پہنتے تھے۔

---

[1] Nicholson.*The Mystics of Islam*, (G Bell and Sons LTD. 2006)،10.
[2] Nicholson,*The Ideal of personality in Sufism* ,4.

پروفیسر نکلسن کا تصوف کے عیسائیت سے ماخوذ ہونے پر دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ خاموشی صوفیاء کی خصوصیت ہے اور زیادہ بولنے پر صمت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ عیسائیت راہبوں سے لی گئی تعلیم ہے کیونکہ عیسائی راہبوں کے ہاں بھی خاموشی کو ترجیح دی جاتی تھی[1]۔

پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں کہ صوفیاء کی ایک خصوصیت ذکرِ الٰہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ذکرِ الٰہی کی تعلیمات بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھیں، اس لیے یہ بھی عیسائیت کی خصوصیت ہے اور صوفیاء کی اس خصوصیت کا اصل بھی عیسائیت ہی ہے[2]۔

اسی طرح پروفیسر نکلسن مزید تصوف کی تشکیل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ صوفیاء زہد پر بہت زور دیتے ہیں، جب کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات ہیں۔ بالخصوص عیسائی راہب اس کی عملی تصویر ہوا کرتے تھے، وہ دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو کر آخرت کی فکر کے لیے جنگلوں میں چلے جایا کرتے تھے۔

نکلسن مزید لکھتے ہیں کہ تصوف میں اور صوفیاء کے ہاں محبتِ الٰہی کا ذکر بہت زیادہ ملتا ہے جب کہ یہ تصور بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا حصہ ہے۔ نکلسن اپنی کتاب The Mystics of Islam میں تصورِ محبت پر ایک مکمل باب قائم کرتے ہیں۔ وہ محبتِ الٰہی پر اس لیے باب قائم کرتے ہیں کہ اس تصور کی اسلامی تصوف میں بڑی اہمیت ہے۔ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "Any one acquainted, however slightly, with the mystical poetry of Islam must have remarked that the aspiration of the soul towards God is expressed, as in almost the same terms which might be used by an Oriental Anacreon or Herrick"[3].
>
> "اسلام کی صوفیانہ شاعری سے اگرچہ قدرے واقفیت رکھنے والے کسی نے بھی کہا ہو گا کہ خدا کی طرف روح کی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے، جیسا کہ تقریباً انہیں اصطلاحات میں جو کسی اورینٹل اینکرون یا ہیرک نے استعمال کیا ہو گا"۔

جس کسی کو بھی اسلام کی صوفیانہ شاعری سے ذرا سا شغف ہے، وہ اتنا ضرور سمجھتا ہے کہ رجوع الی اللہ کا اظہار ایک اصول کی طرح کسی مشّاق مشرقی مدحت نگار کی نطقِ سرور و ستائش ہی میں ہو سکتا ہے۔

---

[1] Nicholson, *The Mystics of Islam*,65.
[2] Ibid,67.
[3] Ibid,102.

وہ کہتے ہیں کہ اسلام کی صوفیانہ شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ روح کی خدا کی ذات سے واقفیت یعنی ''تصورِ محبت'' ویسے ہی ہے جیسے قدیم مذاہب اور فلسفوں میں یہ تصور پایا جاتا تھا۔ محبت الٰہی کے تصور پر ان کا درج ذیل پیرا گراف انتہائی اہم ہے جو ان کے موقف کو واضح کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"Ibn al–Arabi claims that Islam is peculiarly the religion of love , inasmuch as the Prophet Mohmammad is called God's beloved ,but though some traces of this doctrine occur in the Koran , its main impulse was unquestionably derived from Christianity"[1].

ابن عربی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام خاص طور پر محبت کا دین ہے، کیونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا محبوب کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ایسے کچھ آثار قرآن مجید میں بھی ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی اصل بلاشبہ عیسائیت سے لی گئی ہے۔ نکلسن کہتے ہیں کہ اگرچہ تصور محبت کے چند شواہد قرآن سے ملتے ہیں مگر اصل میں بغیر کسی تردد وخوف کے میں کہ سکتا ہوں کہ یہ نظریہ مسیحیت سے اخذ کیا گیا ہے۔

تصورِ محبت عیسائیت سے کیوں ماخوذ ہے، اس پر نکلسن لکھتے ہیں کہ ہمیں تصورِ محبت پر تصوف کے بارے میں پرانے عربی لٹریچر سے جو آیاتِ قرآنیہ ملتی ہیں، وہ تصورِ محبت کو خوفِ الٰہی کی طرف لے جاتی ہیں۔ مگر جب محبت، خوف اور ڈر پر مبنی ہو وہ محبت نہیں ہوتی۔ لہذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیاء نے یہ تصور مسیحیت سے لیا ہے۔

نکلسن دلیل کے طور پر حضرت عیسی علیہ السلام کے ایک واقع کا حوالہ دیتے ہیں جو پرانی بائبل میں بیان ہوا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام تین آدمیوں کے پاس سے گزرے۔ تینوں کے جسم کمزور، لاغر اور چہرے زرد تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا تمھیں اس حال میں کس نے پہنچایا۔ انھوں نے کہا: دوزخ کی آگ کے خوف نے ہمیں یہاں تک پہنچادیا حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا: تم ایک ایسی چیز سے ڈرتے ہو جو مخلوق ہے اور اللہ اس کا خالق ومالک ہے! تم اس کی پیدا کردہ چیز سے خوف کر رہے ہو! لہٰذا اللہ تمھیں اس خوف کی وجہ سے نجات دے گا[2]۔

"Walking forward, he met three more people who were thinner than the first ones and had yellow faces. When asked who brought you to this point? So he said: Desire for heaven. The answer to the first three was fear and the answer to the second three was acceptance. Hazrat Isa (AS) said: Jannah is the creation of Allah. You desire His creation for the sake of Allah. Allah will surely bring you to this place. He went ahead and met three more men. They were thinner and yellow-faced than the first

[1] Ibid.111.
[2] Nicholson, *The Ideal of personality in Sufism*,32.

two. When you asked them about this situation. How did you get lucky? So he said: Allah's love has brought us here. He said to Jesus: You are the closest to Allah" [1].

"آگے چل کر مزید تین اشخاص سے ملے جو پہلے والوں سے زیادہ لاغر اور زرد چہرے والے تھے۔ جب ان سے پوچھا کہ تمھیں اس مقام تک کس نے پہنچایا؟ توانھوں نے کہا: جنت کی تمنا نے۔ پہلے تین کا جواب خوف تھا اور دوسرے تین کا جواب رجا تھا۔ حضرت عیسی علیہ السلام نے کہا: جنت اللہ کی پیدا کردہ مخلوق ہے۔ تم اللہ کی وجہ سے اس کی مخلوق کی تمنا کرتے ہو۔ تمھیں یقیناً اللہ اس مقام تک پہنچادے گا۔ آگے چل کر مزید تین آدمیوں سے ملے۔ وہ پہلے دونوں سے نحیف اور زرد چہرے والے تھے۔ جب ان سے پوچھا تمھیں یہ حال کس طرح نصیب ہوا؟ توانھوں نے کہا: اللہ کی محبت نے ہمیں یہاں تک پہنچادیا ہے۔ اس پر حضرت عیسی علیہ السلام سے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہو"۔

پروفیسر نکلسن اسلامی تصوف کی تشکیل و ارتقاء کے بارے میں مزید یوں رقم طراز ہے کہ عیسائیت کے بعد تصوف کی تعلیمات کا دوسرا ذریعہ جدید افلاطونیت ہے۔ نکلسن کہتے ہیں کہ اسلامی تصوف پر جدید افلاطونیت کا اثر ہے، بلکل اسی طرح جس طرح اس پر عیسائیت کا اثر ہے۔ نکلسن نے الٰہیات، فلسفہ اور مابعد الطبیعات میں ارسطو، افلاطون اور اسلامی تصوف میں مشترک پہلو اور نظریات ڈھونڈے۔ اس وقت الٰہیات، فلسفہ اور مابعد الطبیعات پر بحث ہوتی تھی، جس سے عقیدہ وجود میں آیا۔ انھوں نے ان چیزوں کے مطالعہ سے یہ تصور بنایا کہ یہ چیزیں مسلم صوفیاء کے ہاں بھی ملتی ہیں جو بہت بعد کا زمانہ ہے، توانھوں نے فرض کرتے ہوئے یہ مفروضہ گھڑ لیا کہ مسلم صوفیاء نے یہ تصورات جدید افلاطونیت سے لیے ہیں۔

اس پر نکلسن چار چیزوں کی مثال دیتے ہیں جو اسلامی تصوف اور افلاطونیت میں مشترک ہیں:

1۔ فلسفہ اشتراق: اس میں اندرونی شہود اور سیر و سلوک پر تاکید کرتا ہے فلسفہ اشراق کے مؤسس، شہاب الدین سہروردی ہیں[2]۔

2۔ نظریہ صدور: اس سے مراد یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے سے تخلیق کیا ہے۔

3۔ فلسفہ معرفت: سے مراد وہ علم ہے جس کے ذریعے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

---

[1] - Nicholson, *The Mystics of Islam*,10,11.

[2] مطہری، مرتضی ، **مجموعہ آثار**، ص:148/5

4۔ فلسفہ وجد: وہ کیفیت ہے جس میں انسان اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے۔ انسان جب وجد میں ہوتا ہے تو وہ اپنی حدود سے باہر ہوتا ہے۔

ان چار چیزوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ یہ چار چیزیں تصوف میں پائی جاتی ہیں اور ان کا تذکرہ جدید افلاطونیت میں بھی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ تعلیمات صوفیاء نے افلاطونیت سے لی ہوں گی[1]۔

نکلسن اپنے اس دعوٰی کے لیے دلیل پیش کرتے ہیں کہ اسلامی تصوف میں معرفت، محبت اور وجد کا یہ تصور حضرت ذوالنون مصری نے متعارف کرایا ہے۔ ذوالنون مصری کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود بہت بڑے فلاسفر تھے، اس لیے انھوں نے فلسفیانہ دین کا پورا تصور اسلامی تصوف میں داخل کیا۔ جس زمانے میں ذوالنون مصر میں پیدا ہوئے اس زمانے میں مصر Hellenistic science کا مرکز تھا، گویا وہ صرف وہاں ہونے کی بنا پر فلسفی تھے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> "One of those who bore the chief part in its developments, Dhu'l-Nun the Egyptian, is described as a philosopher and alchemist.In other word, a student of Hellenistic science"[2].
>
> اس کے فروغ میں غالب حصہ ذوالنون مصری کا ہے جو کہ ایک فلاسفر اور کیمیا دان تھے دوسرے لفظوں میں یونانی علوم کے طالب علم تھے۔

جس طرح نکلسن نے ایک مفروضہ پر اپنی دلیل پیش کی تھی کہ حضرت ذوالنون چوں کہ مصر میں پیدا ہوئے تھے اور اس وقت مصر شہر میں یونانی فلسفہ موجود تھا، لہذا اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ انھوں نے یونانی فلسفہ سیکھا ہو اور اس کی تعلیمات اسلامی تصوف میں شامل کی ہوں۔ اسی طرح انھوں نے دوسرا مفروضہ یہ قائم کیا کہ حضرت معروف کرخی نے بھی یونانی فلسفہ کی تعلیمات کو اسلامی تصوف میں داخل کیا ہو گا۔ وہ لکھتے ہیں کہ معروف کرخی کی پیدائش بصرہ اور واسط کے درمیان Babylonian belt میں ہوئی اور یہ علاقہ عیسائی آبادی کا تھا۔ آپ کے والدین بھی عیسائی تھے، اس لیے ممکن ہے کہ Gnosticism کا اسلامی تصوف سے رابطہ ہوا ہو گا۔

وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

---

[1] Nicholson, *the Mystics of Islam*,12.
[2] Ibid,13.

"Though litter direct evidence is available, the conspicuous place occupied by the theory of gnosis in early Sufi speculation suggests contact with Christian Gnosticism, and it is worth noting that the parents of Ma'ruf al .karkhi, whose definition of Sufism as ' the apprehension of divine realities , was quoted on the first page of this Introduction ,are said to have been Sabians"[1].

اگرچہ براہِ راست کوئی قوی دلیل میسر نہیں ہے مگر چونکہ نظریہ معرفت کا ذکر اوائل دور کے صوفیاء کی تعلیمات و تحقیقات میں کثرت سے ملتا ہے، جس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مسیحی تصورِ معرفت کے ساتھ بھی کوئی ربط ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت کرخی کہ جن کی صوفی ازم کی تعریف " الوہی حقائق پر غور و فکر" کا حوالہ اس کتاب میں تعارف کے صفحہ اول پر دیا گیا ہے، ان کے والدین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ صابی تھے۔ لہٰذا اس بات کا امکان موجود ہے کہ انھوں نے مسیحی تصورِ معرفت اپنے والدین سے لیا ہو۔

پروفیسر نکلسن اسلامی تصوف کی تشکیل وارتقاء کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ اسلامی تصوف کا اصل عیسائیت ہے، اس پر دلیل کے طور پر حضرت ابراہیم بن ادھم کا ایک واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ آپ شام کے صحرا میں سفر کر رہے تھے کہ ایک شخص سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے دوران ابراہیم بن ادھم نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے لیے اس شخص سے اسم اعظم کا وظیفہ مانگا۔ انہوں نے جو وظیفہ دیا وہ کرنے کے بعد ابراہیم بن ادھم کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوگئی [2] اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ تصورِ معرفت عیسائی مذہب سے اسلامی تصوف میں ان کے ذریعے داخل ہوا۔ کیونکہ اس وقت وہ علاقہ عیسائیوں کا تھا اور نکلسن کے مطابق جس شخص سے ابراہیم بن ادھم کی ملاقات ہوئی تھی وہ عیسائی راہب تھا۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امام قشیری نے جس واقعہ کو بیان کیا اس کے مطابق وہ راہب حضرت داود علیہ السلام تھے ۔ مکمل واقعہ کچھ یوں ہے: کہ ابراہیم بن ادہم کو ایک شخص ملا۔ اس سے انھوں نے اسم اعظم پوچھا اور اس نے بتادیا۔ آپ اسم اعظم کا وظیفہ کرتے ہوئے چل پڑے اور راستے میں آپ کی ملاقات حضرت خضر علیہ السلام سے ہوگئی، انھوں نے پوچھا: ابراہیم جس شخص کا وظیفہ پڑھنے سے تیری ملاقات ہوئی، پتہ ہے وہ شخص کون تھا؟ ابراہیم بن ادھم نے کہا: مجھے

[1] Ibid ,14-
[2] Nicholson, *the Mystics of Islam*,16-17

نہیں معلوم وہ کون تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: وہ سیدنا داود علیہ السلام تھے، جو آپ کی رہنمائی کے لیے آئے تھے[1]۔

خلاصہ کلام پروفیسر نکلسن اپنی اس مبسوط اور محققانہ کاوش اور ان تمام دلائل سے یہ اہم نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ صوفیانہ تعلیمات پر ایران اور شمالی مغربی ہند کا بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ اور اسی بنا پر اس نے نتیجہ نکالا ہے کہ صوفیانہ تخیلات ہندوستان کے فلسفہ یوگ اور ویدانت سے متاثر ہو گیا ہے۔ نکلسن نے ''اشراقیت'' سے اسلامی تصوف کا موازانہ کیا ہے۔ اور اس کے مطابق اسلامی تصوف کی اصل دین اسلام نہیں بلکہ ایک خارجی پیداوار ہے، تصوف مسیحیت سے تشکیل پایا ہے اور اسلامی تصوف جدید افلاطونیت کا آئینہ دار ہے۔ ان تمام نکات کی اثبات کے لیے نکلسن نے مختلف دلائل پیش کر دیا ہے۔

اسلامی تصوف کی تشکیل وارتقاء کے بارے میں گولڈ زیہر کا موقف:

اسلامی تصوف کی تشکیل وارتقاء کے حوالے سے گولڈ زیہر کچھ آراء کو بیان کرتا ہے۔ ایک فرانسیسی لوئی ماسینیوُن (Louis Massignon) عہد بمطابق(1962 ۔ 1883) نے تصوف کو داخلیتِ اسلام قرار دیا ہے، یعنی اسلام کو اپنے آپ میں داخل کر لینا؛ اس کے مطابق قرآن کی مسلسل تلاوت (تکرار)، مراقبہ اور تجربے سے تصوف پیدا ہوا (ہوئی) اور بڑھی۔ تصوف کا قرآن میں لغوی (Lexically) طور پیوست ہونے کا یہ نظریہ، باطنیتِ کلام، سے بہت مختلف بھی نہیں کہا جا سکتا؛ صوفیاء بھی اسی ظاہریت اور باطنیت کی تقسیمِ اسلام کے قائل ہیں، یعنی قرآن کے الفاظ کا مسلسل ورد اور ان میں وہ معنی باطنی تلاش کرنا کہ جو ظاہر میں نظر نہیں آتے یا پوشیدہ ہیں، صوفیاء کے نزدیک تصوف کی بنیاد ہیں[2]۔

اسلام ایک کامل دین ہونے کے ناطے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ تصوف کے آغاز کے بارے میں کچھ نظریہ دان ان پہلوؤں کو تین اقسام میں دیکھتے ہیں؛ جسمانی، عقلی اور روحانی ۔ اور یہ تیسرا پہلو یعنی روحانی پہلو ہی ہے کہ جس پر اختصاص (specialization) حاصل کرنے والوں کو صوفی کہا جانے لگا۔ اسی بات کو تصوف سے تعلق رکھنے والے علما بھی ایک حدیث کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ جس میں اسلامی تعلیمات کے ان تین پہلوؤں کا

---

[1] القشیری، **الرسالۃ القشیریۃ**: 7

[2] Voll, John (.The Oxford Encyclopedia of the Islamic: London Oxford University press,2022)34

ذکر آتا ہے اور احسان (excellence) کے بارے میں عبارت یوں ہے: احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہ دیکھ سکے تو وہ یقیناً تجھے دیکھ رہا ہے۔

تصوف کے لیے احسان اور روح کے علاوہ بھی متعدد الفاظ بطور متبادل استعمال میں دیکھے جاتے ہیں؛ مثال کے طور پر صوفیاء کے نزدیک تزکیۂ نفس، علم السلوک اور تہذیب نفس بھی تصوف کے ہی مختلف نام ہیں۔ مذکورہ بالا تمام افکار و طریقہ ہائے کار اصل میں پیغمبر اسلام Mohamed peace be upon him.svg اور صحابہ کرام کے زمانے سے ہی رائج ہیں اور ان کو اسلام ہی کی تعلیمات کہا جاتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے تیز رفتاری سے وسعت اختیار کرنے والی اسلامی حکومت میں نو مسلمین (غیر عرب) کی کثیر تعداد شامل ہوتی جارہی تھی جس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور علما ہمیشہ فکر مند بھی رہتے تھے کہ اچانک اسلام سے آشنا ہونے والے نو مسلمین کی تربیت کا مقصد کس طرح حاصل کیا جائے کہ اسلامی افکار ان علاقوں کے قبل از اسلام کے افکار شامل نا ہونے پائیں جو نئے فتح ہوئے تھے۔ 661ء میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد، امت کے افکار میں افتراق وسیع ہونے لگے۔ خلافت راشدہ کے بعد آنے والے حکمران اپنے پیشواؤں جیسی اسلامی حکومت کی مثال قائم نہ رکھ سکے اور متعدد علماء ان سے بد ظن ہونے لگے۔ یہ علماء مسلمانوں میں آنے والی دولت و آسائش طلب زندگی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور ابتدائی اسلام کی سادہ گذر بسر کی تعلیمات پر زور دیتے تھے؛ ان میں حسن البصری اور ابو ھاشم جیسے علماء شامل تھے اور علماء کی دنیاداری سے دور رہتے ہوئے زاہدانہ زندگی کا اختیار کرنا آگے چل کر تصوف کی صورت میں نمو پایا۔ ابو ھاشم کو وہ پہلا شخص کہا جاتا ہے کہ جن کو ان کے بعد آنے والوں نے صوفی کا لقب دیا۔[1]

ایک نظریہ جو بطور خاص تصوف سے شغف اور اسلام سے بغض رکھنے والے غیر مسلم بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ: تصوف اصل میں اسلامِ رائج (orthodox islam) کی پابندیوں، اپنے نفس پر قابو رکھنے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنے عقیدے کو مضبوط رکھنے کے لیے درکار مشقتِ شاقہ اور شرائطِ عُبودیت پر عمل پیرا ہونے کو دشوار سمجھنے اور اس سے نفسیاتی طور پر حبس کی کیفیت محسوس کرنے کے طور پر پیدا ہونے والا ردعمل ہے۔[2]

دین اسلام کے آغاز سے ہی اس کی مخالفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اس لیے اگر تاریخ کے صفحات پر نظر دوڑائیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے مکی دور میں ہی یہودی اور مسیحی دین اسلام پر اعتراضات کی ابتدا کر چکے تھے اور مخالفت کرنے میں وہ قریش کے بت پرستوں کے ہم نوا تھے۔ مدینہ منورہ کے دس سالہ

---

[1] ممبئی والا، **خزینۃ الاصفیاء**، 134

[2] Schimmel, Annemarie, *Sufism*, 65.

دور میں مخالفت اور زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ خصوصاً یہودیوں نے دین اسلام کی پر زور مخالفت کی اور دشمنان حق نے اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ خلافت صدیقی و فاروقی میں جب اسلام عرب کی حدود سے باہر نکلا اور عراق و شام کی سرزمین فتح ہوئی اور مسلمانوں کا ان علاقوں کے لوگوں سے میل جول ہوا تو اسی دور کے عیسائی علماء نے اسلام اور اس کی تعلیمات تصوف، قرآن مجید اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے شروع کر دیے تھے تاکہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کے متعلق تشکیک کا جذبہ پیدا کر کے قبول اسلام سے روکا جا سکے۔

اسی پس منظر میں ڈاکٹر نثار احمد لکھتے ہیں:

> ''تحریک استشراق کو خلاف اسلام سرگرمیوں کی علامت مانا جائے تو یہ امر واقعہ ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز ظہور اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا اور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھی اہل مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف بالخصوص، بغض و عناد کا اظہار مختلف ادوار میں ہوتا رہا اور وفود ضدبات سے سر شار رومی ، لاطینی، مسیحی اور یہودی روایات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں ۔ چنانچہ ساڑھے چار سو سال تک اسلامی تصوف، اسلام اور بانی اسلام کے حوالے سے ان کی مخالفت اور مخاصمت کا عام اندازہ یہی رہا۔ اس تمام عرصہ میں بلکہ اس کے بعد بھی مغربی دنیا اس قابل نہ ہو سکی کہ وہ حقائق و واقعات کا صحیح ادراک کر سکے اور مسلمانوں کی تاریخ ثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے''[1]۔

اسلامی تصوف کے آغاز وارتقاء اور اس کی تشکیل کے حوالے سے کتاب '' اسلامی عقائد اور قانون کا تاریخی ارتقاء'' میں گولڈ زیہر اور اس کے معاصرین نے مختلف انداز میں تذکرہ کیا ہے۔

اسلامی تصوف کے دو اہم بنیادیں '' ذکر و توکل'' ہے۔ اس کے اولین مرحلہ میں دو عناصر ظاہر ہوئے۔ ان میں سے ایک عنصر تعبدی ہے اور دوسرا اخلاقی۔ عبادتی عنصر نے ''ذکر'' کی اصطلاح کا عنوان پایا۔ اور اس نے اسلامی تصوف کے تمام تر ارتقاء کے دوران اپنا خاص مقام برقرار رکھا۔ اسلام عبادتِ صلاۃ کو روز و شب تک محدود رکھتا ہے۔ مگر زاہدانہ رجحان نے حکم قرآنی، خدا کو کثرت سے یاد کرنے کو دینی اعمال کا محور و مرکز بناتے ہوئے اور عبادت گزارانہ افعال کو بڑھا چڑھا کر انھیں ''ذکر'' قرار دے کر نمایاں کرتے ہوئے اس طرح کی حدود اور پابندیوں کو شکست کر ڈالا۔ ''ذکر'' کے مقابلہ میں دیگر مذہبی اعمال نہایت بے قدری کا شکار ہو کر سطحی اور ثانوی امور کی حیثیت میں سمٹ گئے۔ آج بھی اسی قسم

---

[1] نثار احمد، **مستشرقین اور مطالعہ سیرت**، (انڈیا: نقوش رسول، 1986) ص 97-496۔

کے صوفیانہ اذکار و وظائف ہی صوفیانہ اخوت کی ریڑھ کی ہڈی تشکیل دیتے ہیں۔ جو دراصل ان ہی قدیم زاہدوں کے وارث و جانشین ہیں۔

اس طرح زہد و تصوف کے اخلاقی عنصر میں واضح خد وخال میں نمودار ہوتی ہے وہ ''توکل''یعنی خدا پر بھروسہ کی ایک غلو یافتہ شکل ہے۔ جسے ان مسلمان عباد و زہاد نے غیر فعالیت و گوشہ نشینی کے آخری درجہ تک پہنچادیا۔ اس توکل سے یہ مراد تھی کہ ایک شخص اپنے ذاتی مصالح و مفادات سے کلی طور پر بے توجہی و بے اعتنائی برتے اور ان کی حفاظت و نگہداشت پر مبنی تمام اقدامات کو رد کر ڈالے۔ اور خود کو متوکلین یعنی خدا پر بھروسہ کرنے والے کہلواتے ہیں۔

غرض اسلام کے اندر اس وقت دو مقابل و مخالف رجحانات باہم دگر دست و گریبان ہوگئے۔ ان دونوں رجحانات کا اظہار ''افضل ترین خیر'' کے موضوع پر دو عابد و زاہد اشخاص '' مالک بن دینار اور محمد بن واسع'' کے درمیان واقع ہونے والے ایک مکالمے میں ہوتا ہے۔ مالک بن دینار کہتے ہیں کہ اصل مسرت اس میں ہے کہ انسان کے پاس ایک قطعہ زمین ہو اور وہ اس کے ذریعے دوسروں پر تکیہ کیے بغیر اپنی معاش حاصل کر سکے۔ لیکن اس کے مقابل میں محمد بن واسع کا یہ کہنا تھا کہ فی الحقیقت وہ انسان خرسند ہونے کے قابل ہے۔ جو اس حال میں ناشتہ کرتا ہے کہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شام میں کیا کھائے گا۔ اور شام کو کھانا کھاتا ہے تو اسے پتہ نہیں ہوتا کہ صبح کیا کھائے گا۔ ترک و زہد پر مبنی یہ واضح ترقی یافتہ خیالات اسلام کی غریبانہ ابتداء سے مکمل آگاہی کے ساتھ، دراصل روز افزوں دنیاداری کے خلاف ایک دیندارانہ عمل کی صریح علامت ہیں۔ یہ رہبانی رویہ عیسائی خانقاہیت کے براہ راست مشاہدہ کے ذریعہ پھلا پھولا۔ حتی کہ اس کے اہداف اس کے مقاصد سے حرف بہ حرف مشابہ ہیں۔

گولڈ زیہر کتاب متی اور لوقا کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ متی اور لوقا میں مذکور طیور سماوی کا یہ ذکر کہ وہ نہ بیج بوتے، نہ فصل کاٹتے، نہ ہی دونوں کو بالیوں میں محفوظ رکھتے ہیں مگر یہ کہ آسمانی باپ کے ذریعہ اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ تو عہد نامہ جدید کے یہ خیالات، جو زہد و ترک سے متعلق اقوال میں بکثرت استعمال ہوئے۔ ان متوکلانہ نظریات کے عین قلب میں قریبا اسی قدیم لفظی پیرایہ میں پائے جاتے ہیں[1]۔

عیسائی گوشہ نشینی یا صوفیوں کے مخصوص لبادے کی تقلید کرتے ہوئے ان مسلمانوں نے خود کو ''صوف'' یعنی موٹے اون سے ملبوس کیا جنھوں نے دنیا و مافیہا کو ترک کر کے توبہ و انابت اور زہد و عبادت کا رخ کیا تھا۔ اس رواج کے نقوش و آثار کم از کم خلیفہ عبد الملک کے عہد تک پیچھے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ صوف کے اس رواج نے اسم ''صوفی'' کو

[1] GoldZiher , *Introduction of Islamic Theology and Law*, 204.

ترقی دی، جسے زاہدانہ رجحان کے نمائندوں نے تب مکمل طور پر اپنالیا جب ان کا عملی زہد ایک اعلیٰ تر مرحلہ تک ترقی دی کر گیااور ایک خاص فلسفہ کے ساتھ شیر وشکر ہو گیا تھا۔ جس کا ایک مخصوص و متعین اثر ان کے تصور مذہب پر آئندہ مرتب ہوناتھا۔ یہ ''تصوف'' کا آغاز تھا[1]۔

گولڈ زیہر نے اپنی کتاب '' مسلم سٹڈیز '' جلد دوم میں حدیث کے حوالے سے ایک پوراحصہ وقف کیاہواہے۔

گولڈ زیہر کا کہناہے کہ عمومی طور پر ابتدائی دو صدیوں میں اسلام کے مذہبی، تاریخی اور سماجی ارتقاء کی وجہ سے زیادہ تر حدیثیں گھڑی گئیں۔اس کے مطابق اس کی رائے ڈوزی کی رائے کے بالکل خلاف ہے جسے نزدیک احادیث کے ایک بہت بڑے حصے پر اعتماد کیا جاسکتاہے۔ورنہ ابتداء میں بہت کم احادیث تھیں،اور ان کی حیثیت بھی بس یاداشت کی سی تھی،نہ کہ کسی شرعی احکام کے مصدر کی۔

گولڈ زیہر کے الفاظ یہ ہیں:

> "We are unlikely to have even as much confidence as Dozy regarding a large part of the hadith , but will probably consider by far the greater part of it as the result of the religious , historically and socially development of Islam during the first two centuries"[2]-
>
> ہمیں احادیث کے ایک بڑے حصے کے بارے میں ڈوزی جیسا اعتماد ہونے کا امکان نہیں ہے، لیکن غالباً اس کے بڑے حصے کو پہلی دو صدیوں میں اسلام کی مذہبی،تاریخی اور سماجی ترقی کا نتیجہ سمجھیں گے۔

اسلامی تصوف کی تشکیل وارتقاءاے جے آربری کی نظر میں:

صلیبی جنگوں کے خاتمے کے بعد سولہویں صدی عیسوی میں یورپ کے تعلقات عرب مملک کے بجائے ایران سے بحال ہونے لگے۔ رابطوں کی بحالی کے بعد جب اہل یورپ ایران آنے جانے لگے تو لا محالہ انھوں نے فارسی سیکھنا شروع کر دی۔ فارسی زبان سیکھنے کے بعد ان کی رسائی ایرانی کتب، شخصیات اور شعراء تک ہوئی۔ وہ ایرانی ثقافت سے شناسا ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ایرانی صوفیاء سے بھی آشنائی ہوئی۔ ان مستشرقین کی معلومات کا ذریعہ صرف فارسی کتابیں،ایرانی اہل فکر ودانش،ادبی و علمی شخصیات، فلسفہ اور صوفیائے کرام تھے۔ حصول علم کا کوئی بھی غیر ایرانی ذریعہ ان کے پاس نہ تھا۔

---

[1] Ibid,204.
[2]Goldziher, *Muslim Studies* ,19.

بعض عرب شعراء اور فلاسفہ کے علاوہ ان کا ارتکاز توجہ ایرانی فلسفہ اور ایرانی شاعری ہی رہی۔ علم ذرائع تک رسائی نہ ہونے کے وجہ سے انھیں تصوف کا سرچشمہ بھی ایرانی فلسفہ میں ہی نظر آیا۔ اس مستشرقین نے تصوف کی تاریخ، ارتقاء اور اس کے نظریات و تعلیمات بھی ایرانی صوفیاء، علماء، کتب، کلچر، خانقاہوں اور ان خانقاہوں کو آباد کرنے والوں کے معمولات سے اخذ کیے۔ چنانچہ ان معاملات کو ایرانی نقطہ نظر دیکھ کر حاصل ہونے والی معلومات کو یکجا کر کے اپنی کتاب میں بیان کر دیا۔ ان کتب سے جو بھی معلومات کم یا زیادہ دستیاب ہوئیں مد مقابل درست معلومات نہ کرنے کی وجہ سے انھیں قبول عام مل گیا۔ ان معلومات کے قبول کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ قت ریسرچ اور تحقیق کا نہیں تھا۔ اگر تحقیق تھی بھی تو اسے زیور طباعت سے آراستہ کرنے کے لیے درکار وسائل کم تھے۔ لہذا لوگ کم علم اور سہل پسند ہونے کی بناء پر انہیں معلومات پر اکتفا کرتے تھے۔ یورپی مفکرین نے ایران کے سفر کے بعد سفر نامے مرتب کیے اور کتابیں لکھیں جو چھپ بھی گئیں لیکن مسلمانوں کے پاس صحیح معلومات جاننے کے لیے کوئی دوسرا ماخذ موجود نہیں تھا۔ جس سے شواہد ملتے اور حقائق کی تصدیق کی جاسکتی۔[1]

پروفیسر آربری نے 1942 میں اسلامی تصوف پر اپنے لیکچر کا اشارہ کر دیا تھا کہ اس وقت اسلامی تصوف کے مصادر اولیہ دستیاب نہیں ہیں جس کی وجہ سے تصوف پر صحیح رائے قائم کرنا ممکن نہیں تھی۔ جن معلومات پر مبنی تصوف کی اصل تاریخ کو مکہ اور مدینہ سے شروع ہوئی اور قرون اولی میں بھی جاری وساری رہی۔ وہ جملہ معلومات عربی میں مخطوطات کی صورت میں افریقہ اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ تحقیقی وسائل میسر نہ ہونے کی وجہ سے ان مخطوطات کو جمع نہ کیا جاسکا اور نہ کوئی ایسا تھا جو ان پر خرچ کر کے انھیں مرتب اور مدون کر کے شائع کر سکتا۔ لہذا عربی مصادر میسر نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بھی تصوف کا مکی اور مدنی رخ نہ دیکھ سکا۔ یہ فطری امر تھا کہ اگر وسائل اور مصادر وماخذ میسر ہوئے تو حقیقی اسلامی تصوف پر انہیں کی بنیاد پر رائے قائم ہونا تھی لہذا جب مصادر مواد اور معلومات حقیقی اور اصلی نہیں تھیں تو اصلی، حقیقی اور مستند رائے کیسے قائم ہو سکتی تھی۔

ان غیر مستند مصادر پر مبنی رائے نے برصغیر پاک وہند کے اسکالرز اہل علم ودانش اور محققین کو متاثر بھی کیا اور ان کی رائے نے برصغیر پاک وہند کے اسکالرز اہل علم ودانش اور محققین کو متاثر بھی کیا اور ان کی رائے بھی بدلی۔ تاہم آج تحقیق کا رخ یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔ اے جے آربری کی کہی ہوئی بات کے تقریباً اسی سال بعد بے شمار عربی مصادر اصلیہ کی موجودگی میں تاریخ تصوف کی صحیح تعبیر و تشریح کرنا ممکن ہو گیا ہے۔

---

[1] قادری، محمد طاہر، **تصوف اور مستشرقین**، 29

اے جے آر بری یورپ میں تصوف کو متعارف کرانے والوں میں سے سکالر ایف۔اے جی تھولک کا موازنہ کرتے ہیں جس نے 1819 میں فریدالدین عطار کے ہند نامے کا ترجمہ کیا۔ تھولک نے اطالوی زبان میں Sufsmus Sive Theology persica pantheistica کتاب لکھی جو یورپ میں تاریخ تصوف پر سب سے بڑی کتاب تصور کی جاتی ہے۔ جس نے مستشرقین کا تصوف کے بارے میں نظریہ قائم کرنے میں بنیادی کردارادا کیا۔اے جے آر بری کہتے ہیں کہ تھولک نے اس کتاب کا سارامواد ایران سے لیاان کی اس کتاب کا سارامواد حضرت بلال الدین رومی کی مثنوی محمود شبستری کی'' گلشن راز'' مولاناعبدالرحمٰن کی'' تحفتہ الا حرار'' ''بہارستان''،حبینی اوراسدالدین کی ایک ایک کتاب سے اکٹھا کیا گیاہے[1]۔

تھولک(F.A.G.Tholuck[2]) کی اس مشہور کتاب کے یہ کل مصادر و مراجع ہیں۔ان مصادر و مراجع میں مثنوی مولانا روم کے علاوہ ایک بھی کتاب ایسی نہیں جس کا تعلق تصوف اور تاریخ تصوف کی تالیفات و تعینات سے ہو۔ مثنوی بھی عین تعلیمات تصوف کے بارے میں نہیں بلکہ اس میں شاعری کا انداز میں کچھ نصائح اور حکمتیں ہیں۔ان تمام کتابوں میں سے کسی ایک کا نام بھی تصوف کی علمی تاریخ کے ضمن میں نہیں آتا۔ان میں سے کچھ اسکالرز ہیں اور کئی عام تاریخ کے مصنفین جبکہ کچھ شعراءاور کچھ فلسفی ہیں۔

اے جے آر بری کہتے ہیں کہ یورپی مصنفین کی ساری تحقیق قیاس اور مفرضوں پر مبنی ہے۔ان کے نظریات بھی مان، تخیل، ظن اور اندازوں پر مبنی ہیں۔یورپی مصنفین کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اسلامی تصوف پر لکھنے والا نہیں تھا۔ بلکہ وہ تقابلی تصوف پر لکھنے والے تھے۔ ان کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ ہندومت، ویدانت، بدھ مت، عیسائیت اور ایرانی ویونانی فلسفوں میں تصوف کی کیا حیثیت ہے اور ان تمام مذاہب،ادیان اور فلسفوں کے تصوف میں کیا مشترکات و مماثلات ہیں۔آر بری کہتے ہیں کہ مستشرقین چار سو سال تک تصوف کے تقابلی جائزے پر کام کرتے رہےاور اس کے لیے صرف ایرانی ذرائع اور لٹریچر پر انحصار کرتے رہے[3]۔

اے جے آر بری کے مطابق کہ اسلامی تصوف کے مآخذ میں سے ایک مآخذ ایرانی شعراء ہے۔اس حوالے سے ولیم جونز کے بارے میں میں لکھتے ہیں۔ کہ تصوف کو یورپ میں متعارف کرانے والوں میں سے ایک سر ولیم جونز ہے۔ جنھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں یونانی، لاطینی، فارسی، عربی اور دیگر زبانیں سیکھ لیں تھیں۔اسے آٹھ زبانوں پر مکمل عبور حاصل

---

[1] Arberry ,*An introduction to the History of Sufism* ,22.

[2] تھولک(1799-1877)ایک جرمن پروٹسٹنٹ ماہر الہیات، پادری، مورخ،اور چرچ کے رہنما تھے۔

[3] Ibid,43.

تھا۔اس کی اصل دلچسپی زبانیں سیکھنا، ویدوں کے مطالعے اور دورِ آخر کے صوفیاء نی فلسفہ اور فلسفہ ویدانت کے درمیان مشترکات میں تھی۔اس لیے اس نے بنگال، ہندوستان اور ایران کا سفر کیا۔ گویا ان تین ذرائع سے تصوف پہلی بار یورپ میں متعارف ہوا۔اور پھر اس تصوف کو اسلام میں داخل کیا گیا۔ جیسا کہ اے جے آربری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"Thus Sir Jones speculated, basing his theories on an acquaintance with the mysticism of the Persian poets only" [1].

اس طرح سر ولیم جونز کے تصوف کے بارے میں جو جو تھیوری ہے وہ صرف ایرانی شعراء پر مبنی ہے۔

اس سے اے جے آربری یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی تصوف کو ایرانی شعراء سے لیا گیا ہے۔آگے چل کر آے جے آربری ایک مستشرق ماؤنٹ اسٹورٹ ایلفن اسٹون کے نظریہ تصوف کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے مطابق اسلامی تصوف کی بنیاد درویش ہے۔ کہ ایلفن سٹون کابل میں کسی صوفیاء گروہ سے ملا ان سے جو کچھ سنا اور سمجھا اس کو مختلف طریقوں سے محفوظ کیا اور مجموعی طور پر ایک کتاب بنائی، جو یورپ میں چھپ کر منظر عام پر آئی اس سے اسکی مزید اہمیت بڑھی اور لوگوں نے اسی کتاب کو پڑھ کر اس کو اسلامی تصوف سے جوڑنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ اس حوالے سے آربری اپنی کتاب میں ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"All that is known of it was communicated by a certain dervise, who travelled into European countries and who gave this account of his initiation in the mystery"[2].

جو کچھ آج تک معلوم ہے یہ سب ان بعض درویشوں کے ذریعے بیان ہوا ہے۔جنھوں نے یورپی ملکوں کا سفر کیا اور انھوں نے اپنی سرگزشت میں اس بھید کا خلاصہ بیان کیا۔

ایلفن سٹون کا پہلا ذریعہ علم ایک ایسا صوفی بزرگ تھا، جو یورپ کی سیر و سیاحت کے لیے آیا تھا۔ایلفن سٹون نے اس سے سن کر تصوف کے بارے میں نظریہ قائم کیا۔اس کے مرتب کردہ اس نظریے کو بعد میں آنے والے ہر شخص نے اپنی کتاب میں بیان کر لیا اور یہاں تک کہ اسلام میں بھی ان کے نظریات کو جگہ ملی اور لوگ سمجھنے لگا کہ تصوف کی بنیاد درویش حضرات ہیں۔

اے جے آربری لکھتے ہیں کہ یورپ میں تصوف اور تعلیماتِ تصوف پر کام کرنے والوں میں سے ایک بڑا نام اور نامور شخصیت سر جان میلکم ہے۔اس نے History of Persia نامی کتاب تصوف پر لکھی۔ جس کو بعد میں آنے

[1]Ibid ,10.
[2]*Arberry, An introduction to the History of Sufism* ,11.

والے مستشرقین نے مرجع و مآخذ جان کر پڑھا اور اس کتاب نے بعد میں آنے والے مستشرقین کو نظریات قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا[1]۔

سر جان میلکم کے اس کتاب کے حوالے اے جے آربری لکھتے ہیں: کہ اس کتاب کے چار ذرائع ہیں ان چار ذرائع کی بدولت سر جان میلکم کی یہ کتاب بنی۔ان ذرائع میں سے پہلا ذریعہ سر ولیم گراہم کا وہ لیکچر ہے جو انھوں نے 30 دسمبر 1811 میں بمبئی لیٹر رسوسائٹی میں Bombay Native Infantry کی 6th Regiment کی Ist Battalion کو دیا تھا اور دوسرا ذریعہ وہ چار کتابیں تھیں، جن میں سے پہلی کتاب ایران کے شہر کرمانشاۃ سے تعلق رکھنے والے سکالر آغا محمد علی مجتہد کا وہ خط ہے، جو انھوں نے میلکم کے خط کے جواب میں لکھا تھا اور تیسرا ذریعہ شاہانِ سلطنت کے حالات و معاملات اور اس وقت ایران میں موجود صوفیاء کی تعلیمات اس کتاب کا تیسرا ذریعہ تھا۔

History of Persia کا آخری مآخذ شیعہ عالم دین نور اللہ شوستری کی کتاب "مجالس المومنین" تھی[2]۔

یہ کل چار ذرائع تھے جن سے جان میلکم نے اپنی کتاب کا مواد اکٹھا کیا اور تصوف اور اس کی تعلیمات کی کتاب کے طور پر یورپ میں مشہور ہوئی۔یہی کتاب بعد میں یورپ میں تصوف کو متعارف کرانے کا سبب بنی۔اور بعد میں لوگوں نے اسی کو اسلامی تصوف کا درجہ دیا۔اس سے اس بات کا بخوبی اندازا لگایا جا سکتا ہے کہ یورپ میں تصوف کے متعلق بننے والے نظریے کی حقیقت، ساکھ اور قدر کیا اور کتنی ہو گی۔ایسی کتاب جو تصوف کا مصدر کا درجہ رکھتی ہے۔

اے جے آربری اسلامی تصوف کے حوالے سے لکھے ہوئے بیان کرتا ہے کہ اسلامی تصوف کا ایک مآخذ وسط ایشیاء ہے۔یعنی وہ کہتا ہے کہ مسلم صوفیاء نے اپنی تعلیمات روس، یونان اور انڈیا سے حاصل کیا ہے۔اس کو ثابت کرنے کے لیے مختلف سکالرز کے نظریات کو بیان کرتا ہے۔ان سکالرز میں سے ایک مشہور سکالر رچرڈ ہارٹ مین ہے۔اس حوالے سے رچرڈ ہارٹ مین کے تین نظریے کو بیان کرتا ہے۔

رچرڈ ہارٹ مین تصوف کے مآخذ کے حوالے سے تین نظریات پیش کیے ہیں:

پہلا نظریہ: رچرڈ ہارٹ مین کہتے ہیں کہ ترکستان یعنی وسط ایشیا مشرق و مغرب کی تہذیبوں کے اتصال اور ملاپ کا مقام ہے روس اور انڈیا کی سرحدیں وہاں ملتی ہیں۔ سرحدیں ملنے کی وجہ سے رچرڈ نے یہ نظریات قائم کئے کہ وسط ایشیاء میں تینوں تہذیبیں ملتی ہیں، لہٰذا یہاں نظریات اور فلسفے بھی منتقل ہوتے ہوں گے۔ چونکہ خراسان اور ایران کے دیگر علاقوں میں مسلم صوفیاء کی کثرت تھی، اس لیے نے تصوف کی تعلیمات روس، یونان اور انڈیا سے لی ہوں گی۔

---

[1] Ibid,17.

[2] Arberry, *An introduction to the History of Sufism* , 11

دوسرا نظریہ: رچرڈ نے تصور رضا کے حوالے سے ایک نظریہ قائم کیا ہے کہ صوفیاءاللہ تعالی کی خوشنودی اور رضا پر راضی رہنے پر بہت زور دیتے ہیں، جب کہ ہندوؤں میں یہ تصور بہت زیادہ ملتا ہے، لہٰذا اندازا ہوتا ہے کہ صوفیاء نے یہ تصور وہیں سے لیا ہوگا۔اس سے رچرڈ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اسلامی تصوف کی بنیاد ہندو تعلیمات ہیں۔

تیسرا نظریہ: رچرڈ ہارٹ مین کہتا ہے کہ ایران اور ہندوستان کی تعلیمات کے اثرات اسلامی تصوف میں بایزید بسطامی کے ذریعے داخل ہوئے ہیں[1]۔

ان تین نظریات سے ہارٹ مین نے یہ نتیجہ لیا کہ اسلامی تصوف کی بنیاد خارجی ہے۔اسلام میں اس کو مختلف ذرائع سے داخل کیا گیا ہے۔رچرڈ ہارٹ مین اسلامی تصوف کے اجزائے ترکیبی کی تشکیل کو بھی اندازا بیان کیا ہے کہ کس نے کیا شامل کیا۔ اے جے آربری اس کو یوں بیان کرتا ہے۔

> "Hartman replies that more than any other man the credit belongs to abu l Qasim al Junaid and he therefore pleads that all the existing fragments of this great mystic should be collected and thoroughly analyzed, for they might well provide the concrete evidence to clinch these results of speculative reasoning"[2].

> ہارٹ مین جواب دیتا ہے کہ اس کا سہرا کسی بھی شخص سے زیادہ ابو القاسم جنید کو جاتا ہے۔بنا بریں وہ اس کی تائید میں کہتا ہے۔اس عظیم صوفی کے دستیاب تمام متفرقات کو جمع کرنا اور ان کا مکمل جائزہ لینا چاہیے۔ ممکن ہے ان مفروضات کو پرکھنے کے لیے بہتر اور ٹھوس شہادت مہیا ہو جائے۔

رچرڈ ہارٹ مین کے مطابق تمام مذاہب کی ان تعلیمات کو اکٹھا کر کے اسلامی تصوف میں شامل اور رائج کرنے والے ابوالقاسم جنید ہیں کیونکہ امام جنید کی تمام کتب کا مطالعہ کیا جائے اور موازنہ کیا جائے تو شاید ان کی تحریروں میں اس مفروضے کی تائید مل جائے جو اس نے تصوف کے بارے میں قائم کیا ہے۔

مستشرقین دراصل قرآن مجید اور حدیثِ رسول سے بالکل نابلد ہیں۔اسلام کے اصل مصادر سے انھیں کوئی شغف نہیں تھا مگر وہ تصوف کا نظریہ قائم کر رہے ہیں۔قرآن مجید میں رضائے الٰہی پر بڑے واضح دلائل موجود ہیں مگر ان مستشرقی کا دھیان قرآن مجید سے ہٹ کر ہندوؤں کی تعلیمات کی طرف جاتا ہے، حالاں کہ وہ اسلام کے نظریہ تصوف پر کام کر رہے۔ مستشرقین کی تین چار سو سالہ تاریخ، جس میں اس طرح کے نظریات قائم کیے مگر انھوں نے قرآن و حدیث کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔اگر قرآن مجید و احادیث پر مطالعہ شروع بھی کیا تو وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد کے مستشرقین نے شروع کیا۔ مگر جس عرصے میں یہ نظریہ پروان چڑھا، اس عرصے میں قرآن و حدیث کا مطالعہ بالکل نہیں

---

[1] Ibid,36.

[2] Arberry,*An Introduction to the History of Sufism*, 37.

ہوا۔وہ ہندو اور بدھ مت کی تعلیمات کو تو پڑھتے اور جانتے تھے ، مگر قرآن کا علم نہیں رکھتے تھے۔اس لیے انھوں نے مفروضات سے کام لیتے ہوئے یہ بھی تصور نہیں کیا کہ مسلم صوفیاء کا تعلق قرآن و حدیث کے ساتھ ہو گا، ہندو مت، بدھ مت، عیسائیت وغیرہ کی تعلیمات کے ساتھ نہیں۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ صلیبی جنگوں کے عرصے میں یورپ اور اسلامی دنیا میں رابطہ منقطع رہا اور جب بحال ہو تو ایران کے ساتھ ہوا۔اس لیے مغربی محققین نے مشرق پر مبنی اپنی تحقیق کے لیے ایران کو اصل بنیاد اور تحقیق کی اساس بنایا۔اب ایران سے ہو کر انھوں نے ترکی، یونان اور شام سے ہوتے ہوئے ہندوستان اور چین کے راستے مشرق بعید میں جاپان تک اپنی تحقیق کا دائرہ بڑھایا، مگر ان کی تحقیق کا مرکز ایران ہی رہا۔اس لیے مستشرقین کی تحقیق میں ایران کو بنیادی حیثیت حاصل رہی۔اس لیے انھوں نے تصوف کی تعلیمات پر بات کی ہے تو بھی ایرانی تناظر سے ہی کیا۔اور دوسری طرف ان کے مطالعے کا دائرہ صرف اسلام نہیں تھا۔بلکہ ہندوستان میں ہندوازم، چین میں بدھ ازم اور یونان میں عیسائیت سب کا مطالعہ کر رہے تھے۔اس لیے وہ ان تمام ادیان و مذاہب میں مشترکات کو تلاش کر رہے تھے۔ان تناظر میں کی جانے والی تحقیق کا اطلاق انھوں نے پورے اسلامی تصوف پر کر دیا اور ان سب کو اسلامی تصوف کا مآخذ و مصادر قرار دیا۔

مستشرقین نے ان تمام سے مشترکات کو لیا اور کہ دیا کہ اگر تصوف میں زہد کا تصور ہے تو یہ عیسائیت کی رہبانیت سے ماخوذ ہے۔یا کچھ دیگر تعلیماتِ اسلام یا تصوف ہندو، بدھ مت یا یہودی مذہب سے لی گئی ہیں۔اس طرح مستشرقین نے عام فہم قارئین کا عقیدہ خراب کرنے کے لیے ان مشترکات و مماثلات کا سہارا لے کر اسلام کا دیگر مذاہب سے تاریخی رابطہ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔تو اس کا نتیجہ مختلف مذاہب کی تعلیمات کے اختلاط کی صورت میں نکلے گا، کونکہ انھوں نے اپنی تاریخی دلچسپی اور مشترکات کی بنیاد پر فلسفے، دین، تصوف ان سب کو ایک ہی مصدر سے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان تمام ابحاث سے یہ نتیجہ ملتا ہے کہ مستشرقین نے قرآن و حدیث کو تعلیمات کے لیے مصدر بنا کر ان کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ ان کا حوالہ پیش کیا۔جب اصل مصادر قرآن و حدیث کا مطالعہ ہی نہیں کیا تو کیسے معلوم ہو گا کہ ان تعلیمات کا اصل کیا ہے، خصوصاً تصوف کے بارے میں کیا معلوم ہو گا کہ تصوف کا اصل کیا ہے ، اس کا اصل بنیاد کیا ہیں۔کیونکہ مستشرقین نے تو تصوف کو ایران، یونان اور ہند کے تناظر میں دیکھا۔ان کا عرب سے کوئی تعارف نہیں ہوا اور نہ انھیں قرآن و حدیث اور عربی مصادر کے مطالعہ کا موقع ملا۔لہٰذا ایسی صورت میں ان کا اصل مصادرِ تصوف تک پہنچنا محال ہے۔

فصل سوم: تاریخ تصوف کے تعین کے بارے میں مستشرقین کا موقف:

تصوف اور تاریخ تصوف کے حوالے سے اس فصل میں پروفیسر اے جے آربری کو اس لیے انتخاب کیا گیا کہ اس موضوع پر اے جے آربری کی تحقیقات پروفیسر نکلسن کے بعد مستشرقین کے آخری دور کی سب سے بڑی تحقیق ہے۔اور اس موضوع پر مستشرقین میں یہ شخصیات اتھارٹی اور نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

اے جے آربری تاریخ تصوف کے حوالے سے اس بات کے قائل ہے کہ تاریخ تصوف پر جو کچھ کہوں وہ قابل اعتبار اور قابل بھروسہ نہیں ہوگا۔کیونکہ بدقسمتی سے تاریخِ تصوف کے بنیادی اور ثانوی مصادر جن کے بغیر تاریخ تصوف کا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا، ابھی تک وہ غیر مطبوعہ ہیں اور یہ مخطوطات ٹکڑوں کی صورت میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کی کتب خانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔جب تک وہ مخطوطات طبع نہ ہو جائیں، تب تک تاریخِ تصوف پر کوئی تسلی بخش بات نہیں کی جاسکتی۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> "But it cannot be pretended that anything really satisfactory has materialized. The reason for this is not far to seak. I am going to lay it down now, as a fundamental principle , that no even partially complete account of the origins and development of sufi doctrine and practice can be written in our present stage of knowledge"[1].

> یہ دکھاوا ممکن نہیں کہ واقعی کوئی تسلی بخش چیز ابھی تک حقیقت کا روپ نہ دھارے۔اس کی وجہ جاننا کچھ مشکل نہیں ہے۔میں بتاتا ہوں، یہ ایک اصول ہے کہ ہماری موجود علمی سطح پر صوفی نظریہ و عمل کے جزوی مصادر اور ارتقاء کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔

علامہ اقبال کی وفات سے چند سال بعد کلکتہ میں لیکچر دیتے ہوئے آربری کہتے ہیں:

> کہ تاریخِ تصوف کی صحیح تعبیر و تشریح کے لیے اس وقت تک کوئی قطعی اور اطمینان بخش شہادت اور دلائل موجود نہیں کہ اس کی حقیقت کا جزوی طور پر بھی ادراک کیا جاسکے کہ تصوف کی اصل کیا ہے، اس کا آغاز وارتقاء کب اور کیسے ہوا، تصوف کی تعلیمات کیسے وجود میں آئیں؟ وہ کہتے ہیں کہ تاریخِ تصوف پر آج کے دن تک موجود علم کی بناء پر ہم کوئی جزوی نتیجہ بھی قائم نہیں کر سکتے۔

اے جے آربری نے 1942ء میں سر عبداللہ سہروردی ہال کولکتہ میں تاریخ تصوف پر لیکچرز دیتے ہوئے اپنے آخری لیکچر میں دو اہم باتیں کیں۔ایک یہ کہ تاریخِ تصوف کے موضوع پر رائے قائم کرنے کے لیے کسی ایک کتاب پر انحصار نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی ضرورت ہے۔دوسری بات بہت اہم کی کہ اس موضوع پر جتنا

---

[1] Arbery, *An introduction to the history of Sufism*, 4.

لٹریچر اس وقت لکھا گیا ہے، وہ سارا تصوف کا صرف ایرانی نقطۂ نظر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مستشرقین کی لکھی گئی تاریخِ تصوف پر کتب کے سارے ذرائع فارسی کتب اور وہاں کی ثقافت تھی۔ اسلام تو بنیادی طور پر عربی الاصل تھا اور اسلامی تصوف کی تاریخ معلوم کرنے کے لیے اس کے عربی نقطہ نظر کا جاننا انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ عربی کتب ابھی تک یورپ اور افریقہ کے کتب خانوں میں متفرق اور غیر مطبوعہ پڑی ہوئی ہیں۔ لہٰذا جو لٹریچر بشمول پروفیسر نکلسن کے، تین سو سال سے زائد عرصے میں آج تک تصوف کی تاریخ کے بارے میں شائع ہوا ہے، وہ قابل اعتماد نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے اندر تضادات ہیں اور وہ ٹھوس شواہد پر مبنی نہیں بلکہ مفروضات اور ممکنات پر قائم ہے۔ کوئی بیّن اور ناقابل تردید ثبوت نہیں۔ تاریخِ تصوف کی اس تعبیر کے حق میں جو ایران سے وجود میں آئی اور عجمی وغیرہ اسلامی اثرات سے جنم لیا ایسے شواہد نہیں ہیں، جنھیں ٹھوس شہادت کہا جاسکے۔ ان کی حیثیت مفروضات سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ یہ بذات خود ایک دوسرے کی تائید نہیں کرتے بلکہ ان میں تضادات ہیں لہٰذا محققین کے لیے صوفی ازم کی مکمل تاریخ کی صورت میں ایک انسائیکلوپیڈیا کی ضرورت ہے۔

اے جے آربری نے 1942 کے ایک لیکچر میں مزید کہا کہ میری دانست میں تصوف کی تاریخ کا صحیح تعین اور اس کی صحیح تشریح و تعبیر آج سے تقریباً 80 سال بعد ممکن ہوگی۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

> "If the world has to wait for another eight years before the whole story of Sufism can be finally and completely told perhaps it is not too much to hope that the generation which will produce it will be a generation of men and women released from the feat of war and want, a generation that has returned to the true understanding of spiritual values and to the application of mystical truths to everyday life" [1].
>
> اگر دنیا کو مزید اسی سال انتظار کرنا پڑے کہ صوفی ازم کی حتمی اور مکمل تاریخ بیان کی جاسکے تو یہ امید رکھنا بعید از قیاس نہ ہوگا۔ کہ جو نسل اسے ترتیب دے گی وہ ایسے مرد و زن پر مشتمل ہوگی جو ہر طرح کے خوف سے طمع سے آزاد ہوں گے۔ وہ ایسی نسل ہوگی جو روحانی اقدار کا صحیح فہم و ادراک کرتے ہوئے اپنی روز مرہ زندگی کو تصوف کے حقیقی سانچے میں ڈھال لے گی۔

ایک دوسرے کے بارے میں جنگ کی وجہ سے خوف اور تعصبات سے پاک نسلیں ہی اسلامی تصوف کی صحیح تاریخ کا تعین کر سکیں گی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ 2012 تک کم و بیش وہ تمام لٹریچر جو آج تک ناپید ہے، چھپ جائے گا اور ہم اس پوزیشن میں ہوں گے کہ اس لٹریچر کی بنیاد اسلامی تصوف کی صحیح تاریخ کو جان سکیں۔ اے جے آربری جو مستشرق محققین کے آخری روحِ رواں ہیں، اس نے آخر میں اس بات کا اعتراف بھی کر لیا کہ یورپ کی تحقیق مفروضوں پر

---

[1] Arbery, *An introduction to the history of Sufism*,78-79.

مبنی ہے۔انھوں نے تصوف کی جو بھی تعبیر اور تشریح کی اسے ایران اور غیر اسلامی مآخذ کی طرف منسوب کیا۔اس تعبیر میں تضادات ہیں اور شواہد موجود نہیں ہیں[1]۔

بیسویں صدی کے نصف اول تک جتنے بھی مسلمان مفکرین، محققین، علما، زعما، اہل فکر اور اسکالرز گزرے ان کے پاس تاریخ تصوف پر موجود لٹریچر صرف اور صرف وہی تھا جو مستشرقین اور غیر مسلم مفکرین نے تحریر کیا۔اسلامی تصوف کی مستند تاریخ اور اس کی صحیح تشریح و تعبیر پر کوئی مستند کتاب موجود ہی نہیں تھی۔جہاں تک تاریخ تصوف کا تعلق ہے تو آج بھی اس طرح کی کتاب کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

پچھلی چار صدیوں میں تصوف، اس کی تاریخ، نشو و نما اور ارتقا پر موجود تمام لٹریچر مغرب مصنفین کا تحریر کردہ تھا۔ دوسری زبانوں میں لکھا جانے والا لٹریچر بھی انگریزی میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے برصغیر میں برطانوی راج قائم تھا۔برطانوی قانون رائج ہونے کی وجہ سے مستشرقین کا آنا جانا رہتا تھا۔ان کی کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ علی گڑھ، کلکتہ اور دیگر مدارس میں ان کے لیکچرز ہوتے تھے۔

پروفیسر نکلسن ہو یا اے جے آربری ان جیسے بہت سے مستشرقین مفکرین تھے جنھوں نے تصوف پر لکھا اور وہ اس موضوع پر اتھارٹی سمجھنے لگے کیونکہ پچھلے چار سو سال میں انہیں میں انہیں کی کتب معلومات کا ذریعہ تھیں۔ان کے علاوہ ان کے پاس معلومات کا ذریعہ نہیں تھا یوں مستشرقین کا چار سو سالہ لٹریچر اس غلط فہمی کا سبب بنا او مغربی چینل سے اسلام کا مطالعہ کرنے والے اہل علم و فکر نے تصوف کے بارے میں یہ گمان کر لیا کہ تصوف عجمی پیداوار ہے اور اس نے غیر اسلامی تصورات سے جنم لیا ہے۔تاہم اب یہ فکر پرانی ہو چکی ہے کیونکہ امہات الکتاب کے منظر عام پر آنے کی وجہ سے حقیت اور نا قابل تردید شواہد پر مبنی صحیح نظریہ سامنے آچکا ہے۔

حقیقت کے واضح ہو کر سامنے آجانے سے اب پرانے نظریے پر اصرار کرنا خود رجعت پسندی اور قدامت پسندی کی دلیل ہے جو کہ حمیت اور حقیقت پسندی کے خلاف ہے۔ جس کے ہاں بھی اس طرح کی رائے قائم ہوئی آج حقائق نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔اس رائے کے غلط ہونے کی نشاندہی پروفیسر نکلسن اور اے جے آربری نے خود ہی کر دی ہے۔ مستشرقین کی کیا ذمہ داری ہے اور انھیں کیا کردار ادا کرنا چاہیے اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] قادری، محمد طاہر، **تصوف اور مستشرقین**، ص:48

"For we orientalist in this generation are still in many respects in the position of the classical scholars of the Renaissance. It devolves upon us for our time to make the greatest provision for the requirement of our successors[1]."

ہمارے دور کے مستشرقین کی پوزیشن کس طرح سے تحریک احیائے علوم کے اسکالرز کی سی ہے۔اپنے عصری تقاضوں کے پیش نظر ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے بعد میں آنے والے محققین کی ضرورت کی بقاء کے لیے کچھ کر جا ئیں۔

مستشرقین کا کردار متعین کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

"To some of my audience it may appear disappointing… that more profitable results can be looked for in a concentration or preparing the materials for our successors to wrote with, than in a well-meaning but premature attempt to dogmatize on the basis of insufficient evidence"[2]

آربری کے نزدیک تین چار سو سال سے تاریخ تصوف ، اس کی نشوونما اور ارتقا کے بارے میں جو تحقیق سامنے آئی ہے وہ نا صرف یہ کہ ناکافی ہے بلکہ نا قابل اعتماد بھی ہے[3]۔

پروفیسر آربری کی یہ محققانہ رائے قابل ستائش ہے۔انھوں نے استشراق کی چار سو سالہ تاریخ میں علمی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلی بار حقائق کو تسلیم کیا ہے۔ان معلومات اور لٹریچر کا غیر معتمد اور قیاس پر مبنی ہونا اس وجہ سے تھا کہ اس وقت تک امہات الکتاب کا بہت بڑا ذخیرہ شائع ہی نہیں ہوا تھا۔یہ امہات الکتاب مخطوطات کی صورت میں ابھی افریقہ اور یورپ کے کتب خانوں میں پڑی تھیں اور دنیائے تحقیق میں لاموجود تھیں لہذا تصوف کی تاریخ اس کی نشوونما اور ارتقاء کس طرح ہوا؟ 1942 میں انھوں نے کہا کہ آج سے تقریباً اسی سال بعد جب بے شمار امہات الکتاب اور بنیادی مصادر و مراجع چھپ چکے ہوں گے تو اس وقت کے اسکالرز اس پوزیشن میں ہوں گے کہ تصوف کی تاریخ کا صحیح تعین و تعبیر کر سکیں۔مگر آج کی جانے والی تاریخ تصوف کی تعبیر غیر مستند گمان یا مفروضے پر مبنی ہے، لہذا نا قابل اعتماد ہے۔

تاریخ تصوف پر لکھنے والے مستشرقین نے برصغیر پاک وہند کے اہل علم کو بالخصوص اور عالم اسلام کے چند علما اور اہل دانش کو بالعموم متاثر کیا ہے۔کچھ مومنانہ فراست اور حکیمانہ دانش کے حامل مصلحین نے واقعتا تصوف کے نام پر در آنے والی بدعات و خرافات کی نشاندہی کی مگر سطحی علم رکھنے والے اس کی تشکیل کو غیر اسلامی اور خارج از اسلام تسلیم کرنے لگے۔ان لکھنے والوں نے تصوف کی اساس اس کی تشکیل کی حقیقی بنیاد اور تاریخ تصوف کی حقیقی تشریح و تفسیر قرآن مجید،

---

[1] Edward,Said, Oreintalism ,32.

[2] قادری، محمد طاہر **"تصوف اور مستشرقین"**، ص20

[3] A.J Arrbery , *Sufism*,55.

رسول اکرم کی سیرت طیبہ اور سنت مبارکہ ، صحابہ کرام کرام،اصحابِ صفہ ، خلفائے راشدین،تابعین اور تبع تابعین (جو خیر القرون ہیں) کی حیات و تعلیمات سے اخذ کرنے کی بجائے اس کو ایران، ہند، یونان اور مسیحی اطوار اور فلسفے کی پیداوار قرار دے دیا۔انھوں نے اس بات پر یقین پختہ کر لیا تصوف کی فکر نے کل طور پر ان تہذیبوں کی ماحولیات ، معاشرت، نظریات اور افکار و فلسفے سے پرورش پائی ہے اور اس پر ہندی، بدھ مت،، مسیحی اور یونانی فلسفے اور عقائد کے اثرات ہیں۔اس سارے نقطہ نظر کا مبدا و مصدر مستشرقین کی وہ معاندانہ تحقیق تھی جو آج سے تقریباً چار سو سال پہلے سولہویں صدی عیسوی یعنی صلیبی جنگ کے نتیجے میں شروع ہوئی[1]۔

مغربی مفکرین کی تحقیق کو خود ان کی تحریروں نے کیا ہے اس سلسلے میں پروفیسر اے۔آر۔جے آربری اور پروفیسر نکلسن کے نام شہرت اور اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی تحقیق و آرا کسی حد تک غیر جانبدانہ شمار کی جاتی ہیں اس لیے دیگر مغربی مفکرین کو بھی انہیں دو نامور محققین کی آرا کی روشنی میں زیر بحث لایا گیا ہے۔آربری نے علامہ اقبال کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ تصوف کے نہ صرف مفکر تھے بلکہ اسے سرزمین اسلام میں ایک عجمی پودا تصور کرتے تھے۔

پروفیسر اے جے آربری نے علامہ اقبال کی شخصیت کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''علامہ اقبال نابغہ روزگار ہستی ہے جن کے مقام و مرتبے کو سب سے پہلے نکلسن نے پہچانا افسوس کہ ہمارے دور کا اتنا بڑا مفکر کہ ہمارے دور کی تاریخ کو ابھی تک ایسا سیرت نگار نہیں ملا جو ایسے مفکر کے ساتھ صحیح انصاف کر سکے جو صوفی تاریخ کی ایک اہم شخصیت ہیں۔''[2]

علامہ اقبال کی وفات سے چند سال پہلے کلکتہ میں لیکچر دیتے ہوئے آربری کہتے ہیں کہ تصوف کی صحیح تعبیر و تشریح کے لیے اس وقت تک کوئی قطعی و اطمینان بخش شہادت اور دلائل موجود نہیں کہ اس کی حقیقت کا جزوی طور پر بھی ادراک کیا جا سکے کہ تصوف کی اصل کیا ہے؟اس کا آغاز کب اور کیسے ہوا اور فلسفہ تصوف کی تعلیمات کیسے وجود میں آئیں؟وہ کہتے ہیں کہ تاریخ تصوف پر آج کے دن تک موجود علم کی بنا پر ہم کوئی جزوی نتیجہ بھی نہیں قائم کر سکتے۔اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

---

[1] حفیظ الرحمٰن، **برصغیر پاک وہند میں اسلامی تصوف پر ہندمت کے اثرات**، (مقالہ ایم فل علوم اسلامیہ، نمل، 2017) ص:136

[2] قادری، محمد طاہر، **تصوف اور مستشرقین**، ص 10

"It is unhappily the case that a very large volume, perhaps even the greater volume of the primary and secondary material indispensable to the scientific analysis of the Sufi movement is still unpublished, being contained in manuscripts scattered over the libraries of Europe, Africa and Asia."[1].

یعنی یہ معاملہ قابل افسوس ہے کہ صوفی تحریک کے سائنسی تجزیہ کے لیے مطلوبہ بنیادی اور ثانوی مصادر پر مبنی انتہائی ضخیم مواد ابھی تک طبع نہیں کیا جا سکا، جبکہ وہ یورپ افریقہ اور ایشیا کے کتب خانوں میں بکھرا پڑا ہے۔

آربری کا ماننا ہے کہ تاریخ تصوف پر جو بھی کہوں گا وہ قابل اعتماد اور قابل بھروسہ نہیں ہوگا اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے تاریخ تصوف کے بنیادی اور ثانوی مصادر جن کے بغیر تاریخ تصوف کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں اور یہ مخطوطات ٹکڑوں کی صورت میں یورپ، افریقہ ور ایشیا کے کتب خانوں میں بکھرے پڑے ہیں جب تک وہ مخطوطات طبع نہ ہو جائیں تب تک تاریخ تصوف پر کوئی تسلی بخش بات نہیں کی جا سکتی۔ ان مخطوطات کی طباعت کے بارے میں آربری لکھتے ہیں۔

تاریخ تصوف پر کوئی تسلی بخش بات نہیں کی جا سکتی۔ اس مخطوطات کی طباعت کے بارے میں آربری لکھتے ہیں

" I must own to an even appreciation of the work of those scholar, chief among them my own murshid prof Nicholson who have disciplined their ambitions to undertake what is perhaps a less spectacular but certainly a more generally serviceable task, the task namely of preparing sound edition and accurately notated translation of primary document of sufism. If next generation of orientalists successfully did this, then we will be able to understand true history of Sufism" [2].

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پروفیسر نکلسن کو آربری اپنا مرشد مانتے ہیں کہ انھوں نے تاریخ تصوف کے حوالے سے بڑا موثر کام کیا ہے اور تصوف کے ابتدائی نو شتوں کے ابتدائی ایڈیشن تیار کیے ہیں اور ان کے تراجم پر صحیح طور پر حاشیے لکھے۔

تصوف کی تاریخ کے تعین میں آربری کا یہ موقف حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ مستشرقین نے تعصب اور بغض و عداوت کی وجہ سے اسلام کے چہرے کو مسخ کیا۔ مگر بیسویں صدی کے نصف کے بعد بہت سے مستشرقین نے تصوف کے سینکڑوں مخطوطات کو مرتب کیا، قابل اشاعت بنایا اور کتابی صورت میں منظر عام پر لایا۔ آج علم کی صورت حال مختلف ہو

[1] Arbery, *An introduction to the history of Sufism*, 4.
[2] Arberry,*An introduction to the History of Sufism* ,5.

چکی ہے۔ تصوف کی تاریخ کا پرانا نظریہ مکمل طور پر غلط اور بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔اب تصوف اپنے اصل مصادر کی روشنی میں عجمی کے بجائے مکی اور مدنی ثابت ہو چکا ہے۔

سرزمین مدینہ مسجد نبوی اور اصحاب صفہ کی سرزمین سے جنم لینے والا پودا بن چکا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے نشوونما پانے والا حیات واحوال صحابہ کرام تابعین اور اتباع التابعین کے احوال سے ارتقاء پانے والا نظریہ بن چکا ہے۔ یہ شجر ثمر بار قرآن وسنت کی تعلیمات سے سرزمین اسلام میں اُگا اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واسوہ صحابہ کرام سے نشوونما پاکر سلف صالحین کی زندگی کے لیے نمونہ بن گیا۔ یہ حقیقت بغیر شک وشبہ کے ثابت ہو چکی ہے۔

اے جے آربری لکھتے ہیں کہ یورپ میں سب سے پہلے تصوف کو متعارف کرانے والے سر ولیم جونز ہیں دراصل برطانوی ہے، جو استشراق کے بانی ہیں۔اور اسی نے ہندوستان میں جدید تحریکِ استشراق کی بنیاد رکھی گئی ہے اور بنیادی محرک بھی یہی تھا۔

اے جے آربری سر ولیم جونز کی تحقیق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے بنگال میں قیام اختیار کر لیا تھا۔ جہاں ان کی دلچسپی سنسکرت اور ہندی فلسفہ کے مطالعہ میں بڑھ گئی۔انھوں نے ہندو مذہب کے چاروں ویدوں: رگ دید، تجر وید، تھر وید اور سام وید" کا مطالعہ کیا ہے جو نہیں وہ بنگال آئے تو انھوں نے مثالی جوش وولولے کے ساتھ سنسکرت کا مطالعہ شروع کے دیا۔ وہ بعد کے صوفیاء کے فلسفے کے درمیان مماثلات اور مشترکات سے بہت متاثر ہوئے تھے[1]۔

ولیم جونز نے اپنی ابتدائی زندگی میں یونانی، لاطینی، فارسی عربی، چینی اور دیگر کئی زبانیں سیکھنا، ویدوں کے مطالعہ اور دورِ آخر کے صوفیانہ فلسفہ اور فلسفہ ویدانت کے درمیان مشترکات میں تھی۔اس لیے اس نے بنگال ہندوستان اور ایران کے سفر کیے۔ گویا ان تین ذرائع سے تصوف پہلی بار یورپ میں متعارف ہوا۔ تو یہاں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس فکر اور نظریے سے اسلامی تصوف کی صحیح تاریخ متعین ہو سکتے ہیں۔

کیوں کہ سر ولیم کی دلچسپی درست تاریخ بیان کرنا نہیں بلکہ مشترکات تلاش کرنا تھی۔انھوں نے جو کتابیں شائع کیں ان کے نتیجے میں تصوف کو عجمی اور ایرانی پودا ہی بننا تھا۔اے جے آربری مزید لکھتے ہیں۔

> "Thus Sir Jones speculated, basing his theories on an acquaintance with the mysticism of the Persian poets only"[2] .

اس طرح سر ولیم جونز کی تاریخِ تصوف کے بارے میں تھیوری صرف اور صرف ایرانی شعراء پر مبنی رہی۔

---

[1] Arberry.*An introduction to the History of Sufism* ,37.
[2] Ibid .10

اے جے آربری سر ولیم جونز کے اس نظریے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"For he had no opportunity of studying those primary documents in Arabic which have still to be completely explored and which afford the only reliable basis for constructing an ancestry of Sufism"[1].

انھیں بنیادی عربی مراجع کے مطالعے کا موقع ہی نہیں ملا، جب کہ ان مصادر کو ابھی مکمل طور پر دستیاب کرنا باقی ہے، کیوں کہ یہی وہ مآخذ ہیں جو تصوف کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے مستند اور قابلِ اعتماد ذرائع ہوں گے۔

سر ولیم جونز نے یہ نظریہ اس لیے قائم کیا کہ اسے تاریخِ تصوف کے متعلق عربی مآخذ و مصادر پڑھنے کا موقع نہیں ملا یا وہ کتب دستیاب ہی نہیں تھیں۔اس لیے انھوں نے ایرانی شعراء سے تصوف کو سمجھنے کی کوشش کی۔اس طرح انھیں تصوف کا اصل چہرہ ہی نظر نہیں آیا۔

اے جے آربری مستشرقین کی مفروضوں پر مبنی رائے کے رد کے بعد تصوف کی تاریخ کے صحیح تعین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Let it be clearly understood that so far as the constructing of a history of Sufism is concerned these attractive generation make in reality very little solid matter and personally I could recommended that a trace be called to all such speculations for at least a generation , so that meanwhile all possible energy can be concentrated upon the main task in hand , the only task appropriate to the thorough going specialist ,the description and analysis of Sufi doctrine and practice on the basis of Islamic sources and Islamic sources only"[2].

یہ بات واضح طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جہاں تک تاریخِ تصوف کو مرتب کرنے کا تعلق ہے ،ان دلفریب مفروضوں میں کچھ ٹھوس مواد نہیں رکھا۔میں ذاتی طور پر یہ چاہتا ہوں کہ ان خیال آرائیوں کو کم از کم ایک نسل کی مدت تک ملتوی کر دیا جائے تاکہ اس دوران پوری توانائی دستیاب کام پر مرکوز کر دی جائے اور یہ کام ایک کامل ماہر کا ہے کہ وہ صوفی نظر و عمل کے تجزیے اور بیان پر صرف اور صرف اسلامی مصادر و مراجع کی بنیاد پر کام کرے۔

اس اقتباس سے یہ نکات ملتے ہیں کہ اے جے آربری کے مطابق اگر تاریخِ تصوف کے بارے میں بے بنیاد مفروضوں اور بے دلیل نظریات سے نکلنا،اسلامی تصوف کی اصل تاریخ تک پہنچنا اور اس کی تعیین و تشریح کرنا چاہتے ہیں تو

---

[1] Ibid,12

[2] Arberry,An Introduction *to the History of Sufism* ,19.

اس عمل کے لیے ایک نسل درکار ہے، جو اپنی پوری طاقت سے صرف اور صرف اسلامی مصادر و مراجع پر کام کرے۔اس طرح ان عربی اسلامی مصادر و مراجع کے مطالعہ کے بعد ہی تاریخ تصوف کا صحیح تعین ہو سکتا ہے۔ مستشرقین اسلامی تصوف کی تاریخ کے تعین میں اسی لیے بھٹکے ہیں کہ ان کے پاس مطالعے کے لیے اصل لٹریچر موجود ہی نہیں تھا۔انھوں نے تقابلی جائزے اور مطالعے کے بعد یہ تصورات قائم کیے کہ صوفیاء نے دیگر مذاہب اور فلسفوں سے اسلام میں روحانیت کا تصور داخل کیا۔ کس نے داخل کیا،اس پر اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ حضرت ذولنون مصری نے اسلامی تصوف میں روحانی تصورات داخل کیے اور کچھ نے کہا بایزید بسطامی نے داخل کیا اور کچھ نے جینید بغدادی کی طرف نسبت دی اور کچھ نے شہاب الدین سہروردی وغیرہ کے نام لیتے ہیں۔ان کا کسی ایک نام پر اتفاق نہیں اور نہ کوئی دلیل ہے کہ کس صوفی نے کس راہب، فلسفی یا ہندو سوامیں سے سیکھا،ان کی محفل میں بیٹھے اور پھر ان تعلیمات کو اسلام میں داخل کیا۔ یہ ساری باتیں مفروضوں پر مبنی ہیں۔

اے۔ جے۔ آربری لکھتے ہیں کہ تاریخ تصوف پر مستشرقین نے جو کچھ لکھا اس کو بنیاد بناتے ہوئے یورپ میں تصوف کی تحقیق کا ایک نیا مکتبہ فکر وجود میں آیا۔ جس میں مشہور نام گولڈ زیہر، نکلسن، میکدونلڈ، میسی نون اور ایسن پلیسیو شامل ہیں[1]۔

ان مستشرقین نے دستیاب لٹریچر کو بنیاد بناتے ہوئے تاریخ تصوف کے بارے میں باقاعدہ نظریات قائم کیے۔اگرچہ ان کے دور میں بھی اصل مصادر و مراجع میں کچھ نہیں چھپا تھا مگر لٹریچر پر انھوں نے کچھ نئے تصورات قائم کیے، جو پہلے لوگوں کے پاس نہیں تھے۔

گولڈ زیہر اور تھولک کے بعد فرانسیسی سکالر والن بورگ آئے،اس کے بعد جرمن سکالر جارج روزن آئے۔ان کی توجہ مثنوی مولانا روم کے جزوی کام پر رہی اور انھوں نے مثنوی روم کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔1819ء میں فریڈرک رکرٹ اور وان روزن ویگ آئے،انھوں نے بھی مثنوی روم اور شمس تبریز کے دیوان پر کام کیا۔ برطانیہ میں مثنوی روم سر جیمز ریڈ ہاوس اور ایڈورڈ ہنری ون فیلڈ کے ذریعے متعارف اور مشہور ہوئی۔ جیمز ریڈ ہاوس نے 1881ء میں اس کتاب کا ترجمہ کیا اور ون فیلڈ نے 1887ء میں کچھ ترمیمات کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کیا۔اس کے ساتھ ساتھ ون فیلڈ 1880ء میں محمود شبستری کے دیوان ''گلشن راز'' کا ترجمہ بھی کیا۔اس نے بھی ایرانی شعراء کے ذریعے صوفی ازم متعارف کرایا۔

---

[1] Arberry, *An introduction to the History of Sufism* ,43.

اے جے آر بری تصوف کی صحیح تاریخ کے تعین کے حوالے سے ایک اہم بات لکھتے ہیں:

"It goes without saying that the most important of all preliminaries must be a very thorough knowledge of the Quran, Traditions and the important schools of Muslims theology" [1].

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تصوف کی صحیح تاریخ اور تعبیر کا تعین کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ قرآن وحدیث اور مسلم اعتقاد کی اہم کتب تک رسائی ہو اور ان کی پوری تعلیمات کا علم ہو۔

یہی تحقیق ہے اور انہی ذرائع سے ہی آدمی دیانت داری کے ساتھ تجزیہ کر سکے گا کہ تعلیماتِ تصوف جو صوفیاء کے ہاں ملتی ہیں ان کا وجود قرآن و حدیث میں بھی تھا یا نہیں۔ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین میں بھی موجود تھا یا نہیں۔ گویا اے جے آر بری کہنا چاہتے ہیں کہ مکمل مطالعے کے بعد ہی ایک واضح رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

اس کے بعد اے۔ جے۔ آر بری نتیجہ قائم کرتے ہوئے بڑی اہم بات کرتے ہیں اور یقیناوہ اس جرات مندانہ موقف پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"It follows as a natural consequence that they are not best qualified to study Sufism whose attitude to religion, in general, or to Islam, in particular, is conditioned by hostility or bigotry nor in truth, if I may be allowed to make this point, will those Muslims be ideally fitted to take up this research who find themselves unable to appreciate the mysticism of other faiths than their own" [2].

یہ ایک فطری نتیجہ ہے کہ وہ لوگ تصوف کا مطالعہ کرنے کے اہل نہیں ہیں جن کا مذہب بالعموم یا خاص طور پر اسلام کے ساتھ رویہ سچائی کے بجائے دشمنی یا تعصب پر مبنی ہو۔ اگر مجھے یہ بات کہنے کی اجازت دی جائے، کیا وہ مسلمان اس تحقیق کے لیے مثالی طور پر موزوں ہوں گے جو خود کو اپنے عقائد کے علاوہ دوسرے مذاہب کے تصوف کو اہمیت دینے کے لیے تیار ہی نہ ہوں!

اس اقتباس کے نتیجے میں یوں کہ سکتا ہے کہ جن لوگوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں تاریخِ تصوف پر نظریات قائم کیے، وہ دراصل صوفی ازم کے مطالعہ کی استعداد ہی نہیں رکھتے تھے اور نہ نظریات قائم کرنے کے قابل تھے، کیونکہ جو شخص کسی مذہب کے بارے میں متعصبانہ اور معاندانہ رویہ رکھتا ہو وہ اسلامی تصوف کی تاریخ پر جائز اور دیانتدارانہ نظریہ کیسے قائم کر سکتا ہے۔ وہ تصوف کی تعلیمات پر غیر جانبدارانہ رائے کیسے دے سکتا ہے۔ اے جے آر بری کے مطابق

---

[1] Ibid, 60.

[2] Arberry, *An Introduction to the History of Sufism* ,61.

کہ اگر کوئی مسیحی تصوف پر کوئی متعصب مسلمان تحقیق کرنا شروع کرے تو کیا اس کی تحقیق دیانت دارانہ ہو گی؟ وہ جو نظریہ و مفروضہ مسیحی تصوف کے بارے میں قائم کرے گا، کیا وہ ہندؤں کے لیے قابل قبول ہو گا؟ اسی طرح اہل یورپ اور مسلمانوں میں صدیوں سے دشمنی چلی آرہی ہے۔ ایسے میں وہ اسلامی تصوف کے بارے میں حقیقت پر مبنی رائے کیسے قائم کر سکتے ہیں؟ وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس بھی مذہب کی روحانیت کے بارے میں کوئی تحقیق کر رہا ہو تو پہلے اس کے بارے میں یہ یقینی بنایا جائے کہ اس کے ذہن میں اس مذہب سے متعلق کوئی تعصب وعداوت تو نہیں۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا دل صاف ہے اور وہ علمی دیانت کا حامل ہے تو پھر دوسری شرط یہ ہو گی کہ تصوف کے طالب علم کو خود بھی کچھ نہ کچھ صوفی ہونا چاہیے۔ ایسا محقق جس کا دل اور اندر کی کیفیات صوفیانہ ہوں اور تصوف کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا ہے اس کی قدر و قیمت مانتا ہو، اس کی روح کو سمجھنے کا شوق اور ذوق رکھتا ہو تب وہ صوفیاء کی تعلیمات کی قدر دانی کر سکتا ہے۔

ان تمام ابحاث کا خلاصہ کیا جائے تو یوں کہا جائے تو مناسب ہو گا کہ ۔اے۔ جے۔ آربری نے تاریخِ تصوف سے متعلق تمام مفروضات کو یہ کہتے ہوئے رد کر دیا کہ تاریخِ تصوف کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ تعصب کی بنیاد پر کہا گیا ہے۔ لاعلمی میں دلائل اور شہادتوں کے بغیر بات کی گئی ہے۔ صرف ایک زمانہ ہونے اور مشترکات وامکانات کی بنیاد پر مفروضے قائم کیے گئے ہیں، جب کہ قائم کیے جانے والے مفروضے بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں۔ در حقیقت وہ یہ حق ہی نہیں رکھتے تھے کہ تصوف پر بات کریں یا تصوف کی تاریخ کا درست تعین کریں۔ آربری اس بات کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "Like an encyclopedia, it will need to be compiled by a number of experts, each specializing in a particular aspect of the subject .but it will also require an editor whose difficult responsibilities it will be to give the whole work balance and to resolve such inconsistencies as are bound to arise from the conflict of expert view…"[1]

کسی انسائیکلوپیڈیا کی طرح اس کے لیے بھی اپنی اپنی فیلڈ کے ماہرین کی ایک ٹیم کی ضرورت ہو گی، جو اسے مرتب کرے گی۔ اس کے لیے ایک ایڈیٹر کی بھی ضرورت ہو گی جس کا کام انتہائی مشکل ہو گا کہ وہ سب چیزوں میں توازن پیدا کرے اور اسے قائم رکھے اور ماہرین کے نقطہ ہائے نظر میں پیدا ہونے والی ناہمواریوں کو دور کرے، مگر چونکہ نبی مکرم صلی

[1] Arberry, A J. *Introduction to the History of Sufism*. (London: Longmans, Green, 1943) ,78.

اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے فرمایاہے: "اختلاف أمتی رحمة" [1] علماء کے درمیں ان اختلاف بھی رحمت ہے۔ اس لیے میرے خیال میں اس منزل کو پالینا بھی کچھ مشکل نہیں ہوناچاہیے۔ میرے نزدیک یہ کام تھولک کی کتاب تصوف کی دو صد سالہ تقریب سے بہت پہلے ہوتاہوا نظر نہیں آتا، اگر اگلے اسّی سال دنیا کو تصوف کی حتمی اور مکمل کہانی کے لیے انتظار کرناپڑا تو یہ امید خلافِ توقع نہیں کہ مرد وزن کی وہ نسل جس نے یہ کام سرانجام دیناہے وہ جنگ اور احتیاج سے آزاد نسل ہو، ایسی نسل جسے روحانی اقدار کاادراک نصیب ہوگااور جو حقائق تصوف کواپنی روزمرہ زندگی پر منطبق کرچکی ہوگی۔

اسلامی تصوف کی تاریخ کے بارے میں ڈاکٹر مصطفی حلمی کہتے ہیں کہ تصوف کاآغاز حضرت محمد صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے مبارک دور سے ہوا، اور تصوف دراصل اسلام کی روحانی زندگی ہے، آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم حب دنیا سے بے زار تھے ان کی زندگی کا مقصد فقط رب کریم کی خوشنودی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی سیرت مقدسہ کے مطالعے کے دوران بھی یہ بات ہم کو نظر آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم غار حرا جاتے تھے اور یہ معمول نزول وحی سے پہلے کا تھا جس کا مطلب اس وقت بھی روحانی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے لوگوں سے دور رہ کر خلوت نفس کے بعد کائنات کی علت غائی پر غور کرکے جو زندگی اختیار کی، بعد کے زہاد وصوفیہ کے ریاضات اور مجاہدات اس کے تابع ہی آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی غار حرا کی تنہائی اور بعد کے زہاد وصوفیہ کے مجاہدات کا اصل الاصول رب کی معرفت تھا۔ لہذا جو تصوف اس اصول سے دور ہوا وہ اسلام سے بھی دور ہوا، وہ ہندی تصوف، یونانی تصوف یا مسیحی تصوف تو کہلایا جاسکتا ہے مگر یہ اسلام کے بالکل معارض ہے، اصل تصوف وہ ہے جو قرآن وسنت اور آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی حیات کے تابع ہو۔ ڈاکٹر حلمی لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی غار حرا کی زندگی ہی تصوف کا پہلا بیج ہے جس کو بعد میں صوفیاء نے ایک تناور درخت بنادیا[2]۔

لہٰذا تصوف پر عربی زبان میں موجود سینکڑوں کتب جو مختلف ملکوں کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں، جب تک وہ کتابی شکل میں منظر عام پر نہ آجائے اس وقت تک اسلامی تصوف کی تاریخ پر حقائق پر مبنی مواد اور شواہد ملنا مشکل ہے۔ اور مغربی مفکرین اور مستشرقین کا اسلامی تصوف کی تاریخ کا مفروضوں پر مبنی نظریات قابل اعتماد نہیں ہو سکتا۔ تصوف اور اس کی تاریخ کو سمجھنے میں تعصب اور حسد سے پاک نسل ان مخطوطات کی تحقیق کریں گے، تب جاکر یہ

---

[1] احمد بن حنبل، **المسند**، ح: 18347، ص: 391/30

[2] حلمی، **الحیاۃ الروحیۃ فی الاسلام**، ص: 34

حقائق بے نقاب ہوں گے اور زندگی کے ساتھ تصوف کی تطبیق ممکن ہو گی اور جب تصوف کے بارے میں صحیح نظریات قائم ہو جائیں گے، تب باطل نظریات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

ان تمام ابحاث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تصوف کے باب میں بہت اختلاف موجود ہے۔ تصوف کے اصول، مشتقات اور اس کے مصادر میں بھی اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تصوف اسلام ہی کی ایک شکل ہے۔ اپنی شکل وصورت، مبداء اور مناہج، اصول و قواعد فلسفہ و تعلیمات ہر اعتبار سے یہ اسلام کے مطابق ہے یہ قول ائمہ صوفیاء اور ان کے ہم مسلکوں کا ہے۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تصوف کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اس کی تعلیمات اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے یعنی تصوف ایک اجنبی چیز ہے جسے اسلام میں داخل کیا گیا، حالانکہ اس کا تعلق اسلام کے ساتھ دور تک کا نہیں ہے۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں وہ تصوف کے مصادر و مآخذ قرآن و سنت میں تلاش نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک تصوف کا قرآن و سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

خلاصۃ البحث:

اسلامی علوم کے مختلف شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ روحانیات کا شعبہ ہے اسے تصوف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تصوف میں عشق و محبتِ خداوندی، زہد، تقویٰ، عبادت، ریاضت اور مجاہدے کی تعلیمات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر صوفیائے کرام کا مقصد صرف اور صرف خدا کی رضا حاصل کرنا ہوتا ہے۔

تصوف کا دوسری صدی ہجری سے آغاز ہوا۔ جب لوگ دنیا کی عیش و عشرت میں محو ہو جاتے ہیں اور روز بروز دین سے دور ہونے لگتے ہیں تو اس اثناء میں کچھ لوگ ایسے دیکھائی دیتے ہیں جو صرف اللہ کی عباد ت کرتے ہیں۔ ابتداء میں تصوف کی بنیاد خالص زہد و تقوی پر تھی۔ اس لیے شروع شروع میں بدعات اور فسق و فجور کا اس میں کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ چوتھی صدی میں تصوف میں غیر اسلامی عوامل بھی داخل ہونے لگے اور یونانی فلسفہ، ہندومت اور عیسائیت و نصاری کے فلاسفہ نے قصداً اور عمداً اِس تصوف کو رواج دیا گیا۔

تصوف کی تعلیمات پر جہاں اسلام میں اہمیت ہے یہودیت میں بھی اتنی زیادہ اہمیت ہے۔ ابتدائی زمانے سے ہی روحانی تجربات یہودیت کا جزو خاص رہے ہیں۔ توریت میں بہت سی ایسی کہانیاں ہیں جو روحانی تجربات پر مبنی ہیں۔ روحانی تجربات کی یہ روایت آگے چل کر 'قبالے' کی شکل اختیار کر گئی۔

تصوف کو اگر عیسائیت میں دیکھا جائے تو عیسائیت میں تصوف کی بنیاد بابلی اور مصری تہذیب کی وجہ سے پڑی۔ صوفیائے کرام کے مطابق کائنات کے تمام حادثات قوانین فطرت اور انسانی ارادے سے رونما نہیں ہوتے بلکہ تمام واقعات دیوتاؤں کے فیصلوں کے نتائج ہوتے ہیں۔ یہ دیومالائی فیصلے باطنی اسرار سمجھے جاتے ہیں۔ عیسائیت میں راہِ تصوف یا عرفان کی مختلف تعلیمات اور منازل معین ہیں۔ ان تعلیمات اور منازل پر عمل پیرا ہونے سے انسان تصوف اور عرفان کے منازل طے کر سکتے ہیں۔ ان منازل میں سے اہم منزل نفس کی تربیت ہے۔

دنیا کے قدیم ترین مذہب ہندومت میں بھی تصوف کی تعلیمات ملتی ہیں۔ ہندو دھرم کی مقدس کتابوں میں سے وید کو بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وید کا سب سے آخری حصہ اپنشد کہلاتا ہے۔ اپنشدوں میں سب سے زیادہ جس قسم کی تعلیمات کا زور دیا جاتا ہے وہ بے ثباتی دہر کی تعلیم ہے۔ اور تصوف کی خاص اصطلاحات کے ذریعے عوام الناس

میں تصور تارک الدنیا کو عام کیا گیا ہے۔تارک الدنیا ہونے سے اپنشد نے یہ مراد لیا ہے کہ '' دنیا ایسے کماؤ کہ ہاتھ تک آئے دل تک نہ پہنچے''۔ لہذا اس کی تعلیمات اس حوالے اور زیادہ قابل قبول گردانی گئیں۔

ان تمام نکات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تمام بڑے مذاہبِ عالم میں تصوف کی تعلیمات مختلف شکلوں میں پائی جاتی ہے۔ان مذاہب میں تزکیہ نفس، احسان، عرفان، قبالہ، ویدانت، سیریت اور رہبانیت کے نام سے تصوف کی تعلیمات ملتی ہیں۔

زمانہ گزرتا گیا اسلامی تعلیمات تمام دنیا کے گوش و کنار میں پھیلتی گئی بہت سے لوگ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔تو کچھ اہل مغرب نے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ شروع کیا جنھیں مستشرقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ان لوگوں نے اسلامی تعلیمات کو غلط رنگ دے کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش اور لوگوں کے ذہنوں میں اسلامی تعلیمات اور تصوف کے حوالے سے طرح طرح کے شبہات پیدا کیے گئے۔ تصوف کے موضوع پر تحقیق اور شبہات کا اظہار کرنے والے مستشرقین کی تعداد کچھ کم نہیں۔ان میں چند اہم نام نکلسن، گولڈ زیہر اور اے جے آربری ہیں۔یہ تصوف کے حوالے سے مختلف نظریات کے حامل ہیں۔

پروفیسر نکلسن کو اسلامی ادب اور اسلامی تصوف کے باب میں ایک معروف عالم مانا جاتا ہے۔اُس نے اسلامی مطالعات پر ایک دیرپا اثر چھوڑا ہے۔پروفیسر نکلسن تصوف کی تشکیل، نشو نما اور ارتقاء کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اسلامی تصوف کی تعلیمات کا بیشتر حصہ مسیحیت سے مستعار لیا گیا ہے۔ جن جن چیزوں کے اشتراک وامتزاج سے تصوف وجود میں آیا اس کا سب سے اہم عنصر مسیحیت ہے۔ گویا ان کا دعویٰ ہے کہ تصوف کی تشکیل عیسائیت کی تعلیمات سے ہوئی ہے۔

گولڈ زیہر مذہب کے اعتبار سے یہودی اور جرمنی کا باشندہ تھا۔ گولڈ زیہر اور ان کے پیروکار اسلامی تصوف کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔اس کے نزدیک تصوف کا مصدر و مآخذ اسلام نہیں بلکہ اسلام میں یہ سب بعد میں داخل کیے گئے ہیں۔کیونکہ اسلام سے پہلے ہندومت، بدھ مت، عیسائیت اور یہودیت موجود تھی تو یہ تعلیمات ان مذاہب کی ہیں۔

اور ایک مستشرق اے جے آربری ہے جو ایک برطانوی مستشرق، عالم، مترجم، ایڈیٹر اور مصنف تھے جنھوں نے فارسی اور عربی زبان کے موضوعات پر تقریباً 90 سے زائد کتب لکھیں ، ترجمہ کیں اور ان میں ترامیم کیں۔اس کے نظریات باقی مستشرقین کی بہ نسبت بہت انصاف پسندانہ بنیادوں پر استوار ہیں۔اس کے مطابق تصوف کا اصل مصدر

قرآن و حدیث ہے۔ تصوف کو سمجھنے کے لیے اصل مصدر قرآن ہے اسی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ عربی مصادر بھی تصوف کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

مستشرقین کی تحقیقات کا ایک اہم مقصد اسلامی فکر و فلسفہ ،اسلام کے بنیادی تصورات ،قرآن، حدیث اور تصوف کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کرنا ہے۔ تصوف کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بہت سے سولات پائے جاتے ہیں جو آج کے دور میں تصوف کو پڑھنے اور سمجھنے والے کے ذہن کو مسموم کر دیتے ہیں ۔اس مقالے میں ایسے اعتراضات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ تصوفِ اسلامی پر وارد اعتراضات دور کیے جا سکیں اور نئی نسل مستشرقین کی تحقیق کے پس پردہ اصل حقائق و محرکات سے آشنا ہو سکے۔

ان تمام ابحاث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مستشرقین نے قرآن و حدیث کو ان تعلیمات کا مصدر بنا کر ان کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ ان کا حوالہ دیا۔ جب اصل مصادر قرآن و حدیث کا مطالعہ ہی نہیں کیا تو کیسے معلوم ہو گا کہ ان تعلیمات کی اصل کیا ہے، خصوصاً تصوف کے بارے میں کیا معلوم ہو گا کہ تصوف کی اصل کیا ہے، اس کے مآخذ کون سے ہیں۔ کیونکہ مستشرقین نے تصوف کو اصل اسلام کی تاریخ کے پس منظر میں دیکھنے کے بجائے تصوف کو ایران، یونان اور ہند سے ملاتے رہے۔ ان کا عرب کے معاشرتی و مذہبی رسومات و توہمات کے تناظر میں زیر مطالعہ نہیں لایا گیا اور نہ انھیں قرآن و حدیث اور عربی مصادر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ لہٰذا یہ لوگ تصوف کی اصل مصدریت اور تعلیمات سے کوسوں دور رہے۔

نتائجِ بحث:

1. تصوف کی اصل کے بارے میں تحقیق کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ اس کی اصل ''صوف'' زیادہ قرین قیاس ہے۔ابتداء میں اس کا نام ''تزکیہ واحسان'' تھا۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں ''تصوف'' کا نام بھی ایک اصطلاح کے طور پر سامنے آیا۔
2. تصوف تزکیہ نفس، تصفیۂ قلب اور معرفتِ ربّ سے عبارت ہو تو اس کے بنیادی مآخذ و مصادر قرآنِ کریم و سنتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)اور آثارِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہوں گے۔
3. تصوف کے رجحانات تمام مذاہب میں پائے جاتے ہیں لیکن طور طریقے اور اصطلاحات الگ الگ ہیں۔تصوف کی بعض تعلیمات میں ان مذاہب کے مابین مماثلت بھی پائے جاتے ہیں اس بناء پر اسلامی تصوف کے اصل مصدر کے بارے میں اختلافات پیدا ہوئے۔
4. تصوف کی تعلیمات میں مختلف وجوہات، مرور زمان اور مختلف تہذیبوں کی بناء پر رفتہ رفتہ ردوبدل اور غیر اسلامی تعلیمات شامل ہو گئیں۔اس کی طرف مستشرقین نے اشارہ کیا ہے کہ تصوف اسلام میں داخل کیا ہے، یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ نہیں ہے۔
5. مستشرقین کے بقول تصوف کی روایت مسلمانوں نے دیگر مذاہب سے مستعار لیا ہے۔اس کی اصل قرآن وسنت سے نہیں ملتی۔
6. مستشرق پروفیسر نکلسن کے مطابق اسلامی تصوف میں تصورِ معرفت، فنا، پرہیزگاری، قناعت پسند اور ایثار وغیرہ کی تعلیمات ملتی ہیں یہ سب عیسائیت سے ماخوذ شدہ ہیں۔
7. پروفیسر نکلسن کے مطابق خاموشی، زہد اور ذکرِ الٰہی صوفیاء کی خصوصیات میں سے ہیں اور یہ عیسائی راہبوں سے لی گئی تعلیم ہے کیونکہ عیسائی راہبوں کے ہاں بھی ان خصوصیات کو ترجیح دی جاتی تھی۔
8. گولڈزیہر ایک یہودی مستشرق ہے۔اس کے مطابق اسلامی تصوف یونانی، فارسی، ہندومت اور دیگر غیر اسلامی فلسفے سے ماخوذ ہے۔

9. گولڈ زیہر صوفیاء کے کرامات، مراتب اولیاء وصوفیاء کے سخت مخالفت کرتے ہوئے صوفیاء کے لیے بھکاری، مکار اور درویش کا لفظ استعمال کرتا ہے۔
10. مستشرقین میں سے اے جے آربری اس بات کا قائل ہے کہ اسلامی تصوف کو سمجھنے کے لیے قرآن، حدیث تک رسائی انتہائی ضروری ہے اور اس کے مطابق جو مستشرقین تصوف کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں وہ صرف کچھ مماثلات اور مفروضوں کی بنیاد پر کہتے ہیں۔
11. اے جے آربری اس بات کا قائل ہے کہ تصوف کے زمانہ آغاز کا قطعی تعین کرنے کے لیے قرآن، حدیث اور عربی مصادر تک رسائی انتہائی ضروری ہے۔
12. مستشرقین نے تصوف پر جو اعتراضات وارد کیے ہیں ان سب کی بنیاد ایرانی قدیم تصوف یعنی زرتشت تصوف اور چند مغربی یورپی شخصیات کے وہ سفر نامے وغیرہ ہیں جو انھوں نے مختلف ملکوں میں سفر کر کے ان کی تہذیب، ثقافت، مذہبی وسماجی مسائل اور فلسفہ وشاعری کے حوالے سے لکھا ہے۔

سفارشات:

1. موجودہ صوفیانہ تعلیمات میں بہت سے غیر اسلامی افکار شامل ہوئے ہیں ۔ان افکار کے اسباب و علل اور اس کے تدارک کے لیے تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تصوف کی تعلیمات سے مستفید ہو سکیں۔۔
2. مستشرقین کے مطالعات کا بہت بڑا حصہ تصوف پر ہے لیکن وہ سب کے سب انگریزی زبان میں ہے اس لیے ابھی تک ان تک رسائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ تصوف کے میدان میں علمی سرمایہ بڑھانے کے لیے علوم اسلامیہ کے محققین کو چاہیے کہ ان مطالعات کو اردو زبان میں شائع کرنے کی کوشش کی جائے۔
3. اخلاقی رواداری، روحانی اقدار اور امن و آشتی کو اجاگر کرنے کے لیے صوفیائے کرام اور اولیائے کرام کی زندگیوں سے متعلق تعلیمات کو محراب و منبر کا حصہ بنانے کی خاطر صاحبِ محراب و منبر اپنا کردار ادا کرے۔
4. تعلیمی ادروں میں شعبہ علوم اسلامیہ کے نصاب میں تصوف اور مستشرقین کے حوالے سے جدید معاصر پروفیسر نکلسن، گولڈ زیہر، این میری شِمل اور اے جے آربری جیسے لوگوں کی کتابوں کو شامل کیا جائے اور محققین سے ایسے جدید عنوانات خصوصاً تصوف پر استشراقی افکار وغیرہ پر جاندار مقالات لکھوائیں، تاکہ نئی نسل ان جدید افکار سے آشنا ہو سکیں۔
5. ہمارے کتب خانوں میں مستشرقین کی اصل کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں تصوف اور مستشرقین پر لکھی جانے والی کتابوں کی فراہمی کو ، یونیورسٹیوں اور کالجوں کی لائبریریوں میں یقینی اور آسان بنایا جائے اور ادارہ ایسی کتابوں کے حوالے سے سال میں ایک بار کتب میلے کا بھی انتظام کیا جاسکتا ہے۔
6. معاصر مستشرقین سے علمی مکالمہ اور بات چیت کے لیے ادارے ان کے لیکچرز اور سیمینارز کا اہتمام بھی کر سکتے ہیں۔اور ان پر تحقیق کے لیے کوئی تحقیقی مرکز بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔

فہارس

فہرست آیات

فہرستِ احادیث

فہرستِ دیگر الہامیں کتب

فہرستِ اصطلاحات

فہرستِ مصادر و مراجع

فہرستِ آیات

نمبر شمار	آیات	سورہ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
1	﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ﴾	البقرہ	129	48
2	﴿صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ ---﴾	البقرہ	138	3
3	﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾	البقرہ	165	43, 137
4	﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾	آل عمران	31	42, 44
5	﴿وَاذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ﴾	ال عمران	41	137
6	﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا----﴾	ال عمران	200	30
7	﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ تَوَلَّى ----﴾	النساء	80	45
8	﴿يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى----﴾	النساء	171	91
9	﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ-----﴾	المائدہ	82	186
10	﴿قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ--﴾	الانعام	50	81
11	﴿قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ---﴾	التوبہ	24	43
12	﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ--﴾	یونس	106	89
13	﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا--﴾	النحل	36	87
14	﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ -----﴾	مریم	59	90
15	﴿ذَلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْد--- ﴾	الحج	30	28

16	﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ----﴾	الحج	77	89
17	﴿ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾	العنكبوت	45	49
18	﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ----﴾	الاحزاب	41،42	137
19	﴿قُلْ يَاعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُ--﴾	الزمر	53	131
20	﴿ وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى﴾	النجم	3،4	45
21	﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ----﴾	الرحمن	26،27	135
22	﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ---﴾	الحديد	20	188
23	﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا------﴾	الحديد	27	91
24	﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾	حشر	7	45
25	﴿هُوَالَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوعَلَيْهِمْ---﴾	جمعہ	2	48
26	﴿ياالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾	التحریم	12	27
27	﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾	الشمس	9،10	49, 47
28	﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ،خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ-﴾	العلق	1۔5	25

فہرستِ احادیث

نمبر شمار	احادیث	کتاب	صفحہ نمبر
1	الاحسانُ اَن تَعبدَ اللہَ کَانَّکَ تَرَاہ،فان لَم تَکن تَرَاہ فَانَّہٗ یَرَاک	صحیح بخاری	26
2	أَفَلَا أحب أن أكونَ عبدا شَكُورًا	سنن ابن ماجہ	26
3	إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ	مسلم	28
4	أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ	صحیح مسلم	22
5	رب اجعل حبك أحب إلي من نفسي و أهلي و من الماء	المستدرک علی الصحیحین	43
6	كان خلقه القرآن	المسند	135
7	كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ، أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ	ایضا	29
8	لایؤمن احدکم حتٰی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین	صحیح مسلم	45, 136
9	لایؤمن أحدکم حتٰی یکون ھواہ تبعَ الما جئت بہ	صحیح مسلم	46
10	مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ،وَأَبْغَضَ لِلَّهِ،وَأَعْطَى لِلَّهِ،وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدِ اسْتَكْمَل---	المعجم الکبیر	43
11	مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ	الحاوي للفتاوي	24
12	من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجة بان یدع--	ترمذی	49
13	وَاللهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ	صحیح بخاری	27

فہرستِ دیگر الہامی کتب

نمبر شمار	متن	کتاب	صفحہ نمبر
1	اگر تو کامل ہونا چاہیے تو جا کر سب کچھ تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے۔ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔تب آ کر میں ں رے پیچھے ہو لے۔	متی	63
2	آسمان کی بادشاہت قریب پہنچ گئی ہے لہٰذا توبہ واستغفار کو اپنا شیوہ بناؤ۔	متی	62
3	تمھارا آقا و مالک یعنی خداوند جلادینے والی آگ ہے۔	ایوب	56
4	جب میری اطاعت اور عبادت خالص محبت کا نتیجہ ہو تو عابد مجھے میری اصل صورت میں دیکھ سکتا ہے۔اور دیکھ بھی لیتا ہے اور یوں میرا عشق گویا مجھ میں سماجاتا ہے۔	گیتا	82
5	جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی تو وہ دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔	متی	61
6	جو شخص خواہشات پر قابو پالے اور ان سے آزاد ہو کر انھیں ترک کرے جیسے یہ میں ہوں یا یہ میرا ہے تک کا خیال کبھی نہ آئے اس شخص کو نفسِ مطمئنہ حاصل ہو گا۔	بھگوت گیتا	81
7	دنیا کیڑے مکوڑے رہنے کی جگہ ہے اس لیے یہاں اپنے لیے مال و دولت اکٹھا نہ کیا کر۔	متی	64
8	ننانوے سچ بولنے والا ہو جنھیں توبہ کی حاجت نہیں اور ایک توبہ کرنے والا ہو تو اللہ ننانوے کی نسبت اس ایک سے زیادہ خوش ہوتا ہے۔	لوقا	62

9	یہ دنیا خدا کی جلوہ گاہ ہے۔ ہر شئے مظہر خدا ہے۔	گیتا (کرم یوگ)	83
10	یہ نہ سمجھو کہ میں اگلے پیغمبروں یا ان کے بنائے ہوئے قوانین کو توڑنے آیا ہوں۔ میں تو اس کے حقیقی مقصد و منشاء کو پورا کرنے آیا ہوں۔	انجیل مرقس	60

فہرستِ اصطلاحات

نمبر شمار	اصطلاح	صفحہ نمبر
1	احسان	22
2	احکامِ تکلیفیہ	15
3	اسرار ورموزِ کائنات	59
4	امتِ وسط	93
5	انکشاف/منکشف	55
6	انوار وتجلیات	21
7	تابعین/تبع التابعین	31
8	تشکیک وارتیاب	96
9	تصوف	16
10	تصوف کا عہد زریں	33
11	توبہ	27
12	خلافتِ راشدہ	33
13	دقیانوسیت	104
14	راسخ العقیدہ	51

15	رجعت پسندی	104
16	رہبانیت اور ریاضت	3
17	روحانیت	16
18	زہد	29
19	سالک	21
20	سلسلہ مولویہ	84
21	سلوک	22
22	صبر	29
23	صوفی	17
24	عشقِ حقیقی	41
25	فقر	29
26	فنافی الشیخ	86
27	قبالہ	51
28	قدامت پسندی	118
29	گیان دھیان	65
30	مال وجاہ	20
31	مراقبہ	65

32	مرشد	81
33	مرید	44
34	مستشرقین	98
35	مستصوف	86
36	مشروع اور غیر مشروع	29
37	ورع	27

فہرست مصادر و مراجع

مقدس کتب

القرآن الکریم

کتابِ مقدس

بھگوت گیتا

عربی کتب

إبراهيم أنيس، **المعجم الوسيط**، (مجمع اللغة العربية ، مكتبة الشروق الدولية،2004ء)

ابن تيميه، **مجموع الفتاوىٰ**، (سوريامطبعة الرسالة، ط١، ١٣٩٨ھ)

ابن حزم، **الفصل فی الملل والاهواء والنحل** (بيروت: دارالمعرفة للطباعة والنشر ، ط٢، ١٣٩٥ھ/١٩٧٥ء)

ابن خلدون، عبد الرحمن بن محمد، **تاريخ مقدمة ابن خلدون** (لبنان، موسسه جمال للطباعة والنشر، بيروت)

ابن قتيبه ،ابو محمد بن عبدالله مسلم ،**تاول مشكل القرآن** (القاهره دارالتراث، ط:٢، ١٩٩٣ء)

إدريس، محمد جلاء ، **الاستشراق الإسرائيلی فی المصادر العبرية**، (القاهرة :العربی للنشر والتوزيع، ١٩٩٥)

إسماعيل،محمد بن على ، **الاستشراق بين الحقيقة والتضليل**، (مصر، الكلمة للنشر والتوزيع، الطبعة الثالثة، ٢٠٠٠ء)

اصفهانی، راغب، **المفردات فی غريب القرآن** ،(مكتبة نزار مصطفىٰ الباز،2009)

الاندلسی، عبدالواحد بن عاشر، **تنبيه الخلان على الاعلان بتكميل موردالظمآن**،(بيروت دارالكتب العلمية ، ط١، ١٤١٥ھ/١٩٩٥ء)

بازمول،محمد بن عمر بن سالم ، **القراء ات واثرها فی التفسیر والاحکام**،(مصر:دار الکتب العلمیة، 1986)

باهو، سلطان ،**عین الفقر**، (بهارت دار العرفان، سر سید نگر، علی جر ، 2003ء)

بخاري،محمد بن إسماعيل، **الجامع الصحيح**، (القاهرة:دار الشعب، 1987)

بدوی ،عبدالرحمن ، **تاریخ التصوف الاسلامی** ، (کویت: وکالة المطبوعات ، 1970ء)

البدوی، عبد الرحمن ، **موسعة المستشرقین**،(لبنان:دار العلم للملایین ، بیروت، ،1993)

التبريزي،محمد بن عبد الله الخطيب ،**مشكاة المصابيح**، (بيروت، المكتب الإسلامي،1985)

ترمذی، ابو عیسیٰ :**الجامع**، (الریا ض: دارالسلام للنشر والتوزیع ،1999ء)

التفتازانی, ابو الوفاء ،**مدخل الی التصوف الاسلامی** ، (قاهره: دار الثقافتة للنشر والتوزیع،1979)

حکیم ،محمد طاهر، **السنة فی مواجهة الاباطیل**،(مکه: منشورات دعوة الحق، رابطة العالم الاسلامی، ۱۴۰۲ھ)

حلمی ،محمد **مصطفی** ،**الحیاة الروحیة فی الاسلام**، قاهره :مکتبة الاسکندریة،2011)

الحلمی ، محمد مصطفیٰ ،**الحیاةالروحیة فی الاسلام**،(طبعة الهیئة المصریة العامة للکتاب، 1948ء)

حنبل، احمد ابن محمد، **المسند** ،(قاهره : دار المعارف،1954)

الخربوطلی، علی حسنی،**المستشرقون**، (بیروت :مکتبة العصریة صیداء، ط۴، ۱۳۹۰ھ)

دهلوی،شیخ عبد الحق محدث ،**شرح فتوح الغیب**، (لاهور: صفه اکیدمی ، 2000ء)

دیاب،محمد احمد ،**اضواء علی الاستشراق والمستشرقین**، (قاهرة مصر دارالمنار ، ۱۹۹۹ء)

الذهبی،ابو عبدالله،شمس الدین،**سیر اعلام النبلاء**،(بیت الافکار الدولیه،2009)

رازی ، فخرالدین، **تفسیر کبیر** ، (بیروت، دار احیاء التراث العربی، 1415 ھ)

السیوطی،الجلال الدین، **الحاوي للفتاوي**(مصر:،دار الکتب العلمیه،1421ھ)

السباعی ،صطفیٰ،**الاستشراق والمستشرقون**،(اردن:دار الورق للنشر و التوزیع،س-ن)

الشافعی،حسن محمود عبد اللطیف ، **فصول فی التصوف** ،(القاهره دار الثقافة للنشر و التوزیع)

شلبی ،عبدالتفاح اسماعیل، **رسم المصحف العثمانی واوهام المستشرقین فی قراءات القرآن الکریم:دوافعها ودفعها**، (مصر:مکتبه نهضة ،١٩٦٠ء)

شیبة ، أبو بکر ابن أبي، **الکتاب المصنف في الأحادیث والآثار**،(الریاض: مکتبة الرشد، 1409ھ)

صهیب سعران، **مقدمةکتاب فی التصوف الاسلامی**، (قاهره: لجنة التالیف و النشر،2007ء)

الطبرانی، أبو القاسم سلیمان بن أحمد، **المعجم الکبیر**،(دار إحیاء التراث العربي، 1983م)

طبری ابو جعفر محمد ابن جریر،**جامع البیان عن تاویل آی القرآن**، (مصر :مصطفی البابی الحلبی، ١٩٦٨ء)

الطوسی، شیخ ابو نصر سراج، **اللمع فی علم التصوف**(مصر، دار الکتب حدیثه، 1960ء)

ظهیر،إحسان إلهي،**دراسات في التصوف**، (دار الإمام المجدد للنشر 2005)

عفیفی، ابوالعلاء ، اسلامی تصوف اور اس کی تاریخ(بالقاهرة: لجنة التالیف و الترجمه و النشر 1956ء)

العقیقی ،نجیب، **المستشرقون**، (مصر :دارالمعارف،١٩٦٥ء)

غراب،احمد عبد الحمید، **روية اسلامية للاستشراق** (الریاض دارالاصالة للثقافة والنشر والاعلام، ١٩٨٨ء)

غزالی ،محمد، **دفاع عن العقیدة والشریعة** ، (مصر :دارالکتب الحدیثة ، ط۳، ۱۳۸۴ھ)

الفتاح ،علیان محمد عبد، **اضواء علی الاستشراق**، (کویت: دارالبحوث العلمیة,۱۴۰۰ھ)

فتح الله، عبد الستار، **الغزو الفکری والتیارات المعادیة للاسلام** ،(الریاض:مکتبة المعارف، ط۲، ۱۳۹۹ھ)

الفیومی، محمد ابراهیم ،**الاستشراق رسالة الاستعمار**،(قاهره مصر دارالفکر العربی، ۱۹۹۳ء)

القاضی،عبدالفتاح ، **القراء ات فی نظر المستشرقین والملحدین** ،(دارمصر للطباعة، ۱۴۰۲ھ)

القزوینی، ابو عبد الله،محمد بن یزید، **السنن** ،(دار الرسالة العالمیة،1430ھ)

القشیری، عبد الکریم ،**الرسالة القشیریة**، (القاهره :مطبوعات مکتبه و مطبعة محمد علی صبیح، س-ن)

القشیری، مسلم بن حجاج ،**الصحیح** (بیروت، دار الجیل،1334ھ.)

مجلسی، محمد باقر ، **بحارالانوار**،(بیروت، مؤسسة الوفاء،1404ق)

محمدحسین، **الاتجاهات الوطنیة فی الادب المعاصر**، ،(بیروت :موسسة الرسالة ، س-ن)

محمدی، ابراهیم میر، **مکانة القراءات عند المسلمین**، (لاهور:جامعه لاهور الاسلامیه ، س-ن)

موسیٰ، محمد یوسف، **العقیدة والشریعة فی الاسلام**، (قاهره : دارالکتب الحدیثة، ۱۹۵۹ء)

نووي، یحییٰ بن شرف، **شرح الأربعین النوویة**، (لبنان: دار الکتب العلمیة،2015)

النیسابوري، محمد بن عبدالله أبو عبدالله ،**المستدرك علی الصحیحین**،(بیروت: دار الکتب العلمیة، 1990)

هجوری ،سید علی بن عثمان ، **کشف المحجوب**، (لاهور ضیاء القرآن پبلیکشنز،2010ء)

اردو کتب

آبادی، سعید احمد اکبر، **پروفیسر اجناس گولڈ زیہر**،(اعظم گڑھ ,دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی،،یو۔پی،ہند)

احمد، حسن الدین **شریمد بھگوت گیتا**، (نئی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ، 1975)

ازہری، عبدالوہاب خان، **اسلامی تصوف کے مصادر**،(الایضاح، جلد28، شمارہ1، 2014)

الازہری، پیر کرم شاہ، **ضیاءالنبیؐ**،(لاہور: مکتبہ ضیاءالاسلام، س۔ن)

اصلاحی، شرف الدین، **مستشرقین، استشراق اور اسلام**،(اعظم گڑھ: معارف دارالمصنفین،۱۹۸۶ء)

اعظمی ،اعجاز احمد، **تصوف! ایک تعارف**،(خیر آباد، مکتبہ ضیاءالکتب،،2008ء)

آفاقی ، اقبال ،**روایاتِ عرفان و تصوف**،(لاہور: صریر پبلیکیشنز ، 2020)

افغانی، مولانا شمس الحق، **علوم القرآن**،(لاہور: مکتبہ اشرفیہ، سال)

اقبال، اظہر، **تصوف و سلوک کی تجدد و اصلاحی مولانا اشرف تھانوی کی خدمات**(مقالہ: پی ایچ۔ڈی، شیخ زاید اسلامک سنٹر جامعہ پنجاب لاہور، 2009)

بھٹائی، شاہ عبداللطیف: **شاہ جو رسال**،(دہلی: روشنی پبلی کیشن کنڈیارو، 1997)

بھٹو، محمد موسیٰ، **تصوف و اہلِ تصوف**،(سندھ: نیشنل اکیڈمیں ٹرسٹ حیدر آباد، 2008ء)

البیرونی، تحقیق ماللھند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ ترجمہ: **کتاب الہند**، مترجم، سید اصغر حسین (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، 2005)

بیگ، مرزا قلیچ، **مقالات الاولیاء**،(شکارپور: سندھ پرنٹنگ پریس، نوشہری دروازہ، 1927)

پرویز، غلام احمد، **تصوف کی حقیقت**،(لاہور: ادراہ طلوع اسلام،، 1981ء)

ترپاٹھی، رماشنکر، **قدیم ہندوستان کی تاریخ**،(نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)

تھانوی، موانا اشرف علی، **التکشف عن مہمات التصوف**،(لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، 2005،)

ثناءاللہ، حسین، **قرآن اور مستشرقین**،(اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،، 2010ء)

جعفری، رئیس احمد، **تاریخ تصوف اسلام**،(لاہور: کتاب منزل، 1950)

جعفری، رئیس احمد، **تاریخ تصوف اسلام**، (لاہور: کتاب منزل، 1950)

چشتی، یوسف سلیم، **تاریخ تصوف**، (لاہور: علماء اکیڈمیں محکمہ اوقاف پنجاب،، 1976ء)

چوہدری، محمد اکرم، **استشراق**، (لاہور: اردو دائرۂ معارفِ اسلامی ہ، 1988ء)

چیمہ، غلام رسول، **مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ**، (لاہور: علم و عرفان پبلیشر، 2006ء)

حفیظ الرحمٰن، **برصغیر پاک و ہند میں اسلامی تصوف پر ہندومت کے اثرات** (مقالہ ایم فل علوم اسلامیہ نمل، 2017)

حقی، شان الحق، **بھگود گیتا**، (نئی دلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۴ء)

حلمی، مصطفیٰ، **تاریخ تصوفِ اسلام**، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلیشرز،، 1964)

خان، محمد ایاز، **اناجیل اربعہ کے اہم مضامین کا تحقیقی جائزہ**، (مقالہ پی ایچ۔ڈی، بہاوالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، 2000ء)

دائرۃ المعارف الاسلامیہ، (لاہور: دانش گاہ پنجاب، 1968، 1ء)

دہلوی، شاہ ولی اللہ، **القول الجمیل**، (کراچی: ایجوکیشنل پریس، 1970ء)

دہلوی، شاہ ولی اللہ، **ہمعات**، (لاہور: سندھ ساگر اکادمی، 1946ء)

دیدات، شیخ احمد، **یہودیت، عیسائیت اور اسلام**، (لاہور: عبد اللہ اکیڈمی، 2010ء)

رامپوری، محمد یوسف، **تحریک استشراق**، (مجلہ دار العلوم دیوبند، مارچ ۱۹۸۸ء)

رضا، احمد، **اسلامی اخلاق اور تصوف**، (اسلام آباد: شعبہ فکر اسلامی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، 2019ء)

روبینہ ترین، **تصوف**، (ملتان: بیکن بکس، 2001ء)

ریحان عمر، **اسلامی عقائد اور قانون کا تاریخی ارتقاء**، (لاہور: عکس پبلیکشنز،، 2018ء)

زبیر، محمد، **اسلام اور مستشرقین**، (لاہور: مکتبہ رحمۃ للعالمین، 2014)

سرہندی، مجدد الف ثانی شیخ احمد، **مکتوبات امام ربانی**، (کراچی: دار الاشاعت، 2006)

سیف الاسلام، حافظ، **تحریک استشراق کی حقیقت اور استشراقی لٹریچر کے اثرات**، ماہنامہ دار العلوم، 2015) 3، شمارہ 5

صدیقی، ظہیر احمد، **تصوف اور تصورات صوفیاء**،(لاہور: گنج شکر پرنٹرز،2016ء)

ضمیر الدین، **گولڈ زیہر کے اسلامی تصوف پر اعتراضات کا تحقیقی جائزہ**(مقالہ ایم فل علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف سرگودھا،2016)

الطاف جاوید، **غیر سامی مذاہب کے بانی**،(لاہور: اپنا ادارہ پرانی انارکلی،2003)

عبدالحق، مہر، **ہندو صنمیات**(ملتان: بیکن بکس،2002،)

عبدالرحمن، سید صباح الدین، **بزم صوفیہ**،(اعظم گڑھ: مطبع معارف،1949ء)

عروج، مہوش، **تصوف میں شامل غیر اسلامی تصورات**،(ایم فل، نمل اسلام آباد، 2011ء)

عطار، شیخ فرید الدین، **تذکرۃ الاولیاء**،(لاہور، ضیاء القرآن پبلیشرز، 1997ء)

فاروقی، عماد الحسن آزاد، **دنیا کے بڑے مذاہب**،(نئی دہلی: مکتبہ جامعہ،1986ء)

قادری، محمد طاہر، **تصوف اور مستشرقین**،(لاہور: منہاج القرآن پرنٹرز،2019ء)

قاسمی، وحید زمان، **القاموس الوحید**،(لاہور: ادارہ اسلامیات،، 2021،)

کاندھلوی، محمد زکریا، **شریعت و طریقت کا تلازم**،(کراچی: مکتبۃ الشیخ، 1993)

کھگہ، فیروز الدین شاہ، **مطالعہ اسلام اور استشراقی تنقیدات**،(لاہور: عکس پبلیکشنز، 2019،)

گولڈ زیہر، اگناز، **اسلامی عقائد اور قانون کا تاریخی ارتقاء**، ترجمہ و تحقیق: ریحان عمر،(لاہور: عکس پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء)

لال، چودھری روشن، **بھگوت گیتا**،(لاہور: فکشن ہاوس،2013ء)

لاہوری، غلام سرور، **خزینۃ الاصفیاء**،(لاہور: مکتبہ نبویہ،1994،)

لطیف اللہ، **تصوف اور سریت**،(لاہور: ادارہ ثقافت اسلامی ہ،1990ء)

لیوس مور، **مذاہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا** ،ترجمہ یاسر جواد ، (لاہور: نگارشات پبلیشرز ،2003)

مطہری، مرتضی ، **مجموعہ آثار**، (قم:انتشارات موسسہ فراہنگی اشراق و عرفان ,۱۳۷۶ش)

مفتی، محمد شفیع، **معارف القرآن**،(کراچی: دار المعارف،1983ء)

ممبی والا، محی الدین، **تصوف اور ہندوستانی معاشرہ**،(نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ھاوس،1998ء)

مہاتما گاندھی، **مذہب اور دھرم**،(علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، 1987ء)

مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن،(لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، 1990ء)

مودودی, ابوالاعلی، **تجدید واحیائے الدین**،(لاہور: اسلامک پبلیکشنز،، 1989ء)

نائیک، عبدالکریم ذاکر "**بائبل اور قرآن جدید سائنس کی روشنی میں**"(لاہور: دارالنوادر ، 2007ء)

نثار احمد، **مستشرقین اور مطالعہ سیرت**،(انڈیا: نقوش رسول، 1986)

النجار، عبدالحلیم، **مذاہب التفسیر الاسلامی**،(قاہرہ: مکتبہ الخانجی، 1955)

نجفی، **الکوثر فی تفسیر القران**،(اسلام آباد: البلاغ القرآن، 2004ء)

ندوی، محمد ثناءاللہ، **علوم اسلامیہ اور مستشرقین**،(لاہور: میں ٹروپرنٹرز، 2009ء)

ندوی، محمد اشفاق عالم، **ہندومت ایک مطالعہ**،(نئی دہلی: انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، 2017ء)

نعمانی، شبلی، **الغزالی**،(دہلی: اجمن ترقی اردو، 1902)

نعمانی، شبلی، **سیرت النبی**،(اعظم گڑھ: دارالمصنفین، 1952)

نقشبندی، محمد روح اللہ، **جواہر مجددیہ**،(کراچی: دار اشاعت اردو بازار ای اے جناح روڈ)

نورالدین، ابوسعید، **اسلامی تصوف اور اقبال**،(لاہور: اقبال اکادمیں پاکستان، 1995)

نوری، محمد عرفان بیگ، **روحِ تصوف**،(بھارت: دارالعرفان، سرسید نگر، علی گڑھ، 2005ء)

English Sources:

Abdullah, Mohd Syukri Yeoh Tasawwuf: An Impetus to Islamic Revivalism in the Malay world, *TAWARIKH* 2, no. 2 (2011):175-190.

Allison Peer, *The complete works of Saint Teresa*. London: E,C.D Appleton Company, 1946.

Arberry, A J. An *Introduction to the History of Sufism*. London:Longmans Green, 1943.

Arberry, A.J.*The Koran*. USA:George Allen & Unwin Ltd,1955.

Bernard McGinn, *The Mystical Thought of MeisterEckhart*. New York, A Herder and Herder book, 2001.

Bevan, Edwyn Robert, *The legacy of Israel*. London: Oxford, 1927.

Blakney, R EMeister Ekhart,TranS. New York: Harper & Row, Publishers, 1941.

Bucaille, Maurice, *The Bible The Quran and science*. CITY??? Islamic book Servise , 2001.

Dionysius . *The Divine Names*, Nicolas- Hays, Inc.2004.

Dionysius, The Areopagite, Encyclopedia Britannica, January 3, 2020.

Dionysius, *The Mystial Theology*, kessinger publishing, LLc.2003.

E. H Whinfield, *Gulshan-i-Raz (The mystic Roze Gorden)* London: Trubner & Co., 1880.

Eberhard Arnold, Sermon *on the Mount*. TTS Press, Britain.1987.

Ed ward J. *The Great Religions of the Modern World*. USA: Princeton University press, 1946.

Fisher, et al. *The Cambridge History of Iran*. London: Cambridge University Press,1960.

GoldZiher, Ignaz., *Introduction to islamis theology and Law.* New Jersey:Prineton University Press.1981.

GoldZiher, Ignaz., *Islamic Studies*. London: Allen and Unwin Ltd.1886.

Goldziher, Ignaz., *Muslim Studies*. ed., S.M.Stren, London: Routledge. 2005.

Hakim, Abdul Bashir . *The impact of Mysticism on Social Affairs,* "International Journal of Arts and Social Science Afghanistan: Shaikh Zayed University 4 Issue 4 *(*2021):192-197.

Herbert, Sir Thomas, *Encyclopædia Britannica***,** USA: Horace Everett Hooper**.** 1911

John of the Cross, *Dark Night of the Soul*. London: Thomas Baker, 1908.

John, M. Farley, *The Catholic Encyclopedia*. New York: Robert, 1909.

K. F Reinhardt, *The dark Night of the soul*. New York: Frederrick Ungar,1957.

Kegan Paul, *Studies in Islamic Mysticism*. New York :Routledge, 1976.

Kempis.A Thomas, *The Imitation of Christ*. Cologne: M.Glashan and Gill ,1873.

Khaleel Mohammed, *Assessing EnglishTranslations of the Qur'an*, Middle East Quarterly (Spring 2005) :58-71.

Lambert, M. *The Cathars* London: Mexsa Press, 1998.

Leaman, Oliver, *Jewish Thought: An Introduction* . London: Routledge, 2006.

Lewis, David , *The Life of St. Teresa of Jesus* . London: Burns, Oates, & Co. , 1881.

Lywosmour. *The Encyclopedia of World Religions*. CITY???: Oxford press, 1990.

M. A. S, Abdul Haleem, *The Qur'an*, Oxford: Oxford Univiversty Press, 2004.

Mark, Joshua J Cathars, *World History Encyclopedia*. *Marriage*. London :oxford press, 2019.

Mohar, Ali *The quran and the orientalists*. New York: Heritage Press, 1958.

Nicholson, R A, *Rumi Poet and Mystic*,. London: Grorage Allbn and Unwin LTD, 1986.

Nicholson, Reynold, Alleyne, *The Mystic of Islam* . London: Routledge and kegan Paul,1975.

Nicholson, R., A *A Literary History of the Arabs*. London: The Routledge Arabia Library, 1998.

Nicolson. *The idea of personality in Sufism*. Lahore: Muhammad Ashraf Kashmiri Bazar, 1964.

Nicolson. *Selected poems from the Diwani Shams Tabrezi*. USA: Ibex, 2001.

Norman Tresa, *The world Baby Name*,.USA, The Berkley Publishing Group, 1996.

Peter Tyler, *St John of the Cross* . New York: Continuum.Publishers, 2000.

Rosen, J., *Understanding Judaism*. Edinburgh : Dunedin, 2003.

Ruysbroeck, Jan van, *The Adornment of the Spiritual Marriagge*. London: Oxford press, 1916.

Said, Edward, *Orientalism*. New York:Vintage Books, 1979.

Schimmel, Annemarei *Pain and Grace* . Leidon: E J. Brill,1976.

Schimmel, Annemarie *Islam:An Introduction*, USA, State University of New York, 1992.

Schimmel, Annemarie *Mystical Dimension of Islam*, The University of North Carolina Press, 1975.

Shakespeare, William *Twelfth Night.* USA: D.C.Heath and Company ,1916.

Sidney lee, *Dictionary of National Biography*. London: Smith, Elder & Co. 1901.

Steven T.Katz.*Comparative Mysticism*, Oxford University Press,1986.

Uždavinys, Algis .Sufism in the Light of Orientalism , *Acta Orientalia Vilnensia* 6 , no.2 (2005):115-125.

W. E. D. Allen. *Bulletin of the School of OrientalStudies*. London: University of London, 1930.

W.T. Stace, *The Teachings of Mystics*. New York: Mentor Books, 1960.

Yochai, Rav Shimon Bar.*The Zohar*. USA: the kabbalah Centre International Inc, 2003.

Websites:

http://www.alsharia.org
http://www.canbridge.org
http://www.isfdb.org
http://www.religion.asianindexing.com
https://www.Bartanica.org
https://www.britannica.com.
https://www.mimirbook.com
https://www.mukaalma.com
https://www.shamilaurdu.com
https://www.ur.shops-net.com
https://www.ur.socmedarch.org
https://www.worldhistory.org
https://www.ur.dainamtechnology.com
https://www.researchgate.net
https://www.muhammadanism.org